دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

JULY
2012

PDFBOOKSFREE.PK

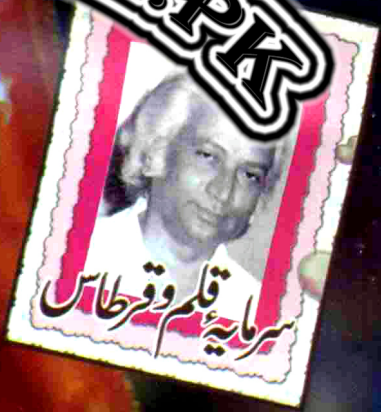

سرمایۂ قلم و قرطاس

سرگوشی

urdu 1
sirf entertainment

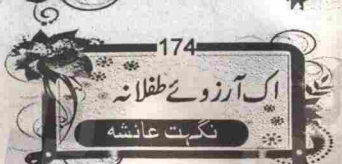

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ ہمارے دل میں آباد ہیں

سہام مرزا (1930ء تا 2002ء) بانی: دوشیزہ و سچی کہانیاں

یوں تیری یاد دل میں اتری ہے
جیسے جگنو ہوا میں کھو جائے

یقین

یہ درست ہے کہ ہم پاکستانی عوام عرصۂ دراز سے بے شمار مسائل میں گرفتار ہیں، دہشت گردی، کرپشن، بے روزگاری، چور بازاری، ملاوٹ، مہنگائی، توانائی کا بحران اور..... اور بھی بہت سے مسائل ہیں، لیکن کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ ہمیں ایک اور نہایت اہم اور حساس نفسیاتی مسئلے سے بھی بہت غیر محسوس طور پر دوچار کر دیا گیا ہے..... اور وہ مسئلہ ہے ''بے یقینی'' کا..... اب ہم ''یقین'' سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ ہر بات، ہر معاملے میں یہ سوچتے ہیں کہ ایسا ہے بھی کیا نہیں؟..... مثلاً یہ الزام سچ ہے یا جھوٹ؟..... یہ واقعی مجرم ہے یا پھر کوئی بے گناہ؟..... عدلیہ کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟..... حکومت سچ بول رہی ہے یا دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے؟..... اپوزیشن عوام سے مخلص ہے یا بے وقوف بنا رہی ہے..... اور میڈیا؟..... اس کی کیا بات کریں، ملک ریاض صاحب کے انٹرویو والی off air گفتگو آپ کے سامنے ہے..... تو پھر اس بے یقینی کے موسم میں، بس یہ یقین باقی رہنا چاہیے کہ اللہ کارساز ہے، غفور الرحیم ہے، وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔

ناصر رضا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منزہ سہام کے افسانوں کا مجموعہ

کانچ کی عورت

قرطاس پر سانس لیتے حروف اور دھڑکتے جذبات کی افسانوی تصویریں.....فکر و خیال اور ادراک سے آباد، ان اوقات کی تحریریں جب لفظ اپنے تخلیق کار سے مکالمہ کرتے ہیں۔

بہت جلد آپ کی بصارتوں کا مہمان ہوگا

پرل پبلی کیشنز، 110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

احوالیو! یقین ہے کہ آپ سب اچھے ہوں گے۔ ''سچی کہانیاں'' میں کی جانے والی تبدیلیاں آپ لوگوں نے پسند کیں، اس کا بہت شکریہ۔ مجھے اس بات کی حد سے زیادہ خوشی ہے کہ آپ سب نے مجھے وہی مان، عزت اور محبت دی جو شاید ابو ہوتے تب مجھے ملتی۔ آپ کے رویوں نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ آپ لوگ ''سچی کہانیاں'' سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اس سے جڑے ہر انسان کو عزیز رکھتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ آپ لوگوں کے درمیان رہنا چاہیے تھا۔ اتنے محبت کرنے والے، عزت دینے والے یقیناً قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا اور میرا یہ ساتھ اب جب تک زندگی ہے رہے گا۔ خوش رہیے، آیئے اب چلتے ہیں خطوط کی جانب.....

✉ صدف آصف' کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! جون کا شمارہ ملا، سب سے پہلے تو سرورق کی تعریف کروں گی۔ شوخ رنگوں سے سجا بنا شمارہ آنکھوں کو بہت بھلا لگا۔ کئی مہینوں سے سچی کہانیاں میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں یہ بات ضرور کہوں گی کہ آپ لوگ معاشرے میں سدھار پیدا کرنے کے لیے اپنا کام پوری خوبی سے سر انجام دیں رہے ہیں، کیوں کہ افسانہ لکھنا آسان ہے مگر کڑوی سچائیوں کو اس انداز میں پیش کرنا کہ آخر تک قارئین کی دلچسپی قائم رہے' ایک مشکل امر ہے۔ جون کا شمارہ پچھلے مہینوں کے شماروں کے مقابلے میں بہت اچھا لگا۔ تقریباً ساری کہانیوں کے پلاٹ بہت مضبوط تھے۔ ان میں خیالی قصے کم اور زندگی کی حقیقتیں زیادہ تھیں اور یہ ہی میرے خیال میں سچی کہانیاں کا مشن ہے کہ معاشرے کہ ان کرداروں کو بے نقاب کیا جائے جو ہماری زندگیوں میں زہر بھر رہے ہیں۔ میری طرف سے آپ سب کو مبارک باد اور ناصر رضا صاحب کے لیے بڑے احترام سے صرف ایک جملہ ''ویل ڈن سر!'' نازیہ حسن میری پسندیدہ گلوکارہ رہی ہیں، گولڈن ہارٹ پڑھ کر آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ''ریما، مادھوری اور ریکھا'' بہت دل گداز تھی۔ ''اماں جی'' اچھی لگی۔ ''میری توبہ'' پڑھ کر مزہ آیا۔ سارے مردوں کو اب یہ واقعہ پڑھ کر توبہ کر لینی چاہیے، ہیں نا؟ اچھا' اب اجازت' مجھے پتا ہے' آپ کے صفحے بہت قیمتی ہیں اور ان پر اور لوگوں کا بھی حق ہے۔

☆ صدف! خوش رہو! رسالہ اچھا لگا یعنی ہماری محنت وصول ہوئی۔ تمہاری رائے بھی بہت قیمتی ہے یقین ہے کہ پابندی سے محفل میں شرکت کرتی رہو گی۔

✉ شکیلہ انجم طارق لاہور سے۔ ''ہنستی مسکراتی سی منزہ جی السلام علیکم! ہمیشہ سلامت رہیں، ہمیشہ محفوظ اور پُرسکون رہیں، آمین۔ مئی کے بالکل آخری دنوں میں جون کا ''سچی کہانیاں'' غیر متوقع طور پر پا کر بہت خوشی ہوئی۔ دلکش ٹائٹل سے سجا ''سچی کہانیاں'' دل موہ لے گیا۔ گولڈن ہارٹ ''نازیہ حسن'' کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اُن کی جوان موت نے بہت افسردہ کیا تھا نازیہ ایک خوب صورت یاد بن کے رہ گئی ہیں۔ کہانیوں میں امراؤ طارق نے ''بدن کا طواف'' کہانی بہت اچھی طرح نبھائی۔ مینا جی نے ایک تلخ حقیقت سے روشناس کرایا۔ واقعی آج کل لوگ بے حس ہوتے جا رہے ہیں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ جس تحریر نے دل کو متاثر کیا وہ نشاط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان کی ''خوشبو کے ہمسفر'' تھی۔ بہت دلچسپ، بہت خوب صورت..... ویری ویل ڈن نشاط خان۔ اس کے علاوہ حنیف سحر، اصفاء فیصل، ارم زہرا، علی صبا نے بھی خوب لکھا۔ عکاشہ سحر ایمان کا سفر نامہ بہت خوب صورت تحریر تھی۔ بہت مزہ آیا پڑھنے میں۔ عکاشہ سحر کو لفظوں سے کھیلنا خوب اچھی طرح آتا ہے۔ اُن کی ہر تحریر دلکش اور مرکز نگاہ ہوتی ہے۔ مینا تاج کی یادیں بھی بہت پسند آئیں لیکن کچھ تشنگی بھی محسوس ہوئی کہ وہ ذرا اور تفصیلی اپنی یادوں پر روشنی ڈالتیں تو اور مزہ آجاتا۔ سوئیٹ منزہ جی! میں آپ کو اپنی ایک تصویر اور دو عدد کہانیاں بھی بھیج رہی ہوں۔ مجھے اپریل 2012ء کے ''سچی کہانیاں'' میں 5th پرائز کے لیے سلیکٹ کیا گیا تھا پر ابھی تک مجھے میرا کیش انعام نہیں ملا۔ پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔ پلیز جلدی مجھے میرا انعام دلائیں۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو ناصر رضا بھائی کا بوجھ بانٹ لیا۔ اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ ناصر بھائی تک ہماری دعائیں اور سلام پہنچا دیں۔ اپنا بے حد خیال رکھیے گا۔''

☆ اچھی شکیلہ! تم بھی مسکراتی رہو۔ ناصر بھائی اچھے ہیں۔ انعامی رقم کے بارے میں اکثر لوگوں کو شکایت ہو رہی ہے اس بارے میں لگتا ہے کہ اب ہمیں اپنے اکاؤنٹنٹ طاہر کے کان کھینچنے پڑیں گے۔

✉ اُم عادل کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ صاحبہ السلام علیکم! آپ کے لیے بچوں، امی جان و ادارے کے ہر فرد کے لیے دلی دعاؤں کے پھولوں کا گلدستہ لیے محفل میں حاضر ہیں۔ آپ سے ہونے والی ملاقات ہم ماں بیٹے کے لیے بھی یقیناً بہت خوشی کا باعث بنی۔ عادل سے ملاقات پر آپ نے جس خوشی کا اظہار کیا ہے اُسے پڑھ کر وہ شکریے کے ساتھ سلام پیش کرتے ہوئے آپ سے مزید دعاؤں کا طالب ہے۔ اتوار کے روز رسالہ ملا۔ ناشتے کا مزہ دوبالا ہو جاتا مگر نہیں سوائے ہمارے خط کے رسالے میں نہ ہماری کہانی تھی نہ خیال آرائی۔ منزہ جی! آپ کے پاس میری پانچ عدد کہانیاں جمع ہو چکی ہیں آپ نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید ضرور کہیے مگر پرانے لکھنے والوں کو اتنا انتظار مت کروائیے کہ وہ مایوس ہو جائیں۔ رسالے کی تینوں سلسلے وار کہانیاں رسالے کی شان اور مان ہیں تو نئے لکھنے والوں کی کہانیاں جہاں ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں وہیں پڑھنے والوں کو نت نئے تجربات اور معاشرے کے مختلف گوشوں سے آشنا کرنے کے ساتھ رسالے کی اشاعت بڑھانے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ آپ کا ''احوال'' میں خوب صورت محبت بھرا جوابی انداز اور ''شہید کی ڈائری'' بہت پسند آرہا ہے۔ امی جان کی تحریر ''یادوں کے اوراق'' کا شدت سے انتظار ہے۔ ان کے قلم سے ہمیں وقتِ گزشتہ کی بہت ساری معلومات ملیں گی۔ رسالے کے تمام سلسلے نئی تبدیلیوں کے ساتھ خوب رہے۔ نیا سلسلہ آپ کی خبر اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے رسالے سے وابستہ تمام افراد ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے آشنا رہیں گے۔ ''احوال'' میں، میں سرگودھا کے محترم بھیا ممتاز احمد کی دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے بیٹے میرے جگر گوشے محمد عادل کی صحت و تندرستی کے لیے اتنے خوبصورت الفاظ میں دعا کی جواباً میں بھی بھیا ممتاز احمد کے لیے ہر طرح کی خیر و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔ سب کے لیے دلی دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجیے، بچوں کو پیار امی جان کو سلام۔''

☆ اُم عادل بہن! یقین کرو جان بوجھ کر کہانیاں شائع کرنے میں دیر نہیں کی جاتی۔ میری تو کوشش ہے کہ کہانی کے صفحات زیادہ ہوں اس لیے بار بار اپنے ساتھیوں کو بتاتی ہوں کہ خط مختصر کر دیں تاکہ کہانیاں لکھنے والے مایوس نہ ہوں اور ہم جلد جلدی ان کاوشوں کو شائع کرتے رہیں، ویسے ماہ اپریل میں تو آپ کی کہانی لگی تھی۔ تبدیلیاں اچھی لگیں، شکریہ۔ بیٹے عادل کو بہت دعائیں۔

✉ تنویر خالد کوئٹہ سے۔ ''السلام علیکم! پیارے چاچو جان کیا حال ہے اور زندگی کیسے گزر رہی ہے؟ میرے خیال میں اللہ کا شکر ہے اور زندگی اچھی گزر رہی ہوگی۔ انکل میں نے کہانی بھیجی شاعری بھیجی خیال آرائی بھیجی اور پتا نہیں کیا کیا بھیجا، چلو کوئی بات نہیں آپ کی مرضی.....؟ اب کے بار چند تحریریں بھیج رہا ہوں۔ انکل ''احوال'' میں کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کر سکتا کیوں کہ ڈائجسٹ بہت لیٹ ملتا ہے اس دفع مجھے 14 تاریخ کو ملا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ سب لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں اللہ باری تعالیٰ سب کو سدا خوش و خرم رکھے اور سب اسی طرح لکھتے رہیں۔ چاچو جی اس دفعہ جو ''خیال آرائی'' بھیج رہا ہوں پلیز اگر اُسے شائع کرو تو کاٹنا مت کیونکہ بہت محنت کی ہے اس پر میں نے، اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ نے کاٹا تو دل بھی ساتھ کٹ کر رہ جائے گا۔

عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اب اجازت! سب چھوٹے اور بڑوں کو سلام، دوست اس لیے نہیں کہہ سکتا کیونکہ کوئی ہم سے دوستی کرنا ہی نہیں چاہتا اور زبردستی کسی کے سر پر سوار ہونا میری عادت نہیں۔''

☆ بھائی تنویر! یہ تو زیادتی ہے جواب میں دے رہی ہوں اور آپ مخاطب ناصر چاچو کو کرتے ہیں، چلیں کوئی بات نہیں۔ اب آپ آئندہ مجھے خط لکھیں تو میں آپ کو تفصیلی جواب دوں گی۔

✉ مریم شاہ شمالی سرگودھا سے۔ ''محترم چاچو ناصر رضا السلام علیکم! ایک بار پھر کہانی لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ امید ہے کہ حوصلہ افزائی فرما کر اس کہانی کو ''سچی کہانیاں'' کے قیمتی اوراق میں محفوظ کریں گے۔ اس سے پہلے بھی میں نے ایک کہانی ارسال کی تھی شاید وہ آپ کے معیار پر پورا اترنے سے قاصر رہی یا پھر قطار میں لگی اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔ خیر جو بھی ہے میرے لیے یہی بہت ہے کہ آپ سے اور ''سچی کہانیاں'' سے کاغذ و قلم کا رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ رشتہ و تعلق اور مضبوط اور گہرا ہو جائے۔ منزہ سہام مرزا اور رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے گا۔ آخر میں ''سچی کہانیاں'' کے تمام اسٹاف کے نام یہ دعا

تو رہے خوش دنیا کی ہر خوشی ہو تیری
تو رہے سدا سلامت یہ دعا ہے میری

☆ مریم! میں نے بتایا تو تھا آج کل ناصر بھائی بہت مغرور ہو گئے ہیں۔ وہ ہیں اور ان کی عزیز از جان ساتھی ہاں وہی ردی کی ٹوکری..... سفارش تو سن ہی نہیں رہے ہیں۔ تمہارا محبت بھرا سلام امی تک پہنچا دیا ہے میری اور ان کی جانب سے ڈھیروں دعائیں۔

✉ عمران مظہر ژوب سے۔ ''محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ واقعہ مجھے سنایا گیا باقی اسے کہانی کے روپ میں، میں نے خود ڈھالا ہے۔ منظر کشی بھی میں نے کی ہے۔ بہت جلدی میں لکھی ہے۔ آپ محسوس کر لیں گے کئی غلطیاں ہیں جنہیں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ ان کی درستگی کیجیے گا۔ کہانی میں نام بدل دیئے ہیں میں نے۔ اپنے شہر کا نام میں نے ظاہر نہیں کیا۔''

☆ بھائی عمران! آپ کی کہانی پر جہاں جہاں قلم لگانے کی ضرورت ہوگی وہ کام ناصر بھائی بخوشی کریں گے آپ مطمئن رہیے۔

✉ نعمان اسحاق فیصل آباد سے۔ ''السلام علیکم! خیریت مطلوب۔ آپ میرا ناول ''نیلی کہانی'' اشاعت کے لیے منتخب کر چکے ہیں۔ زیر نظر کہانی اگست کے پراسرار نمبر کے لیے ہے۔ اس کہانی میں ایک پسماندہ گھر کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ اس گھر میں پیدا ہونے والا بچہ آسیب زدہ ہے۔ یہ کہانی اس حقیقی عکس کو پیش کرتی ہے جو آسیب سے متعلق ہماری زندگیوں میں جھلکتا ہے۔ مجھے قوی امید ہے یہ کہانی میرٹ کی بنیاد پر پراسرار نمبر میں جگہ بنا لے گی۔''

☆ بھائی نعمان! ہمیں بھی امید ہے کہ آپ کی پراسرار کہانی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

✉ سیمیں غزالہ نہاں کراچی سے۔ ''السلام علیکم! امید ہے خیریت ہوگی۔ آپ کی بڑی مہربانی آپ نے میری دو کہانیاں قریبی اشاعت میں شامل کیں۔ اس مہینے تو میری کہانی ''صراط مستقیم'' انعام یافتہ بھی ٹھہری، اس کے لیے بھی میں آپ کی مشکور ہوں۔ میری کہانی کو جن جن قابل احترام لکھاریوں نے پسند کیا ان سب کا بھی شکریہ۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی سچی کہانیوں کی تحریروں پر تبصرہ کروں مگر یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ وہ سب نامور لکھنے والے ہیں اور میں ابھی طفل مکتب..... منزہ سہام صاحبہ کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ اتنی کم عمری میں ماشاء اللہ بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔'' شہید کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈائری" کے علاوہ میں ان کو قومی اخبار میں بھی پڑھتی ہوں۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ "آپ قومی اخبار اور جنگ میں لکھتی ہیں۔ وہ سب سطحی پیپر ہیں ہمارا معیار کچھ اور ہے" دل چاہتا ہے منزہ صاحبہ کی قومی اخبار میں لکھی تحریر میں ان کو دکھاؤں..... پھر کہیں کہ اس میں کون لوگ لکھتے ہیں۔ میرا خط بہت طویل ہو گیا ہے اس لیے اب اجازت۔ ایک کہانی "میری انجانی سوکن" بھیج رہی ہوں۔ پھر کہوں گی معیار پر اترے تو شاملِ اشاعت کر لیں، پیشگی شکریہ۔"

☆ تسمیں ڈیئر! رائے دینا تو تمہارا حق ہے..... میری تحریر اچھی لگتی ہے بہت شکریہ..... لوگوں کی باتوں کی پرواہ مت کیا کرو بہت خوش رہو گی۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے۔ آئندہ بھی "احوال" میں تمہارا انتظار رہے گا۔

☒ فرید عالم نقشبندی کراچی سے۔ "آپی منزہ سہام السلام علیکم! تمام "سچی کہانیاں" کے چاہنے والوں آپ سب کو بمع اسٹاف کو عقیدت بھرا اسلام! جون کی گرم دوپہر اور قیامت کی گرمی میں "سچی کہانیاں" منظر عام پر اپنی پوری آب و تاب سے آکر ہم سب کے لیے ٹھنڈی ہواؤں کا پیغام لایا اور روحانی خوشیاں دیں۔ ہمارے رہنما بانی محترم سہام مرزا صاحب نے "سچی کہانیاں" کی سچی اور حقیقی بنیاد رکھی۔ دوستو! پورے پاکستان میں "سچی کہانیاں" واحد ادارہ ہے جہاں سے ہم نئے لکھنے والوں نے قلم پکڑنا اور لکھنا سیکھا ہے۔ یہ ہمارا پسندیدہ ترین رسالہ ہے، ہم اس کی کامیابی اور ترقی کے لیے دعا گو ہیں۔"

☆ فرید بھائی! ابو کو آپ نے بہت محبت سے یاد کیا۔ خوش رہیے۔ میں تو بس یہی کہوں گی آپ کو رسالہ اس قدر پسند ہے شکریہ۔

☒ محمد راشد فرہاد لکھتے ہیں۔ "محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ ناصر بھائی بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے جون کے شمارے میں نہ تو میرا کلام شائع ہوا اور نہ ہی میری تصویر، میرے ساتھ اتنا غیروں والا سلوک کیوں کیا گیا، کیا میری غزلوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا جب کہ میں "سچی کہانیاں" گزشتہ چار سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ کو میری باتیں ناگوار گزریں لیکن کیا نئے لکھنے والوں کی آپ اس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟ ناصر بھائی اگر میں نے کچھ زیادہ کہہ دیا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ بہر حال مجھے ضرور بتائیے گا میرا کلام اور میری تصویر کہاں گئی۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

☆ بھائی راشد! آپ نے یہ کیسے سوچا کہ آپ کو نظر انداز کیا گیا۔ آپ کی شاعری شعبہ منظومات کو بھجوا دی گئی ہے۔ جیسے ہی قابلِ اشاعت کی صورت واپسی ہوئی شائع کر دیں گے۔

☒ حافظ مون شاہ سرگودھا سے۔ "حمد، اُس خدا کی جو مطلق العنان حقیقی بادشاہ ہے اور اپنی قدرت کے ہر زاویہ اظہار پر قادر ہے۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! ماہ جون کا شمارہ خوب صورت سرورق اور خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ ملا۔ اچھا لگا۔ "گولڈن ہارٹ" "ویل ڈن۔" "بدن کا طواف" "ویری گڈ" "خواب سراب" "ویری نائس۔" "شہید کی ڈائری" آل ویز پرفیکٹ۔ میری ارسل کردہ "خیال آرائی" اور شاعری شامل نہیں تھی۔ دکھ ہوا اور کہانیوں کے بارے میں محترم انکل ناصر رضا نے فون پر بتلایا ہے کہ ایک دو ماہ میں چھپ جائیں گی۔ آپ کو وعدہ یاد رہے تو نوازش ہو گی۔ میں نے آپ کو یہ بتانا تھا کہ مارچ میں میری کہانی کو انعام یافتہ قرار دیا گیا تھا مگر وہ انعام تا حال نہیں ملا، خیر۔ زورِ قلم اور زورِ کرم اور اور زیادہ۔"

☆ ڈیئر مون! انعام تو اب تک مل گیا ہو گا۔ مجھے ضرور مطلع کرنا، یاد رکھی مت ہوا کرو، دیر سویر ہو جاتی ہے رسالہ بھی تو تبھی لوگوں کا ہے۔

☒ وفا صدام حسین غازی تنو حیدر آباد سے۔ "محترم و مکرم بہن منزہ سہام کیسی ہیں۔ امید کرتے ہیں بالکل ٹھیک ہوں گی آپ۔ بہن جون کا پرچہ ملا بہت ہی اچھا لگا۔ ہر تحریر بہت ہی خوب صورتی سے سجی تھی۔ ہر سلسلہ بہت ہی پیارا لگا۔ ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ "سچی کہانیاں" کو اور کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ بہن ایک پراسرار کہانی بھیج رہا ہوں اچھی ہو تو شائع کر دیجیے گا نہیں تو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیجیے گا۔ ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ لکھتے رہیں گے۔ ہمیں محترم ناصر رضا کا فرمان یاد ہے جو ہم کبھی نہیں بھولیں گے انہوں نے کہا تھا..... ہمیشہ اچھا لکھنے کی کوشش جاری رکھنا..... محترم بہن ہم اس بار جلدی میں ہیں۔ اس لیے کہانیوں پر تبصرہ انشاء اللہ زندگی رہی تو اگلے ماہ ضرور کریں گے اب اجازت دیجیے۔ اس دعا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ اللہ تعالیٰ عرش پاک کو حفظ امان میں رکھے، آمین۔"

☆ بھیا وفا صدام حسین! آپ کی کہانی ناصر بھائی کے حوالے کردی ہے، آخری فیصلہ کہانیوں کے بارے میں انہی کا ہوتا ہے۔ آپ کو سلسلے اچھے لگے، شکریہ۔

✉ عکاشہ سحر ملتان سے۔ "قابل احترام منزہ صاحبہ، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ دعا ہے کہ خالق کائنات آپ اور آپ سے منسلک تمام تر رشتوں کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ شمارہ جون بہت سی اچھی تبدیلیوں کے ہمراہ نظر نواز ہوا۔ "احوال" میں تمام دوستوں کے خطوط اچھے تھے۔ بہت سے نئے نام پڑھ کر اچھا لگا۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ راجہ محمود صاحب اس بار پھر سے لاجواب تحریر لائے۔ نازیہ حسن کے بارے میں تفصیلی معلومات پڑھ کر از حد خوشی ہوئی۔ راجہ صاحب خوب صورت لہجے کے اداکار شفیع محمد شاہ صاحب کے بارے میں بھی لکھیں۔ امراؤ طارق کی تحریر کردہ کہانی "بدن کا طواف" ادبی ذائقہ اور تاثر لیے ہوئے تھی۔ بہت بھرپور اور جامع تحریر تھی۔ بعض جملے بہت خوب صورت اور چونکا دینے والے تھے۔ آخری پیراگراف بہت عمدہ۔ خلیل جبار صاحب اس بار بھی موبائل کہانی کے ہمراہ تشریف لائے اچھی کہانی تھی۔ ارم زہرا کی تحریر نے اداس کردیا۔ جب حادثے اپنی طرف بلاتے ہیں تو یونہی ہوا کرتا ہے۔ ایک خاص وقت میں ایک مقرر کردہ مقام پر انسان کو اور حادثے کو ملنا ہوتا ہے۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم حادثوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ہمارے اردگرد رہتے ہیں۔ "گردش رنگ چمن" خوب ہے۔ "شہید کی ڈائری" کے سلسلے کی دل گداز تحریریں گہرے دکھ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ "خواب سراب" بھی اچھی کہانی تھی۔ کہانیاں بس اتنی ہی پڑھ سکی ہوں۔ کاشی چوہان کی نظم اچھی لگی۔ نئے سلسلے اچھے لگے۔ وہ احباب جو "احوال" کا مان ہوا کرتے تھے ان سے گزارش ہے کہ مصروفیات ترک کر کے لوٹ آئیے۔ تمام احباب کو محبت بھرا اسلام۔ خدا آپ سب کا حامی و ناصر ہو، (آمین)"

☆ ڈیئر عکاشہ! خوش رہو۔ تمہارا سفرنامہ مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہے۔ بہت اچھا لکھ رہی ہو اور آئندہ بھی ایسے ہی لکھتی رہنا۔

✉ ارشد علی ارشد یو اے ای سے۔ "السلام علیکم! غالباً ایک سال سے اوپر کا عرصہ بیت چکا ہے۔ "احوال" میں شرکت سے محروم ہوں۔ اس بات کی خوشی رہی آپ اور میڈم منزہ سے رابطے میں رہا مگر احوالیوں سے کٹ کر بہت رنجیدہ رہا ہوں۔ ناصر بھائی! زندگی نے اپنا ٹیڑھا میڑھا سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ گزشتہ سال وہ تمام سانحات جو میرے علم میں نہیں آئے اور جس پر میں اظہارِ افسوس نہ کرسکا، اُن کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے معذرت، مقدر نے جن کے حصے میں خوشیاں لکھی تھی۔ انہیں بے حد مبارک باد۔ مجھے بہت سے پڑھنے والوں نے ای میل اور فیس بک کے ان بکس میں پوچھا۔ مبادا میں "سچی کہانیاں" سے ناراض تو نہیں ہوں۔ جنہیں جواب دے چکا ہوں وہ جان گئے ہیں مگر جنہیں بتا نہ سکا ان کی تشفی کے لیے عرض کیے دیتا ہوں۔ "سچی کہانیاں" نے مجھے ہمیشہ عزت اور محبت دی ہے۔ میڈم منزہ نے تو اس میں کمال حد تک اضافہ کیا ہے۔ میڈم نے اپنے مضمون (جو انہوں نے میری کتاب "عشق سمندر" میں لکھا ہے) میں اس مان کا اظہار کیا ہے۔ "ارشد علی ارشد کی میرے ادارے سے وابستگی ہمارے لیے فخر کی بات ہے" میڈم کے یہ الفاظ میرے لیے ایوارڈ ہیں اور ایوارڈ سے انسان کو بڑی محبت بڑی چاہت ہوتی ہے۔ میری ادارے سے وابستگی انشاء اللہ زندگی بھر رہے گی۔ جس کا ثبوت ایک طویل کہانی "مکھنی" لے کر حاضر ہوا ہوں، مجھے یقین ہے آپ اسے "عشق سمندر" سے بڑھ کر پائیں گے۔ ان تمام قارئین کا بے حد شکریہ جنہوں نے مجھے "احوال" میں یاد رکھا۔ مجھے فون کیے اور ای میل ارسال کی۔ افشاں سحر طارق، جناب انکل محمد فہیم، رضوانہ کوثر آپی، فائزہ شہزاد سسٹر، سسٹر حسین جونیجو اینڈ زرینہ جونیجو، یہ میرے وہ بہن بھائی ہیں جنہوں نے مجھے خواہ یو اے ای میں ہوں، یا پاکستان میں مجھے فون کر کے یاد رکھا ہوا ہے۔ "احوال" میں نئے ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ نئے لکھنے والوں کو بھی مبارک باد اور خوش آمدید۔ ناصر بھائی آپ کی منشا پوری کردی ہے میں نے۔ ابھی حال ہی میں ایک ناول لکھ کر پبلشر کو دیا ہے۔ اس کے باوجود جب آپ نے "سچی کہانیاں" کے لیے تقاضا کیا تو میں انکار نہ کرسکا۔ انشاء اللہ آپ "مکھنی" کو ایک منفرد کہانی پائیں گے۔ تمام ریڈرز اور جملہ اسٹاف کو دعائیں

ماہنامہ سچی کہانیاں لاہور

شمارہ اگست 2012ء

پُراسرار کہانی نمبر ہوگا

ناقابلِ یقین، دہشت انگیز، خوفناک سچ بیانیاں،
جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی سچی داستانیں
ایسے پراثر و روحانی واقعات کا حیرت انگیز مجموعہ
شاید پہلے کبھی آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو

گزشتہ تمام پراسرار نمبرز سے منفرد

آج ہی بک اسٹال سے اپنا شمارہ مختص کرالیں

اگر آپ کے ساتھ بھی کبھی کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہو یا آپ نے کسی سے ایسی کہانی سنی ہو تو ہمیں لکھ بھیجیں، نوک پلک ہم سنوار لیں گے

وقت کم ہے، مصنفین اپنی تخلیقات 20 جون تک ارسال کردیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور سلام۔

☆ ارشد بھائی! ہم جانتے ہیں کہ اب بہت مصروف رہتے ہیں مگر آپ کے بغیر آپ کا رسالہ اداس رہتا ہے لہٰذا وقت نکال کر حاضری ضرور لگوایا کریں۔ میں آفس میں صبح 10 بجے سے شام تک ہوتی ہوں، چاہئیں تو بات کرلیں۔

✉ رضوانہ کوثر لاہور سے۔ ''پیاری اور بے حد عزیز منزہ، السلام علیکم! ڈھیروں دعائیں آپ اور رخسانہ بھابی کو۔ ادارے کو اتنا زیادہ وقت اور توجہ دینے پر ہم سب بہت خوش ہیں۔ لگتا ہے سہام بھائی کا دور واپس آگیا ہے۔ وقتی طور پر جو تعطل تھا وہ ختم ہوگیا ہے۔ رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ ویل ڈن۔ ماہ جون کا سرورق خاصہ جاذب نظر ہے۔ اشتہارات کی رنگین رہگزر سے ہوتے۔ ''کانچ کی عورت'' کو انتظار کی اوطاق میں بٹھایا۔ اداریے پر پہنچ کر خود بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یا اللہ! ہمیں معاف کردے، رحم کردے، آمین۔ رخسانہ بھابی کے ''یادوں کے اوراق'' یقیناً دلچسپ اور سبق آموز ہوں گے۔ خطوط سے سجی محفل تو اپنا گھر ہے اور آپ کا یہ فیصلہ بہت اچھا ہے کہ رائٹر کہانیوں کے ساتھ جوابی لفافہ بھیج دیں تاکہ اپنی کہانی کے بارے میں انتظار کی کوفت سے بچ جائیں۔ راجہ محمود شخصیات کی زندگی سے جڑے واقعات خوب صورت الفاظ سے سجا کر اُجاگر کرنے میں ماہر ہیں۔ نازیہ کے حسن بارے میں باتصویر تفصیلی کہانی خوب رہی۔ مرحومہ نے چھوٹی عمر میں جتنی شہرت پائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ کہانیوں کا معیار بھی خوب سے خوب تر ہوگیا ہے۔ سلسلے وار کہانیاں بھی دلچسپی سے جانب منزل رواں دواں ہیں۔ ''شہید کی ڈائری'' منزہ کی حب الوطنی کا ثبوت ہے۔ ارم زہرا کی ''زندگی بے اعتبار ہے'' نے خون کے آنسو رلائے۔ ثانیہ اور سجاد کی کہانی کے انجام پہ لکھی گئی صفیہ سلطانہ کی نظم نے مزید دکھی کردیا۔ حالات کے درکھولتا جرائم کہانیوں کا سلسلہ بھی خوب ہے اور عکاشہ سحر ایمان! آپ نے جرمنی جانے کا لکھا۔ جو ابھی جاری ہے۔ جتنا لکھا ہے، بہت خوب صورت پیرائے میں لکھا۔ اللہ تمہیں زندگی اور صحت سے نوازے۔ مجھے تو لگا کہ جو تم نے لکھا وہ میں نے دیکھا۔ مینا تاج! پیاری لڑکی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ڈائری بھی خوب معیاری رہی۔ ''خیال آرائی'' میں ممتاز احمد کی خیال آرائی پسند آئی۔ کتاب تبصرہ کو عکاشہ سحر بہت خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہے۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں عاصم خان نیازی کا انتخاب اچھا لگا۔ ''آپ کی خبر'' یہ سلسلہ دل کو بھایا۔ تمام شعرا اور رائٹرز کو کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد۔ شیخ معظم الٰہی کے لیے دعائے صحت۔ ایڈیسن بیٹا اللہ آپ کو مکمل صحت عطا کرے۔ ''بازگشت'' اب بھی تشنہ جواب ہے۔ شاعری کم کم مگر مہکتی ہوئی اور اشعر جواد کے ''رنگ'' پکے۔ نگہت عائشہ کے الفاظ سچے (ہیروشیما) محسن سلیم کے الفاظ گہرے اور کاشی چوہان کی یادیں درد آشوب رہیں۔ گویا کہ ''سچی کہانیاں'' خوب پھل پھول رہا ہے۔ بہت خوب۔ تمام تبدیلیاں اور سلسلے دلآویز لگے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت سب کے لیے خلوص محبتوں اور دعاؤں کے ساتھ۔''

☆ رضوانہ بہن! رسالہ پسند کرنے کا شکریہ۔ دیکھئے آپ کا ایک لفظ بھی نہیں کاٹا۔ بدلے میں آپ ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔

✉ عزیز جی آ چکوال سے۔ ''اچھی بہن منزہ، سلام خلوص! خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ جون کا شمارہ ملا۔ پڑھا۔ سب کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ شاعری سب کی پسند آئی۔ ڈائری اور خیال آرائی کے سلسلے بھی خوب ہیں۔ میری خیال آرائی شامل کرنے کا شکریہ۔ دعا ہے کہ رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ جملہ اسٹاف کو سلام اور دعائیں۔''

☆ بھائی عزیز! بہت اچھا اور مختصر خط لکھا مگر لگتا ہے اس بار آپ کو نہ تو ادار یہ اچھا لگا نہ شہید کی ڈائری۔

✉ شاہد فراز، حب چوکی سے۔ ''پیاری آپی منزہ سہام السلام علیکم! ناصر انکل کیے لیے ساری اچھی اور سچی دعائیں۔ ''احوال'' میں دوستوں کے دلچسپ نامے پڑھتے ہوئے گولڈن ہارٹ پر پہنچے۔ نازیہ حسن کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ امراؤ طارق کی تحریر ''بدن کا طواف'' ایک منفرد تحریر تھی۔ ''خواب سراب'' سے سبق حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھے ''شہید کی ڈائری'' کی جانب۔ آپی! اس تحریر پر میں سمجھتا ہوں کہ تبصرہ نہیں تکمل کرنا چاہیے۔ نیا سلسلہ ''سڑک کہانی'' اور ''آپ کی خبر'' بھی مثبت تبدیلی ہے اور ''سچی کہانیاں'' کی کرائم رپورٹر یعنی کہ محترمہ ارم زہرا اور محترم اقبال زمان بھی قلم کا حق ادا کررہے ہیں۔ سلسلے وار کہانیوں میں ''تاشون'' سب سے آگے نمبرون پوزیشن پر ہے اور عکاشہ جی کا سفرنامہ ''برف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زار'' بھی خاصے کی چیز ہے۔ ''میری کہانی میری زبانی'' مینا تاج سے مل کر اچھا لگا۔ آصفہ اقبال کی تحریر ''اماں جی'' نے ذہن پر ایک خوشگوار اثر چھوڑا۔ ورق ورق مہکتی شاعری میں محسن سلیم، نگہت عائشہ، اشعر جواد کے خیالات دل کو بھائے۔ اب اجازت۔''

☆ بھائی فراز! رسالہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ نے برف زار کو خاصے کی چیز کہا ہے تو واقعی میں عکاشہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپ آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا۔

✉ خلیل جبار حیدر آباد سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ جون کے شمارے کا ٹائٹل عمدہ تھا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، پسند آیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے شہر میں ہونے والے کس واقعے پر اداریہ تحریر کیا ہے۔ اداریہ بہت اچھا تھا۔ ہم بھی آپ کی دعا میں شامل ہیں۔ ''احوال'' کے خطوط بھی تنقید اور تعریفوں سے بھرپور تھے۔ ساتھ میں آپ کے جواب بھی خوب تھے۔ ہاں آپ کے افسانوں کے مجموعہ ''کانچ کی عورت'' کا اشتہار نظروں سے گزرا ہے۔ کب تک متوقع ہے؟ بے چینی سے کتاب کا انتظار رہے گا۔ آپ کے کالم بھی میں ''قومی اخبار'' میں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس سے قبل ''جرأت'' میں بھی پڑھے ہیں۔ حیدر آباد میں یہ دونوں اخبار عوام میں بہت مقبول ہیں۔ ''قومی اخبار'' میں ایک عرصے تک حیدر آباد سے کورٹ رپورٹنگ میں نے بھی کی ہے۔ ''یادوں کے اوراق'' کے عنوان سے رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کے نئے سلسلے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ ''زندہ کہانی'' میں اس بار نازیہ حسن کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بلاشبہ وہ ہماری موسیقی کی دنیا کا بڑا نام تھی۔ خصوص کہانیوں میں امراؤ طارق کی ''بدن کا طواف'' اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت خوب صورت تحریر تھی اور دوسری خصوصی کہانی سید ابو محمد آزاد کی ''خواب سراب'' بھی منفرد تھی۔ موضوع کے لحاظ سے اچھی تحریر تھی۔ آپ کی تحریر کردہ ''شہید کی ڈائری'' اس بار شاندار رہی۔ سچی کہانیوں کا نیا سلسلہ ''سڑک کہانی'' پسند آیا جس میں مینا نے بھکارنوں کی زندگی کی حقیقی کہانی پیش کی۔ سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں'' سنسنی خیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور توقع کے مطابق مزا دے رہی ہے۔ آب بیتی میں نشاط خان کی ''خوشبو کے ہم سفر'' اچھی تحریر تھی۔ جب کہ عظیم الدین انصاری کی ''فریب ہی فریب'' بس گزارا تھی۔ صائمہ سحر کی مختصر تحریر ''انسان یا درندے'' آج کل کے حالات کی اچھی تصویر کشی تھی۔ اصغاء فیصل کی ''انوکھے پریمی'' بھی پسند آئی۔ نازیہ بتول کی ''زیست پچھتاوا بنی'' اور آصفہ اقبال بلوچ کی اماں جی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ایم اے خالق بھٹی نے ''فطرت نہیں بدلتی'' میں اچھا خیال پیش کیا۔ البتہ فاطمہ بلگرامی کی سلسلے وار کہانی ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' مزا نہیں دے رہی۔ حنیف سحر کی ''گردش رنگ چمن'' کی کہانی پر میں تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں؟ طاہرہ جبیں کی ''میں دیوانی اس کی'' ایک ناآسودہ بیوی کا فسانہ تھا۔ میں اپنی کہانی پر تبصرہ دوسرے قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ اپنی تصویر ''سچی کہانیاں'' میں پہلی بار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ علی صباء کی پراسرار کہانی ''بے زبان محسن'' اچھی تحریر تھی۔ میرے شہر کی کہانی میں اس بار بھی ارم زہرا، بھوجا ایئر لائن کے سانحہ کے حوالے سے ایک اچھی کہانی ڈھونڈھ کر لائی ہیں۔ امید ہے کہ اور رائٹرز بھی ایسی کہانیاں تلاش کر کے بھیجیں گے۔ البتہ محمد اقبال زمان جو مستقل میرے شہر کی کہانی میں نظر آرہے ہیں معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی تحریر کہانی کم بلکہ نیوز رپورٹ زیادہ لگتی ہے۔ عکاشہ سحر ایمان کا سفر نامہ ''برف زار'' خوب صورت لفظوں میں سفر جرمنی کا احوال پسند آیا۔ ''میری کہانی میری زبانی'' میں اس بار مینا تاج کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ ان کی کہانیاں تو ہم پڑھتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کی اپنی زندگی کی کہانی مینا کے اپنے الفاظ میں بہت خوب صورت لگی۔ البتہ مختصر ہونے کا شکوہ رہے گا۔ مینا کو میری طرف سے سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ مستقل سلسلہ ''تاشون'' بھی خوب جا رہا ہے۔ بہت اچھے شازلی اسی طرح لکھتی رہو۔ ''خیال آرائی'' بھی اچھی تھی اور عکاشہ سحر کا کتاب تبصرہ بھی حسب معمول زبردست تھا۔ آپ کی خبر کے عنوان سے آپ نے بہت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس طرح رائٹرز اور قارئین کے بارے میں ہم باخبر رہیں گے۔''

☆ خلیل بھائی! سمجھ نہیں آرہا کہاں سے آپ کے خط پر قینچی چلاؤں۔ اداریہ بہت قریبی انسان کے ساتھ پیش آنے والا نہایت تکلیف دہ واقعہ ہے۔ اقبال زمان صاحب کی تحریر کو رپورٹ کی طرح ہی پیش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سچی کہانیاں'' میں حقیقی واقعات پر مبنی کہانیاں ہوتی ہیں مگر ہر حقیقت کو کہانی کا رنگ بھی نہیں دیا جاسکتا اس لیے آپ کو کہانی کم رپورٹ زیادہ لگتی ہے۔

☒ شگفتہ تحقیق کراچی سے۔ ''پیاری منزہ ہمیشہ خوش رہو۔ اس بار ''سچی کہانیاں'' ابھی تک پورا نہیں پڑھا ہے کیونکہ وہ اور دوشیزہ ساتھ ہی ملے تھے۔ ایک دن کے فرق سے۔ سو میں نے تو سوچا کہ ''سچی کہانیاں'' میں خط لکھنے کا ٹائم تو ختم ہوگیا اس لیے پہلے دوشیزہ پڑھا جائے۔ ''سچی کہانیاں'' میں صرف تمہارا اداریہ پڑھا اور دل ڈوب گیا پڑھ کے۔ تمہارے افسانوں کے مجموعے کا پڑھ کے دلی مسرت ہوئی۔ ایڈوانس میں مبارک باد قبول کرو۔ ''گولڈن ہارٹ'' میں نازیہ حسن کو پڑھ کے دلی مسرت ہوئی۔ راجہ محمود صاحب بہت ہی اچھی طرح سے لکھتے ہیں۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ انشاء اللہ پھر آئندہ۔''

☆ شگفتہ ڈیئر! اداریہ اس لیے نہیں لکھتی کہ پڑھ کر آپ کا دل ڈوب جائے میں آئندہ ایسا نہیں لکھوں گی۔ دعا کریں کہ جلد از جلد افسانوں کا مجموعہ آجائے۔ آپ کی تعریف راجہ صاحب تک پہنچادی ہے۔ خوش رہیے۔

☒ سدرہ انور علی، جھنگ صدر۔ ''قابل احترام آنٹی جان السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ آپ، آپ کا تمام اسٹاف اور تمام دوست بہن بھائی بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ماہ جون کا شمارہ تبدیلیوں کے ساتھ ملا۔ بہت اچھا لگا۔ تمام سلسلے پسند آئے۔ خصوصاً آپ کی خبر، ٹائیٹل اس بار تو بہت پسند آیا۔ ''گولڈن ہارٹ'' نازیہ حسن کی وجہ سے۔ آپ کا اداریہ اچھا لگا۔ ''احوال'' میں تمام بہنوں بھائیوں کے خطوط اچھے لگے۔ زندہ کہانی میں انکل راجہ محمود نے دنیا کی مایہ ناز گلوکارہ نازیہ حسن جیسی اچھی شخصیت کو متعارف کروایا۔ خصوصی کہانیوں میں ''بدن کا طواف'' کچھ خاص نہیں لگی۔ آوارہ لفظوں کو شامل کر کے کہانی کا مکھڑا خراب کیا گیا ہے۔ سید ابو محمد آزاد کی ''خواب سراب'' ٹھیک لگی۔ ''شہید کی ڈائری'' تو ہمیشہ سے ہی پسند رہی ہے۔ ''سڑک کہانی'' میں مینا تاج کی ریما، مادھوری اور ریکھا کہانی کو بہت اچھے انداز سے لکھا گیا ہے۔ بہت دلچسپ لگی۔ انکل سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں'' کہانی جنون کی حد تک اچھی لگی ہے۔ اگلی قسط کا بہت ہی شدت سے انتظار ہے۔ نشاط خان کی ''خوشبو کے ہمسفر'' کہانی بہت ہی پسند آئی۔ عظیم الدین انصاری کی کہانی ''فریب ہی فریب'' اچھی تھی۔ سسٹر صائمہ سحر کی ''انسان یا درندے'' پڑھ کر دل خوف سے لرز اٹھا۔ اصغاء فیصل کی ''انوکھے پریمی'' پڑھ کر دل بہت غمگین ہوا۔ نازیہ رضا کی ''زیست بنی پچھتاوا'' پڑھ کے یاد آیا کہ..... ایک دانشور کہتا ہے کہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھ، اس سے پہلے کہ تیری مصیبتیں طویل ہوجائیں۔ تمام لوگوں کو میرا یہ پیغام ہے کہ ہمیشہ اپنی زبان کو قابو میں رکھیں۔ آصفہ اقبال کی ''اماں جی'' اچھی لگی۔ فاطمہ بلدرامی کی ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' اچھی جارہی ہے۔ عائشہ جبیں کی ''میں دیوانی اس کی'' محبت تو ایک میٹھا زہر ہے۔ یہ کسی کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ موبائل کہانیاں خلیل جبار کی ''میری توبہ'' اور پراسرار کہانیاں پسند آئیں۔ میرے شہر کی کہانی ارم زہرا کی ''زندگی بے اعتبار ہے'' سانحہ بھوجا ایئر لائن جس کی وجہ سے پوری پاکستانی قوم سوگوار ہے۔ محمد اقبال زمان کی ''معصوم پریاں اور شیطان'' اس کہانی کو پڑھ کر جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ سفر کہانی میں عکاشہ سحر کا ''برف زار'' سفر بہت پسند آیا۔ بہت ہی خوب صورت لفظوں کا چناؤ کیا گیا ہے۔ دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ''زندگی لکھ رہی ہوں'' میں مینا تاج کی زندگی کا مختصر احوال پڑھا۔ ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ شازلی سعید مغل کی ''تاشون'' بخیر و خوبی انجام کی طرف گامزن ہے۔ ''آپ کی ڈائری'' میں تمام بہنوں بھائیوں کے انتخابات پسند آئے۔ ''خیال آرائی'' میں عزیز انکل کی سوچ پسند آئی۔ تبصرہ اور تذکرہ میں عکاشہ سحر کا احمد کامران کی شاعری پر تبصرہ لاجواب لگا۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں نرگس جمال حیدر آباد کا شعر پسند آیا۔ ''آپ کی خبر'' میں ہماری بہت ہی پیاری رائٹر مینا تاج کو سالگرہ مبارک، اللہ آپ کو ہمیشہ اسی طرح ہنستا مسکراتا ہوا رکھے۔ جس طرح اپنی پکچر میں دکھ رہی ہیں۔ ''بازگشت میں قدرت کی فیاضی پسند آیا۔ بہت ہی پیاری آنٹی جان پچھلے ماہ میں پکچرار سال کی گئی کیا آپ کو ملی یا نہیں؟ ضرور بتایئے گا۔ تمام پڑھنے والوں کو سلام۔ انکل ناصر رضا کو میرا سلام کہیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا زندگی رہی اور سانسوں نے وفا کی تو انشاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔''

☆ بھئی منی سی سدرا! کہانیاں اور سلسلے پسند کرنے کا شکریہ اور ہاں! اگر تصویر ارسال کروگی تو ضرور ملے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

✉ محمد سلیم اختر راولپنڈی سے۔ ''عزیز بہنا، سلامت رہیں۔ آداب! خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔ دو تحریریں ارسال ہیں۔ ایک پراسرار نمبر کے لیے ہے۔ کہانیاں ملنے پر ایس ایم ایس کر دیں۔ شکریہ۔ تمام اہل خانہ کو آداب اور دعائیں۔''

☆ سلیم بھائی! آپ کی تحریر مل گئی میں نے آپ کو ایس ایم ایس بھی کر دیا تھا امید ہے مل گیا ہو گیا۔

✉ بشیر احمد بھٹی بہاولپور سے۔ ''مئی 2012ء کے شمارے میں اپنا خط اور یہ خوش خبری کہ میری کہانی آپ کے پاس موجود ہے جو عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ اس خوشی میں مزید میں نے ''سچی کہانیاں'' کو ایک اور کہانی بھی ارسال کر دی ہے۔ دیر سے شائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بے شمار کہانیاں ملتی ہیں۔ جن کو آپ نمبر وار شائع کرتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ آپ ماہنامہ سچی کہانیاں کو پندرہ روزہ کر دیں۔ بلاشک آپ ایک کوپن برائے ووٹ شائع کریں اور عوام سے رائے طلب کریں۔ آپ کو تمام کوپنوں میں یہی سند یسہ ملے گا کہ جلدی سے ''سچی کہانیاں'' کو پندرہ روزہ کیا جائے۔ یہ میری ہی نہیں یوں سمجھ لیں تمام قارئین کی رائے ہے۔ اب مجھے دیکھ لیجیے مئی کے شمارے میں کہانی کی اشاعت کا مژدہ پڑھ کے جون 2012ء کی ''سچی کہانیاں'' کے شمارے میں دو نمبر کی عینک جو میری ذاتی ہے۔ لگا کے دیدے پھاڑ پھاڑ کے ورق جھاڑ جھاڑ کے دیکھتا رہا مگر کہانی ندارد۔ لیکن کئی ڈائجسٹوں کے مدیر تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ کہانیاں ضائع کر دیتے ہیں۔ آپ اچھے ہیں۔ آپ نے ناک پر مکھی بٹھالی ہے۔ یعنی عوام کی پذیرائی کر رہے ہیں۔''

☆ بھائی بشیر! آپ کا خیال درست ہے، ہمیں بے شمار کہانیاں ملتی ہیں مگر ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ لوگوں کو بہت زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے لیکن سوچیے کہانیوں کو پڑھنا پھر درست کرنا یہ ایک تھکا دینے والا کام ہے کیونکہ کام صرف ایک کہانی پر تو کرنا نہیں ہوتا ہے تمام کہانیاں ہوتی ہیں۔ جہاں تک آپ کے مشورے کا تعلق ہے تو بھائی وہ تو قابل قبول نہیں۔ پندرہ دن میں ایسا رسالہ دینا ناممکن ہے۔

✉ تحسین جونیجو بورڑی، خیر پور ناتھن شاہ سے۔ ''پیاری منزہ آپی السلام علیکم! امید ہے کہ بخیریت ہوں گی۔ ساتھ ہی آپ کو ''احوال'' میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خوش رہیے۔ ناصر انکل کے نام سلام و دعائیں۔ آپی جی کچھ عرصہ پہلے آپ کو ''ہم ٹی وی'' کے پروگرام میں دیکھا، بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ مئی کے شمارے میں ممتاز احمد کی موبائل کہانی آئی۔ اتنی شاندار کہانی تھی کہ خاص اس کے لیے خط لکھنا بھی چاہا پر وقت کی کمی کے باعث ممکن نہ ہو پایا۔ ایسی موبائل کہانی آج تک پڑھنے کو نہیں ملی تھی۔ دل نے چاہا کہ بار بار پڑھی جائے۔ نئے سلسلوں کا انعقاد بہت بھایا۔ بس کمی محسوس ہوئی تو اپنی ''محفل دوستاں کی''۔ پلیز آپی جی ہمارے جیسے چاہنے والوں پر احسان رہے گا اگر ہو پائے اہم پوائنٹ یہ ہے کہ ہم کھانا پینا چھوڑ کے بھی ہر ماہ خط لکھا کریں گے۔ پارٹی میں سب کچھ موجود ہو پر سویٹ ڈش نہ ہو مزہ نہیں آتا ناں۔ بالکل ایسا ہی اپنا ''سچی کہانیاں''۔ ایک اور بات بھی کہنا چاہتی ہوں کہ ''سچی کہانیاں'' میں سلسلے وار کہانیوں کی تعداد بہت حد تک بڑھ چکی ہے۔ صرف دو ہی سلسلے وار کہانیاں بہتر رہیں گی۔ ہمارا کام تو بس کہہ دینا ہے، باقی تو آپ کی مرضی۔ اب جون کے شمارے پر بھی کچھ رائے حاضر ہے۔ عظیم الدین انصاری کی تحریر ''فریب ہی فریب'' میں ایک خوب صورت میسج بھی چھپا ہوا نظر آیا۔ بہت خوب۔ موبائل کہانی ''میری توبہ'' سلمان کی کسی نیکی نے کام دکھایا۔ جو بچت ہو گئی۔ توبہ اچھی رہی۔ ''شہید کی ڈائری'' میں سے بہت سا خزانہ مل جاتا ہے ہر ماہ۔ ''میری کہانی میری زبانی'' مینا تاج کو جان کر اچھا لگا لیکن مزید کی بھی گنجائش ہو سکتی تھی۔ خیر اچھا رہا۔ طاہرہ جبیں کی ''میں دیوانی اس کی'' حیرت ہے شادی شدہ عورت خواہ مرد اگر وہ اسے اپنا نہیں سکتے تو یہ اپنی سوچ ہے کہ کسی کو کسی کے جذبات سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ زندگی برباد اور کچھ نہیں۔ ''سڑک کہانی'' ریما، مادھوری اور ریکھا۔ کوئی سمیل نہیں کہ ان بھکارنوں کے حالات زندگی تبدیل بھی ہوں گے۔ خیر کہانی اچھی رہی۔ خالق بھٹی بھائی کی کہانی ''فطرت نہیں بدلتی'' اس میں تو کوئی شک نہیں، یہ سبق آموز کہانی پسند آئی۔ ''انوکھے پریمی'' اصغاء باجی کی کہانی انوکھی رہی اور اختتام نے آنکھیں نم کر دیں۔ ''مرحومہ نازیہ حسن'' کے بارے میں جان کر اچھا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا مگر اداس بھی ہو گئے۔ مستقیم نوشاہی بھائی آپ سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ کبھی سوچا نہیں تھا کہ یوں اچانک ملاقات ہو جائے گی جو کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ خوش رہیں آباد رہیں۔ مہک شیخ جانی تم نے پکارا ہم چلے آئے۔ اب اس بڑھاپے میں کہاں اتنا لکھا جاتا ہے ہاہاہا، ابھی تو جی ہم خود دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، بچا خوش رہو۔ آپ کی ڈائری اور خیال آرائی میں سب کے خیالات اعلیٰ لگے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔''

☆ اچھی حسین! اتنی محبت سے خط لکھتی ہو اچھا لگتا ہے۔ یقین کرو کہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں اس میں رسالہ شائع کرنا جہاد سے کم نہیں۔ کاغذ حد سے زیادہ مہنگا ہے۔ بجلی غائب، ہڑتالیں..... بتاؤ کیا کریں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ رسالے میں کہانیاں زیادہ ہونی چاہئیں۔ اب تم لوگ بھی ساتھ دو ایک طویل عرصے تک ''محفل دوستاں'' بھی تھی چوپال بھی تھا۔ احوال میں بھی خوب نوک جھوک تھی ہم سے اور اپنے رسالے سے واقعی میں اگر محبت ہے تو اب کچھ وقت ایسے بھی گزارو تب تمہاری محبت کو مانیں گے۔ بہر حال کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

✉ قربان علی ایری، بلوچستان سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام عقیدت بھرا سلام! جون کا ٹائٹل متاثر کن تھا۔ آپ نے ''سچی کہانیاں'' میں آکر مارشل لاء لگا دیا ہے اور کام کام اور صرف کام، پر عمل پیرا ہیں۔ خوب صورت تبدیلیاں اور معیاری سلسلے دل کو بھا گئے، ویلڈن۔ اداریہ پڑھ کر احساس ہوا کہ ملک میں آگ لگی نہیں ہے بلکہ ہم نے خود لگا رکھی ہے۔ بس اگر ہمیں خود پر رحم آجائے تو اس پاک ہستی کو بھی ہماری حالت بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔ احوال میں روز بروز نکھار آتا جا رہا ہے۔ اس بار تمام کہانیاں معاشرے میں رونما ہونے والی سچائی کا عکس تھیں۔ کہانیاں کے ساتھ قلمکاروں کی تصاویر کا سلسلہ بے حد پسند آیا۔ اسے غزلوں، نظموں، احوال، خیال آرائی اور خبریہ ہے میں شائع کر دیں۔ تو سچی کہانیوں کا کونا کونا ان نایاب ستاروں سے جگمگا جائے گا۔ سچی کہانیوں کی خوب صورتی میں یہ ایک نیا اضافہ ہوگا۔ اسے جاری رہنے دیں۔ خیال آرائی، پسند اپنی اپنی، تبصرہ کتب اور خاص الخاص آپ کی خبر نے دل پر دستک دی۔ اللہ نگہبان۔''

☆ ارباب بھائی! خوش رہیے۔ بہت اچھا خط لکھتے ہیں۔ آپ کی رائے مجھے تو اچھی لگی، دیکھئے ناصر بھائی کیا کہتے ہیں۔ آپ کی تحریر بھی جلد شائع ہوگی۔

✉ رانا محمد شاہد، بورے والا سے۔ ''جون کا شمارہ من موہنی صورت کے ساتھ ملا۔ روشنیوں کا شہر آج جس طرح اندھیرے میں ڈوب رہا ہے یہ تو اسی شہر کے باسی بتا سکتے ہیں۔ میرا ایک رائٹر دوست جو برسوں سے کراچی میں مقیم تھا۔ اب مستقل اپنے آبائی علاقے مظفر آباد آچکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کبھی کراچی محبتوں، چاہتوں اور امن کا شہر تھا۔ آج کا کراچی ویسا نہیں ہے۔ اس لیے ایک دکھی دل کے ساتھ اس شہر کو الوداع کہنا پڑا۔ اداریے میں منزہ صاحبہ نے اپنے رب کے حضور دعا کی اور حقیقت یہی ہے کہ اب اللہ کے سوا اس عوام کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ ایک سحر انگیز آواز نازیہ حسن کی زندگی کا احوال راجہ صاحب نے بہت تفصیلاً لکھا۔ اندازِ بیاں بہترین تھا۔ مجھے یاد ہے نازیہ حسن کی وفات پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا کہ وہ ایک بڑی گلوکارہ ہی نہیں، ایک بڑی انسان بھی تھیں جو انسانی فلاح و بہبود کے منصوبے چلا رہی تھیں۔ ہاں..... یہی تو وہ راز ہے کہ جس کے بعد انسان قبر سے نکل کر انسانوں کے دلوں میں جا بستا ہے۔ قرۃ العین زینب عائلی قوانین پر کتاب لکھنے پر مبارک باد۔ آپ کے اکثر مضامین جنگ ڈویک میگزین میں پڑھتے رہتے ہیں جو عموماً اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ امراؤ طارق کی کہانی زبردست رہی۔ شہیدوں کی سوچ کو بڑے خوب صورت انداز میں حقیقت کا رنگ دیا منزہ سہام صاحبہ نے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاچن کے گیاری سیکٹر میں ہونے والا حادثہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ قوم کے یہ مجاہد و شہداء قوم کو آج تک نہیں بھولے۔ آج بھی حفاظت کر رہے ہیں۔ قوم کی سرحدوں کی اور سیاچن کے محاذ پر قوم کی غیرت کی حفاظت۔ بھوجا ایئر لائن کے پس منظر میں ارم زہرا کی ''زندگی بے اعتبار ہے'' بہت اچھی کہانی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف گیارہ سیکنڈ کے فرق سے بھوجا ایئر لائن کے مسافر زندگی سے موت کی وادی میں اتر گئے۔ یہ حادثہ بھی پاکستان کی فضائی تاریخ کے بڑے سانحات میں سے ایک ہے۔ مینا تاج کی اپنی کہانی دلچسپ تھی مگر تھی مختصر ذرا تفصیلاً لکھتیں۔ منورہ آپی تاریخی کہانی لکھا کرتی تھیں۔ جو سچی کہانیاں کی خاص پہچان تھی۔ آج کل وہ کہاں ہیں؟ اگر وہ زیادہ مصروف ہیں تو تاریخی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانی کا سلسلہ پھر سے شروع کریں کسی اور سے لکھوالیں۔"

☆ بھائی رانا! ٹھیک کہا آپ نے روشنیوں کے شہر کے حالات اچھے نہیں۔ دعا کیجیے کہ سب پہلے جیسا ہو جائے جب ہم سب مل کر رہتے تھے اور بہت خوش تھے۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ منورہ آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انشاء اللہ جیسے ہی صحت مند ہوں گی پھر سے تاریخی کہانیاں تحریر کریں گی۔

✉ جنجیل میتلو کراچی سے۔ "پیاری منزہ سہام جی صدا خوش رہیں، السلام علیکم! امید ہے خدا سے کہ اب تک رضا بھائی صاحب خوش وخرم ہو چکے ہوں گے۔ آمین ثم آمین۔ آپ بھی تمام "سچی کہانیاں" کے اسٹاف سمیت ساتھ خیریت کے خوش ہوں گی۔ منزہ جی میری کہانی "آگ کا دریا" کو تیسرا انعام دینے کا شکریہ۔ اب تو مجھے انعامی رقم مل جانی چاہیے۔ اس سے پہلے بھی میری کہانی جو کہ دسمبر میں شائع ہوئی تھی اور جنوری کے رسالے میں اُسے چھٹا انعام ملا تھا۔ وہ 200 روپے بھی اب تک نہیں ملے۔ اب یہ دونوں ملا کر کل 600 روپے ہوئے۔ کب ملیں گے۔ ضرور بتائیے مہربانی اور "سچی کہانیاں" جون کا کچھ پڑھا ہے۔ کہانی "خوشبو کے ہمسفر" بہت اچھی لگی اور سب انعام کے حقداروں کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد اور آخر میں سب کو سلام سب لکھنے والے والیاں خوش رہیں۔ اور زیادہ ہو زور قلم، آمین۔ میری نظم کو بھی ضرور شائع کیجیے گا مہربانی ہوگی۔ میری طرف سے سب کو شب معراج کی پیشگی مبارک قبول ہو۔"

☆ بہت ہی پیاری جنجیل! امید ہے اب تک انعامی رقم مل گئی ہوگی۔ تمہاری نظم ناصر بھائی کے حوالے کر دی ہے دیکھو کیا کرتے ہیں۔ ویسے اچھی امید رکھو۔ شب معراج اللہ تمام مسلمانوں کو نصیب فرمائے، آمین۔

✉ فرحت جمال کراچی سے۔ "منزہ صاحبہ، السلام علیکم! خوش رہیے۔ دو تین ماہ سے غیر حاضر ہونے کے بعد اب حاضر ہوں۔ اس پیاری سی محفل میں "سچی کہانیاں" میں تبدیلیاں پسند آئیں۔ ہمیشہ کی طرح راجہ محمود کے قلم سے نکلی تحریر پسند آئی۔ "گولڈن ہارٹ" نازیہ حسن ایک خوب صورت احساس بن کر رہ گئیں ہمارے دلوں میں۔ باقی تمام تحریریں اچھی لگیں۔ خاص طور سے نشاط خان کی تحریر، آصفہ اقبال اور امراؤ طارق کی کہانی "بدن کا طواف"۔ اصغاء فیصل کی تحریر بہت اچھی لگی۔ تمام سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ شاعری بہت زبردست رہی۔ نگہت عائشہ ثمرین ادریس، شفق شہکی اور کاشی چوہان سب کے کلام لاجواب رہے۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ اللہ ہم سب کے ساتھ سلامتیوں اور خیر و برکت کا معاملہ رکھے، آمین۔"

☆ سوئیٹ فرحت! تم نے سب کو خوش کیا ہے۔ چلو اچھی بات ہے مگر یار کچھ تنقید بھی تو کرو۔ سب اچھا نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ اپنے رسالے کی خامیاں مجھے بتاؤ تاکہ بہتری لائی جا سکے۔

✉ سنبل کراچی سے۔ "محترمہ منزہ صاحبہ اور ناصر بھائی! السلام علیکم! ہماری طرف بفضل خدا کسب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ابو سے متعلق میری زندگی کی سچ بیتی شائع کی، ابھی دوشیزہ کا مطالعہ کیا تو اس سے پتہ چلا کہ پراسرار نمبر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک کہانی لکھ رکھی تھی۔ سوچا بھیج دوں کیا پتہ منتخب ہو جائے۔ اب کہانی آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ پڑھ کر بتائیں کیسی ہے؟ اور ہاں اگر کوئی کمی بیشی ہو تو پوری کر دیں۔ ایوارڈ کی تقریب کب تک متوقع ہے خاصی Excitement ہوتی ہے اس تقریب کی۔ اور ہاں میری دو کہانیاں آپ کے پاس اور موجود ہیں، ان کا بھی فیصلہ کر ہی ڈالیں۔ ناصر بھائی آپ کی تحریر "ماسک" کے نام سے دوشیزہ میں پڑھی۔ بہت زبردست ہے آپ بہت اچھا لکھتے ہیں مگر بہت کم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جاب کی ذمے داریاں بھی تو نبھانی ہیں مگر پھر بھی ٹائم نکال کر لکھا کریں۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ خدا تعالیٰ آپ کو صحت کلی عطا فرمائے، آمین۔ اپنا خیال رکھیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔"

☆ بہت ہی پیاری سنبل! کیسی ہو؟ تمہاری باقی دو کہانیاں بھی انشاء اللہ جلد شائع ہوں گی اور جہاں تک ایوارڈ کا تعلق ہے تو ڈیئر دعا کرو کہ حالات کچھ بہتر ہوں، شہر کے بھی اور ملک کے بھی، تاکہ خوشی منانا اچھا بھی لگے۔ ناصر بھائی کی تحریر اچھی لگی وہ شکریہ کہہ رہے ہیں اور یقین کرو، میں بھی اُن سے یہی کہتی ہوں کہ افسانے ضرور لکھا کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

✉ عبدالرؤف عدم راولپنڈی سے۔ ''محترمہ آپی منزہ سہام السلام علیکم! کیسے مزاج ہیں آپ کے۔ ازحد مصروفیت نے ہمیں ''احوال'' سے دور ضرور کیا ہے لیکن ''سچی کہانیاں'' سے دور ہم ہرگز نہیں ہوئے۔ آپ نے ''احوال'' کا چارج سنبھالا تو بہت دل چاہا کہ ''احوال'' میں حاضری ممکن ہو لیکن مصروفیت نے موقع نہ دیا۔ ہمارے ایم اے انگلش کے پیپرز تین جولائی کو ختم ہو رہے ہیں، اس کے بعد انشاء اللہ لازمی ''احوال'' میں حاضر ہوں گے۔ آپی! ہم پرائیویٹ اسکول چلاتے ہیں اور اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے اسکول کا سہ ماہی میگزین ''صبح بہار'' کے نام سے نکالتے ہیں۔ آپ کو اس میگزین کی دو عدد کاپیاں ارسال کر رہے ہیں۔ دلی خواہش ہے کہ ہمارے اس میگزین پر آپ اپنی قیمتی رائے سے ہمیں ضرور نوازیں۔''

☆ بھائی عبدالرؤف! آپ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ بہت خوش نصیب ہیں کہ اپنے ملک کے لیے کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو ڈھیروں کامیابیاں عطا فرمائے۔ آپ نے اپنے میگزین کے بارے میں رائے مانگی تو بھائی میں کہاں اس قابل کہ کچھ کہہ سکوں۔ بہرحال کوشش کروں گی کہ چند جملے لکھ کر آپ کو ارسال کر سکوں، خوش رہیے۔

☆ مصباح فاطمہ نامعلوم مقام سے..... مصباح! تمہارا خط ہمیں بہت دیر سے ملا، تبصرہ بالکل باسی ہو چکا تھا مگر تم نے اپنے رسالے کے لیے وقت نکالا لہٰذا ہمارا بھی فرض ہے کہ تمہارے لیے کچھ جگہ نکالیں۔ ڈیئر خط ہر مہینے کی دس تاریخ تک ارسال کر دیا کرو، خوش رہو۔

✉ مور شاہد حسین وفا کراچی سے۔ ''پیاری آنٹی منزہ سہام السلام علیکم! امید ہے کہ آپ ''سچی کہانیاں'' کا اسٹاف اور قارئین حضرات بالکل خیر سے ہوں گے۔ انکل ناصر رضا اور سب قارئین کو خصوصی سلام و دعائیں اور نیک تمنائیں۔ جون کا شمارہ ملا، تبدیلیاں بہت پسند آئیں۔ سرورق سے لے کر ''بازگشت'' تک دل کی آنکھ سے دیکھا۔ آنٹی آپ نے اداریہ میں ''رب العزت معاف کردے'' کے عنوان سے لاجواب لکھا اور ''شہید کی ڈائری'' بھی خوب لکھتی ہے۔ یہ وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ آنٹی زور قلم اور زیادہ۔ ''احوال'' میں بہنوں بھائیوں کے خطوط اور آپ کے جوابات بہت شاندار تھے مگر اس حسین محفل میں بہن سدرہ انور علی کہیں دکھائی نہیں دیں۔ خیر تو ہے بہن؟ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ زندہ کہانی راجہ محمود صاحب نے ''گولڈن ہارٹ'' نازیہ حسن کی زندگی پر خوب لکھا۔ خصوصی کہانیاں امراؤ طارق کی تحریر ''بدن کا طواف'' پڑھی۔ بشریٰ اعتبار کی سولی پر چڑھی دیکھی۔ دل خون کے آنسو رویا۔ سید ابومحمد آزاد کی تحریر ''خواب سراب'' دکھوں سے بھرپور تھی۔ سڑک کہانی مینا کی تحریر ''ریما، مادھوری اور ریکھا'' مینا آپ نے بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انکل سلیم فاروقی کی تحریر ''آتش جنوں'' بہت دلچسپ ہے۔ آپ بیتی میں نشاط خان کی تحریر ''خوشبو کے ہمسفر'' بہت پسند آئی۔ سبق آموز کہانی تھی اور عظیم الدین انصاری کی تحریر ''فریب ہی فریب'' کے جذبات دل کو دکھی کر گئے۔ صائمہ سحر کی تحریر ''انسان یا درندے'' پڑھی وجود لرزنے لگا۔ جگ بیتی میں اصغاء فیصل کی تحریر ''انوکھے پریمی'' پڑھی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ نازیہ بتول رضا کی تحریر ''زیست پچھتاوا بنی'' سہاگن کے لیے سبق آموز ہے۔ آصفہ اقبال بلوچ کی تحریر ''اماں جی'' بہت اچھی کہانی تھی۔ ایم اے خالق بھٹی کی تحریر ''فطرت نہیں بدلتی'' پڑھی۔ نفیسہ کے کرتوت بہت برے لگے۔ فاطمہ بلگرامی کی تحریر ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' یہ اچھا سلسلہ ہے۔ حنیف سحر کی تحریر ''گردش رنگ چمن'' پسند آئی۔ طاہرہ جبین کی تحریر ''میں دیوانی اس کی'' اچھی تھی۔ موبائل کہانیاں خلیل جبران کی تحریر ''میری توبہ'' موبائل پر دوستی کرنے والوں کے لیے سبق آموز ہے۔ پُراسرار کہانیاں علی صبا کی تحریر ''بے زبان محسن'' پڑھی دکھ ہوا۔ یہ لوگ تو جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ میرے شہر کی کہانی ارم زہرا کی تحریر ''زندگی بے اعتبار ہے'' پڑھی آنکھیں پُرملال ہوئیں، واقعی زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ محمد اقبال زمان کی تحریر ''معصوم پریاں اور شیطان'' پڑھی، دل کانپ اٹھا۔ سفر کہانی عکاشہ سحر ایمان کا سفرنامہ ''برف زار'' پسند آیا۔ میری کہانی میری زبانی مینا تاج کی تحریر ''زندگی لکھ رہی ہوں میں'' سچے لفظوں سے مختصر مگر زبردست لکھی۔ شازلی سعید مغل کی تحریر ''تاشون'' بہت خاص اور لاجواب سلسلہ ہے۔ ڈائری بہت شاندار تھی۔ ''خیال آرائی'' میں سب کے خیال اچھے تھے۔ عکاشہ سحر نے احمد کامران کی کتاب پر اچھا تبصرہ کیا۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں تمام شعر پسند آئے۔

''بازگشت'' مرحوم انکل سہام مرزا نے ''قدرت کی فیاضی'' بے مثال لکھی تھی۔ اللہ ان کے جنت الفردوس میں درجات بلند عطا فرمائے، آمین۔ آنٹی! آپ نے میری کہانی کے بارے میں بھی نہیں بتایا کہ کیسی ہے؟ قابل اشاعت ہے یا ردی کی ٹوکری ہضم کر گئی۔ پلیز بتا دیجیے گا۔ ایک موبائل کہانی بھی لکھی ہے اگر آپ کہیں تو بھیج دوں۔ ایک اور گزارش ہے کہ اس بار قینچی نہیں چلائیے گا۔ آپ کی خاص عنایت ہوگی۔ اب اجازت چاہتا ہوں اس دعا کے ساتھ اللہ تمام اہل وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔''

☆ بھائی شاہد! آپ کا اتنا تفصیلی خط شائع کر دیا۔ اب خوش ہو جائیے۔ آپ کی کہانی ناصر بھائی کے پاس ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ آئندہ دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا، موبائل کہانی ارسال کر دیں۔

✉ ملک صفدر عباس اعوان تحصیل جہانیاں سے۔ ''محترم ناصر رضا صاحب، آداب! ایک بار پھر ''سچی کہانیاں'' میں حاضری لگوانے چلے آئے، حاضری قبول فرمائیں۔ امید کرتا ہوں آپ اور ''سچی کہانیاں'' کے تمام قارئین خیر خیریت سے ہوں گے۔ خصوصی خط سمجھ کر لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی اسے خصوصی بنا دیں تو پھر کیا بات ہوگی۔ کہنے کو خط لکھنے میں کیا ہے۔ قلم اٹھاؤ اور لگی لپٹی رکھے بغیر جو بھی من میں آئے صفحہ قرطاس پر بکھیر دو لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں، کسی ایسے رسالے میں جہاں بات مختصر کرنی ہو اور لکھی بھی شگفتگی بھی برقرار رہے اور تنقید کا حق بھی ادا ہو۔ پھر جہاں اتنے لکھنے والے موجود ہوں۔ وہ بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک ہوں اس پر آپ کی ایڈیٹنگ کی قینچی بھی دھار تیز کیے منتظر ہو تو ایسے میں بے چارہ خط مشن امپاسیبل ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس بار ہمیشہ کی طرح رسالہ دیر سے موصول ہوا۔ اس دفعہ ٹائٹل گرل خاصی جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی مگر نیچے for ever نازیہ حسن کی تصویر کے سامنے جیسے سب کچھ ہی ماند سا پڑ گیا۔ کتنا بہتر ہوتا اگر ٹائٹل پر صرف نازیہ حسن کی ہی تصویر شائع ہوتی۔ نازیہ کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن اور پڑھ چکے ہیں۔ کئی تحریریں نظروں سے گزری ہیں لیکن راجہ محمود کی پراثر تحریر سے کچھ اور نئی باتیں باور ہوئیں کہ پڑھتے پڑھتے کئی بار آنکھیں نم ہوتے ہوئے بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئیں کہ آنسو پلکوں کو گراتے ہوئے صفحات کو بھی بھگوتے رہے۔ منزہ سہام صاحبہ، آپ کی ''شہید کی ڈائری'' بھی لاجواب اور سحر انگیز الفاظ کا مجموعہ تھی۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم معلوم ہوتی ہے اور پھر ایسی تحریریں تو کم ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مینا تاج جو کہ اچھی رائٹر ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی پڑھ کر اچھا لگا، اگرچہ تحریر مختصر مگر جامع تھی۔ وہ لگی لپٹی لکھے بغیر نا کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئیں۔ رسالہ کی کہانیاں تا حال نظروں سے دوری اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ خاص رسالہ کا دیر سے موصول ہونا ہے۔ وقت کی کمی یا پھر الفاظ کی کمی ''قلم کو آگے لکھنے سے روک رہی ہے'' آخر میں اپنی کہانیوں کے بارے میں کیا لکھوں۔ بس ایک گزارش کہ اب تو شامل اشاعت کر دیں۔ خاص مہربانی ہوگی۔ کچھ ذاتی اہم مصروفیات کی وجہ سے اب عرصہ طویل تک خط نہیں لکھ پاؤں گا۔ اس لیے پہلے سے معذرت، تین عدد اور مختصر مگر جامع کہانیاں بھیج رہا ہوں۔''

☆ صفدر بھائی! آپ کی کہانیاں جلد شامل اشاعت ہوں گی۔ طویل عرصے تک غیر حاضری والی بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں تو چاہتی ہوں آپ سب لوگ اپنی مصروف زندگی میں سے کچھ وقت ضرور اپنے رسالے کے لیے نکالا کریں۔

✉ خالدہ شفیق ملتان سے۔ ''ڈیئر منزہ سہام، السلام علیکم! امید واثق ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گی۔ اس بار ''سچی کہانیاں'' اندر کی طرح باہر سے بھی خوب صورت تھا۔ سرورق پر نازیہ کی خوب صورت تصویر کے ساتھ ماڈل کا معصوم سا انداز دل کو بہت بھایا۔ محمود صاحب نے ہمیشہ کی طرح ایک بہترین تحریر لکھی، نازیہ ہمیشہ سے میری پسندیدہ رہی، پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ یقیناً وہ بے نظیر ہستی تھی۔ تبدیلیاں اور نئے سلسلے بہت اچھے لگے۔ ''رب العزت'' سے لے کر ''بازگشت'' اپنی مثال آپ۔ امراؤ طارق نے ہمت خوب لکھا۔ مینا، نشاط خان، فریب زندگی اور ارم زہرا کی کہانی پر کیا کہوں.....؟ زندگی کا تو پل کا بھروسہ نہیں۔ آخر میں آتی ہوں عکاشہ کی طرف۔ بھئی آپ کا احمد کامران کی ''اجازت'' پر بھرپور تبصرہ اُداس کر گیا۔ ''برف زار'' بھی بہت خوب، ویلڈن.....! اور اب میری نظم، غزل اور کہانی پہلے ہی ارسال کر چکی ہوں۔ کچھ مسودہ اور بھیجا ہے بتائیے گا بلکہ امید ہے جلد شائع ہوگا۔ اللہ پاک سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

آؤ ہم خود ہی پھول بن جائیں
نئے موسم کے ہاتھ خالی ہیں

☆ خالدہ ڈیئر! بال بال بچی ہو، بالکل آخری تاریخوں میں خدمت لکھا کرو یار۔ تعریف لکھنے والوں تک پہنچا دی گئی ہے۔ تمہارا مسودہ مل گیا ہے۔ اب دیکھو ناصر بھائی کب چھاپتے ہیں؟

✉ ایم اے خالق بھٹی رحیم یار خان سے۔ ''عزت مآب محترمہ منزہ سہام صاحبہ، السلام علیکم! کراچی کے غم ناک اور فسادات سے پُر ماحول کی عکاسی کرتا ہوا آپ کا اداریہ ہمارے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس دفعہ اپنی سچی کہانیاں ''فطرت نہیں بدلتی'' خوب دکھ سکھ شیئر کرتی نظر آئی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ''محفل دوستاں'' والا رنگ ''احوال'' میں کچھ کچھ نمایاں ہونا چاہیے۔ مینا کی کاوش ریما، مادھوری اور ریکھا، شہید کی ڈائری، بہت اچھی لگی، ''گولڈن ہارٹ'' میں اپنی پسندیدہ گلوکارہ نازیہ حسن کے بارے میں پڑھ کر ادارہ کا ممنون اور راجہ محمود کا شکر گزار ہوں۔ سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں'' اور ''مینا تاج کی زندگی لکھ رہی ہوں'' اچھی ہیں۔ یہ جونیجو سسٹرز کہاں ہیں؟ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کو سلام پیش کرتا ہوں اور تمام ساتھیوں سے ''فطرت نہیں بدلتی'' پر تبصرہ کے لیے درخواست گزار ہوں۔''

☆ خالق بھائی! خوش رہیے۔ کہانیاں پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ ''احوال'' غور سے دیکھیے جونیجو سسٹرز میں سے تحسین جونیجو موجود ہیں اور مجھے یقین ہے جو لوگ اپنی ذاتی مصروفیت کی بناء پر اب تک دور ہیں انشاء اللہ وہ جلد پھر ہمارے درمیان ہوں گے۔

اُس شاہ کا خصوصی خط

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے۔ ''محترمہ بہن منزہ سہام، السلام علیکم! ماہ جون 2012ء کا شمارہ ''سچی کہانیاں'' دلکش ٹائیٹل نئی آب و تاب خوشگوار تبدیلیوں کی چمک دمک کے ساتھ ہاتھوں میں ہے۔ اداریہ پڑھ کر دل لرز اُٹھا۔ ''احوال'' میں سب لکھاریوں نے اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے۔ ''شہید کی ڈائری'' ایک اچھوتا اور منفرد سلسلہ ہے۔ بالعموم تمام کہانیاں اچھی رہیں اور بالخصوص امراؤ طارق کی ''بدن کا طواف'' نشاط خان کی ''خوشبو کے ہمسفر'' اور علی صبا کی ''بے زبان محسن'' دل کو چھو گئیں۔ صائمہ سحر کی ''انسان یا درندے'' اچھی کاوش تھی۔ مینا تاج نے ''زندگی لکھ رہی ہوں میں'' میں اپنے بارے میں بہت مختصر، جامع مگر بہت عمدہ لکھا۔ ''خیال آرائی'' میں تمام لکھاریوں کے خیالات بہت شاندار تھے، پسند آئے۔ پیاری بہنا! آپ کی قینچی خطوط پر خوب چلتی ہے، ہاہاہاہا۔ آخر میں ''سچی کہانیاں'' کی پوری ٹیم، تمام لکھاریوں اور قارئین کرام کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ پاک سب کو دنیا و آخرت کی پریشانیوں سے محفوظ فرمائے، آمین۔ ایک نئی ''موبائل کہانی'' پیش خدمت ہے اور اشاعت کی منتظر بھی۔ اگر سانسیں چلتی رہیں تو انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی، تب تک کے لیے خدا حافظ۔''

☆ بھائی ممتاز! قینچی بہت شرمندہ ہے اور آپ کی سفارش کی کر رہی ہے۔ حاضری لگاتے رہیے گا۔ سلیم فاروقی صاحب کا سلسلہ آپ کو کیسا لگ رہا ہے، رائے ضرور دیں۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا
منزہ سہام

راجہ محمود

سرمایۂ قلم و قرطاس

حزیں صدیقی کا خیال

جبیں وقت پر حرفِ اَبد لکھ
بھروسا کاغذی تحریر کا کیا

آہنی حوصلوں کے مالک سہام مرزا کی جہدِ مسلسل کی روداد، برسی پر خصوصی تحریر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھوک نے اُس نوجوان کو بے حال کیا ہوا تھا۔ پچھلے دو دن سے وہ محض پانی پی پی کر شکم میں مچلتی بھوک کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی جیب میں صرف ایک چونی (25 پیسے) پڑی تھی جسے وہ بار بار نکال کر دیکھتا اور واپس جیب میں رکھ لیتا۔ کئی بار خیال آیا کہ اُس چونی سے چنے ہی لے کر کھالے کہ پیٹ کی آگ تو کم ہو مگر پھر یہ سوچ کر رک جاتا کہ آگے مزید برا وقت آسکتا ہے' سو اس برے وقت کے لیے اس واحد اثاثے کو دوبارہ جیب میں ڈال لیتا۔ اسی کیفیت میں وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے راستے میں ایک ریسٹورنٹ آیا تو دل نے کہا۔ 'ایک کپ چائے پی جائے۔' مگر دماغ نے سرزنش کی۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس اکلوتی چونی سے چائے پی جائے یا نہیں کہ کسی نے عقب سے شانے پر ہاتھ رکھا' وہ جھٹکے سے مڑا' سامنے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔

ہلکی ہلکی سفید داڑھی' نکلتا ہوا گندمی رنگ' سلیقے سے بنے ہوئے بالوں کے درمیان سے نکلی ہوئی مانگ' سفید لکھنوی چکن کا کرتہ اور علی گڑھی پاجامے میں ملبوس وہ اجنبی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ہاں بھئی میاں سہام مرزا! کب پہنچے یہاں؟''

اُس شخص کے منہ سے اپنا نام سن کر نوجوان چونک اٹھا۔ 'نہ جان نہ پہچان پھر یہ شخص مجھے کیسے جانتا ہے؟' نوجوان نے الجھن آمیز نظروں سے اُس اجنبی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ 'کہیں اس کا تعلق انڈین انٹیلی جینس ایجنسی (C.I.D.) سے تو نہیں جو اس کے پیچھے پیچھے یہاں پاکستان تک چلا آیا ہے کہ چلو میاں سہام' تم ہماری حکومت سے ٹکرائے تھے' اب تم بچ نہیں پاؤ گے۔' نوجوان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر وہ اجنبی مسکرایا جس کی آنکھوں میں ایسی تیزی تھی کہ نوجوان سہام اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ نوجوان کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ شخص دوبارہ گویا ہوا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟ چلو آؤ' پہلے ایک کپ چائے پیتے ہیں۔'' پھر وہ شخص نوجوان کا ہاتھ پکڑ ہوٹل کے اندر لے آیا اور ایک خالی میز پر دونوں بیٹھ گئے۔ اُس شخص نے بیرے کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا اور پھر بولا۔ ''اور کھانے کے لیے کچھ ہے تو لے آؤ۔''

''مسکہ بن اور آملیٹ ہے' لے آؤں؟''

''ہاں' دو مسکہ بن اور آملیٹ لے آؤ۔'' آرڈر دے کر وہ نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔ نوجوان اس کے لب و لہجے پر غور کر رہا تھا جو کہ حیدر آباد دکن کے لوگوں جیسا نہیں تھا۔ وہ بہت شستہ اُردو بول رہا تھا۔

'آخر یہ ہے کون اور مجھے کیسے جانتا ہے؟' نوجوان کا ذہن ان ہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے' تم میرے ہی بارے میں سوچ رہے ہو؟ ذہن پر زیادہ زور مت دو' میں خود تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔'' ابھی اُس شخص نے اتنا ہی کہا تھا کہ بیرا ٹرے لے کر آ گیا۔

''لو' پہلے کھالو۔'' اجنبی نے نوجوان کو بن دیتے ہوئے کہا۔ نوجوان بن لینے سے پہلے اپنی کرسی سے اٹھا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گیا جب وہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو پھر وہ کرسی پر بیٹھ کر مسکہ بن اور آملیٹ پر جیسے ٹوٹ پڑا تھا۔ دو دن کے فاقے نے پہلے ہی بے حال کیا ہوا تھا جس کے باعث حلق میں جیسے کانٹے سے پڑے ہوئے تھے اسی لیے بن جیسی نرم غذا بھی بمشکل حلق سے اتر پا رہی تھی۔ نوجوان سہام نے پانی کا گھونٹ لے کر بن کو حلق سے اتارا اور پھر اجنبی کے حصے کا بن بھی خود ہی کھا گیا۔ بن کا پیٹ میں اترنا تھا کہ نوجوان کی کرسی ڈولی اور وہ دھڑام سے فرش پر گرا تھا۔ اسے گرتا دیکھ کر ہوٹل میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہوٹل میں بیٹھے افراد اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر آ گئے۔ کاؤنٹر سے مالک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے جبکہ بیرا چیخ چیخ کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ آملیٹ دیا' بن دیا' بس۔''

''پھر یہ مرا کیسے؟'' ایک شخص نے اس سے پوچھا۔ کئی افراد نوجوان پر جھک گئے۔

''سانس چل رہی ہے۔'' کسی نے اطلاع دی۔

فوراً نوجوان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔

''کیا ہوا تھا تمہیں؟'' اجنبی نے اس سے پوچھا۔ نوجوان اپنی بے ہوشی کی وجہ سمجھ چکا تھا کہ تین دن کے فاقے کے بعد معدہ غذا کو بھول چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں آنتیں سوکھ گئی تھیں۔ مسکہ بن خالی معدے میں اترا' اوپر سے گرم چائے پڑی۔ بن میں لگا مکھن پھیلا۔ نوجوان کو چکر آیا اور وہ کرسی سمیت لڑھک گیا۔

''کچھ نہیں' ایسا دورہ پہلے بھی پڑ چکا ہے۔''

رخسانہ سہام مرزا، رعنا فاروقی اور جیلانی بانو کے ساتھ ایک یادگار تصویر

اس کے گرد پورا ہوٹل جمع ہو گیا تھا۔ مالک حواس باختہ سا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ اسے خدشہ تھا' معاملہ کہیں پولیس تک نہ پہنچ جائے۔ وہ اجنبی شخص جو نوجوان کو ہوٹل میں لایا تھا' اس نے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے نوجوان کو پکارا۔

''سہام.....! سہام.....! اٹھو.....'' تھوڑی سی کوششوں کے بعد نوجوان کو ہوش آ گیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور کرسی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

نوجوان نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ اصل وجہ بتا کر اتنے لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

''چلو' میں تمہیں تمہارے ہوٹل پہنچا دوں۔'' اجنبی نے کہا اور پھر وہ دونوں باہر نکلے۔ اجنبی نے ایک سائیکل رکشا روک لیا۔ اس زمانے میں ہاتھ رکشا اور سائیکل رکشا چلتے تھے۔ وہ اجنبی نوجوان کو اُس کے ہوٹل کے سامنے اتار کر خدا حافظ کہہ کے رخصت ہو گیا تھا۔

نوجوان بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ہوٹل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچا تھا اور کوٹ کھونٹی پر ٹانگ کر چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ اُس کے ذہن پر غنودگی سی طاری تھی اس لیے جلد ہی سوگیا تھا۔

جب نوجوان کی آنکھ کھلی تو ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں دن بھر اور نصف شب گزرنے کے بعد تک وہ سوتا رہا تھا اور پھر کچھ دیر کروٹیں بدل کر وہ دوبارہ سو گیا تھا۔

صبح جب وہ نوجوان سوکر اٹھا تو اُس کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ وہ معمول کے مطابق اس دن بھی کچھ دیر بعد ہوٹل سے چل دیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے جب میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو محسوس ہوا' کچھ کاغذ سے ہیں۔ اُس نے وہ کاغذ جیب سے نکال کر دیکھے تو حیران رہ گیا۔ وہ کاغذ نہیں' نوٹ تھے' سو سو روپے کے تین نوٹ۔ وہ برطانوی حکومت کے جاری کردہ نوٹ تھے جنہیں حیدرآباد میں کلدار نوٹ کہا جاتا تھا۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ میں نے اپنا کوٹ کل کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا۔ کوٹ دن بھر اور پھر رات کو بھی کھونٹی پر ٹنگا رہا تھا۔ اگر کوئی اس میں سے نوٹ نکال لیتا تو؟ اور پھر دوسرا خیال یہ آیا کہ کہیں نوٹ جعلی نہ ہوں مگر ان پر حکومت پاکستان کی ربر اسٹامپ لگی ہوئی تھی پھر سوچا' ممکن ہے کہ حیدرآباد سے روانہ ہوتے وقت میری امی نے یہ نوٹ کوٹ کے اندر سی دیئے ہوں۔ ایک اور خیال نے بھی اُس کے ذہن میں جنم لیا۔ میں کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چلتا ہوں اس لیے ممکن ہے جیب پھٹ گئی ہو اور نوٹ تہ سے باہر آ گئے ہوں پھر خود ہی اُس کے ذہن نے اس خیال کی تردید کردی۔ ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ کوٹ کی جیب پھٹی ہوئی نہیں تھی' دوم یہ کہ وہ نوٹ صرف ایک تہ کیے ہوئے تھے' سینے کی صورت میں کئی تہیں کرنا پڑتیں پھر یہ کہ اگر میری امی کوٹ میں نوٹ سی دیتیں تو مجھے ضرور بتاتیں۔ اُس نوجوان نے خاصا غور کیا کہ میری جیب میں یہ تین سو روپے کی رقم کہاں سے آئی؟ یہ نوٹ میری جیب میں کس نے ڈالے؟ اور پھر ہر مرتبہ اُس کے ذہن نے یہی جواب دیا کہ..... میری جیب میں نوٹ ڈالنے والا اس اجنبی کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ جب میں اس کے ساتھ رکشا میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل کی طرف آرہا تھا تو اس نے میرے کوٹ کی جیب میں نوٹ ڈال دیئے ہوں گے۔

اُس نوجوان کے ذہن میں اور بھی مختلف سوالات تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے

فاطمہ ثریا بجیا کے ساتھ، ایک مسکراتی تصویر

مثلاً یہ کہ وہ اجنبی کون تھا' کہاں سے آیا تھا۔ وہ جتنا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا' اتنا ہی اس میں الجھتا چلا جارہا تھا۔ چنانچہ اس نے تمام سوالوں کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے بارے میں سوچنے لگا کہ میری بھی کیا زندگی ہے' حیدرآباد دکن میں تھا تو شہزادہ کہلاتا تھا اور اب تین روز کے فاقے کے بعد ایک اجنبی کا ڈبل روٹی' بن کھلانا' واہ رے زندگی' تیرے کھیل بھی نیارے ہیں۔ ان ہی خیالات میں وہ نوجوان ماضی

دانش ویروی مرحوم اور ضیاء اعوان ایڈووکیٹ کے ساتھ اپنے آفس میں

میں گم ہوگیا اور اس کی سترہ' اٹھارہ سالہ زندگی کے مناظر کسی فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔

سرکار نظام کے پایۂ تخت' دکن کے دارالحکومت حیدرآباد کے محلہ نام پلی کی وہ گلیاں جہاں سہام الدین کے بچپن کا حسین دور گزرا تھا' جیتے جاگتے منظر کی صورت جیسے سامنے تھیں۔

1930ء میں حیدرآباد دکن میں آنکھیں کھولنے والے سہام الدین نے گھر میں کٹر مذہبی ماحول پایا تھا۔ والد ڈاکٹر مرزا عبدالقدوس نماز' روزے کے معاملے میں اتنے سخت تھے کہ اس حوالے سے کسی بھی قسم کی کوئی رعایت دینے کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ بچوں کی تربیت اسی سخت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ صبح تڑکے پانچوں بیٹوں کو فجر کے لیے اٹھا دیا جاتا خواہ گرمی ہو یا سردی۔ اگر کوئی اٹھنے میں ذرا بھی سستی دکھاتا تو اس پر بالٹی بھر پانی ڈال کر اس کے چودہ طبق روشن کردیئے جاتے۔ اگر کبھی پتہ چلتا کہ فلاں بیٹے نے آج ایک وقت کی نماز قضا کردی ہے تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی پھر ابا کی چھڑی ہوتی تھی اور برخوردار کی کھال۔ وہ چڑی ادھڑتی کہ موصوف آیندہ کے لیے توبہ کرلیتے۔ والد صاحب سرکار کے ملازم تھے اسی لیے ان کی پوسٹنگ آئے دن بدلتی رہتی تھی۔ کبھی اس شہر میں ہیں تو سال چھ ماہ بعد کسی اور شہر میں۔ والد ڈاکٹر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ اکثر انہیں کسی اور شہر یا قصبے میں رہنا پڑتا تھا اور گھر والے دکن میں ہوتے تھے مگر ان کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی مجال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے جو بچے کسی نماز سے غافل ہوئے ہوں۔ والد کی چھڑی کا خوف سر پر ایسا سوار تھا کہ اِدھر اذان ہوئی اور اُدھر قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ اُن ہی دنوں جب سہام الدین تقریباً 14 برس کے ہوں گے ڈاکٹر صاحب کی پوسٹنگ بیدر میں تھی۔ حیدرآباد کے مقابلے میں بیدر نسبتاً چھوٹا اور خاموش سا شہر تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سہام الدین اپنے بھائیوں کے ہمراہ والد صاحب سے ملنے اور چھٹیاں گزارنے کے لیے بیدر پہنچ گئے۔ حیدرآباد سے بیدر تک کے سفر میں پانچوں بھائی ساتھ تھے۔ اُن کے ہمراہ اُن کی ننھی منی بھابھی بھی تھیں جن کی عمر محض تیرہ سال تھی یعنی

آج کی منزہ سہام، اپنے ابو سہام مرزا اور امی کے ساتھ

وہ سب سے چھوٹے بھائی سے صرف ایک سال بڑی تھیں۔ باقی دوسرے بھائی ایک دو سال اُن سے بڑے تھے یعنی وہ سب تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ بیدر جیسا پرسکون شہر سہام الدین کو بہت بھایا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی جنت میں پہنچ گیا ہو۔ دل کرتا تھا' خوب اچھل کود مچائیں' شور کریں مگر بڑے بھائی کا احترام آڑے آتا تھا۔ سب سے چھوٹے بھائی شرارت سے باز نہیں آتے تھے مگر جب بڑے بھائی حسام الدین مرزا گھور کر تیز نظروں سے دیکھتے تو وہ یوں معصوم بن جاتے جیسے بہت بھولے ہوں۔ یہ چھوٹا سا قافلہ بیدر پہنچا تو یہاں کی پرسکون فضا سہام الدین کے دل میں اتر گئی خصوصاً وہ پہاڑی سلسلہ انہیں بہت بھایا تھا جس پر سے ڈوبتے سورج کی کرنیں اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں۔

اب یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ سہام غروب آفتاب کے وقت وہاں پہنچ جاتے اور اس نظارے میں محو ہو جاتے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس کا حکم تھا کہ جہاں بھی ہو' مغرب کی اذان سنتے ہی گھر پہنچ جاؤ' اسی وہ اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی گھر پہنچ پڑتے اور دیکھتے کہ دوسری طرف سے ریاض الد دوڑے چلے آ رہے ہوتے تھے۔ جب سب بھا گھر میں داخل ہوتے تو والد صاحب کو مصلے پر کھ ہوا پاتے چنانچہ وہ سب اُن کے پیچھے صف بنا لیتے صمصام الدین اکثر دیر سے آنے کی وجہ سے بغیر وض ہی نیت باندھ لیتے۔ ایک بار سلام پھیرنے کے بعد والد کی نظر ان کے پیروں پر پڑی۔ پیروں پر لگی مٹی صاف بیان کر رہی تھی کہ وضو کرنا ضروری نہیں سمجھ گیا۔ یہ دیکھ کر والد صاحب نے چھڑی اٹھا مگر صمصام نے انہیں کچھ ایسی بے چارگی سے دیکھا کہ اُن کا غصہ کافور ہو گیا۔ اُن دنوں سہام الدین مدرسہ فوقانیہ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور والد صاحب مذہبی ارکان کی ادائیگی کروانے کے ساتھ ساتھ اولاد کی تعلیم کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ جب بھی انہیں موقع ملتا' بچوں کا امتحان شروع ہو جاتا۔

''اچھا جی! کتابیں لاؤ۔''

تمام بیٹے دوڑتے دوڑتے جاتے اور کتابوں کا بستہ اٹھا لاتے پھر سوال شروع ہوتے۔

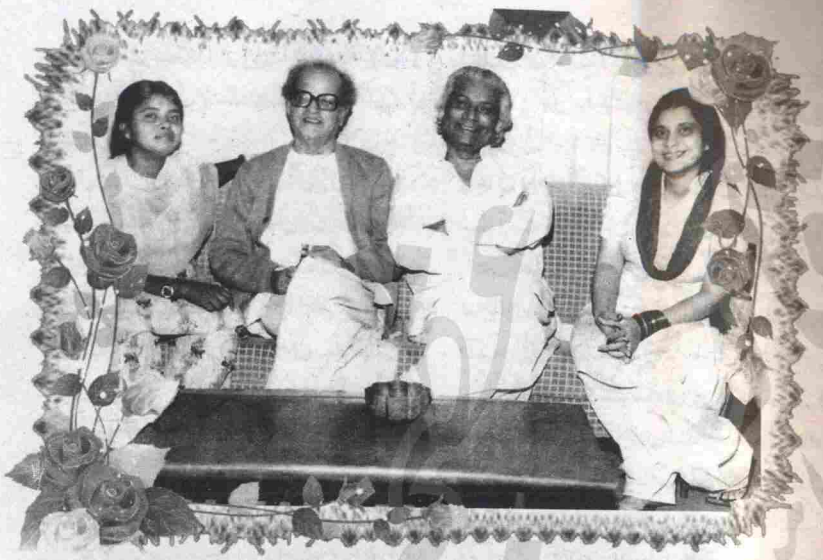

نامور کالم نگار انعام درانی مرحوم، عظمت عظمی مرحومہ اور رخسانہ سہام مرزا کے ہمراہ

''اچھا' انگریزی میں کرسی کو کیا کہتے ہیں؟ اس کی اسپیلنگ بھی بتائیں۔''

نظام حکومت میں انگریزی کی اتنی اہمیت نہیں تھی مگر جن بچوں کے والدین کا اپنے بچے کو آکسفورڈ وغیرہ بھیجنے کا خیال ہوتا' وہ انگلش پر خاص توجہ دیتے۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ اُن کے بچے بھی انگلینڈ جائیں مگر وہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اسلامی تعلیم سے بے بہرہ ہو جائیں۔ وہ گو کہ خود بہت بڑے ڈاکٹر تھے مگر مزاج دینی تھا اور علماء کی صحبت پسند کرتے تھے اسی لیے بچے انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی طاق تھے۔ ایک بار کلاس میں کسی لڑکے کو عربی کی گردان سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' اس نے کھڑے ہو کر استاد سے کہا۔

''مولوی صاحب! مجھے عربی کی گردان کے متعلق کچھ سوالات کرنے ہیں؟''

''بولو' کیا پوچھنا ہے؟''

اُس لڑکے نے اپنی پریشانی بتائی تو سہام الدین کے چھوٹے بھائی نے ہاتھ کھڑا کر دیا مگر مولوی صاحب انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بچے سے مخاطب ہوئے۔ ''تو سنو۔''

صمصام الدین نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

''میں بتاتا ہوں۔''

مولوی صاحب نے انہیں غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ؟''

پھر وہ فرفر بتانے لگے اور مولوی صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو بچہ جماعت میں سب سے شرارتی تھا' وہ عربی پر اتنا عبور رکھتا ہے؟ اُس وقت صمصام الدین درجہ ہفتم میں تھے۔

مولوی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ آپ نے کہاں سے سیکھا؟''

''ابو ہمیں ''عربی معلم'' پڑھاتے ہیں۔''

''عربی معلم'' تو دہم کے بعد پڑھائی جاتی ہے۔ آپ کے ابو کیا کرتے ہیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی، میرے ابو ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر عبدالقدوس!"

"وہ تو انگریزی پڑھے ہوئے ہیں۔ انہیں عربی کیسے آتی ہے؟"

"میرے ابو نے عربی کتاب بھی لکھی ہے۔"

"تب تو ہم اُن سے ضرور ملیں گے۔"

اور پھر ایک روز مولوی صاحب، ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلے آئے۔ اُن دنوں سہام الدین درجہ ہشتم میں تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے سہام کے متعلق پوچھ لیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے شہزادہ عالم نظر نہیں آرہے؟"

ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ وہ سہام الدین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ سہام الدین اپنی خوش لباسی اور خوش ذوقی کی وجہ سے دوستوں میں شہزادے پکارے جاتے تھے۔

"اور کہاں ہوگا، کسی دوست کے ساتھ ڈھلتے سورج کو دیکھ رہا ہوگا۔"

گھر کے تمام لوگ سہام کے اس شوق سے واقف ہو چکے تھے کہ وہ شام ڈھلے پہاڑی پر چلا جاتا ہے اور ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتا ہے۔ اس نظارے کو دیکھنے کے لیے وہاں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے تھے جن میں بچے بھی ہوتے تھے اور بڑے بھی۔ سہام الدین بھی اُن میں شامل ہو جاتا اور اس منظر میں کھو سا جاتا تھا۔

حیدرآباد علم و فن کا گہوارہ تھا جہاں سرکار کے زیرِ انتظام بہت سے کتب خانے علم حاصل کرنے والوں کی پیاس بجھانے میں پیش پیش تھیں۔ اس ماحول میں سہام الدین کی کتابوں سے محبت بڑھنے لگی تھی۔ ڈھلتے سورج کا نظارہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا ایک شوق مطالعہ بھی تھا۔ وہ سرِ شام گرتہ، پاجامہ اور شیروانی پہن کر بڑے بھائی کی سائیکل کی دکان پر پہنچ جاتے، وہاں سے سائیکل اٹھاتے۔ پہلے پہاڑی پر پہنچ کر ڈھلتے سورج کا لطف لیتے اور پھر انجمن ترقی اُردو ہند کے گشتی کتب خانے سے اپنی پسند کی دو چار کتابیں جاری کرواتے اور انہیں گھر لے آتے مگر گھر میں غیر تدریسی کتابوں کا پڑھنا ممنوع تھا اس لیے وہ اُن کتابوں کو درسی کتابوں کے درمیان رکھ کر پڑھتے تھے۔ دیکھنے والے سمجھتے کہ وہ درسی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ مطالعے کے اس جنون نے اُن کے اندر لکھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ جب وہ فرسٹ ایئر میں تھے، انہوں نے ایک افسانہ لکھا اور اُسے دوستوں کو پڑھوایا۔ سب ہی دوستوں نے اُن کی کاوش کو سراہا۔ سب کا یہی مشورہ تھا کہ اُسے کسی پرچے میں بھیج دو۔ اُن دنوں صرف حیدرآباد سے درجن بھر ماہنامے نکل رہے تھے لیکن قرعۂ فال ماہنامہ "میزان" کا نکلا۔ اس پرچے کے مدیر حبیب اللہ اوج ہوتے تھے۔ انہیں بھی یہ افسانہ بے حد پسند آیا اور پھر چھپنے کے بعد قارئین کی جانب سے بھی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ سہام الدین کا افسانہ چھپنے کی خبر دوستوں میں دھوم کی صورت گردش کر رہی تھی مگر گھر والے لاعلم تھے۔ بڑے بھائی کا رعب تھا، کوئی اُن کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی جرأت کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، تاہم "میزان" کا شمارہ کسی نے بڑے بھائی تک پہنچا دیا۔ انہوں نے بھی افسانہ پڑھا اور اتنے خوش ہوئے کہ مٹھائی منگوا کر پورے محلے میں بانٹنے کا حکم صادر کر دیا۔ مٹھائی کا بٹنا تھا کہ محلے بھر میں دھوم مچ گئی اور گھر میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پوری دنیا میں جنگِ عظیم دوم زوروں پر تھی اور برطانوی سامراج جنگ کی اس آگ میں اپنے زیرِ تسلط علاقے خاکستر کیے جا رہا تھا۔ اُسی زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں بھی زور

پکڑ رہی تھیں اور نوجوان اُن تحریکوں میں پیش پیش تھے۔ سہام الدین بھی ایسی ہی ایک تحریک کا حصہ بن چکے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں نوجوانوں کی ایک تنظیم کے فعال کارکن کی حیثیت انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ اُن ہی دنوں سہام الدین کی گھر میں بھی ایک ڈیوٹی تھی، وہ روز صبح والد صاحب کے سرہانے بیٹھ کر انہیں پورا اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بسترِ علالت پر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بیماری کی حالت میں صرف ایک خبر کا شدت سے انتظار تھا اور اپنی اسی آرزو کے تحت وہ روزانہ بیٹے سے اخبار سنا کرتے تھے۔ جب سہام الدین، والد کو پورا اخبار پڑھ کر سنا دیتے تو ڈاکٹر صاحب کے منہ سے ایک ہی سوال حسرت بن کر نکلتا تھا۔

"بیٹا.....! پاکستان بنا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔" یہ مخصوص جواب روزانہ سہام الدین کی زبان پر ہوتا تھا۔ سہام الدین کی خواہش بھی یہ تھی کہ کاش.....وہ دن جلد آئے جب وہ اپنے والد کو پاکستان بننے کی خبر سنائیں۔

اور پھر اِس دن کے لیے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ 14 اگست 1947ء کی شب ہر طرف چھوٹتے پٹاخوں نے بچے بچے کو یہ خوش خبری دے دی کہ دنیا کے نقشے پر "پاکستان" نامی ریاست وجود میں آچکی ہے۔

سہام الدین نے بھی جذبات سے مغلوب آواز میں اپنے والد کو خوش خبری سناتے ہوئے کہا۔ "ابا! پاکستان بن گیا۔"

"ہاں، سن لیا۔ اب کلمہ پڑھاؤ۔"

سہام الدین، باپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پائے اور کلمہ پڑھوانے لگے لیکن کلمہ پڑھتے ہی ڈاکٹر صاحب کی رُوح خاکی جسم سے جدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ اُن کی وہ آرزو پوری ہو چکی تھی جس کے لیے اُن کی سانسیں ابھی تک چل رہی تھیں۔

پاکستان بنتے ہی بھارت نے مستقبل کے جنوبی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اُن نوجوانوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں جو آزادی کی تحریکوں کے سرگرم کارکن تھے۔ بھارتی حکومت کی اس کارروائی کے خلاف نوجوانوں نے بھی مزاحمت شروع کر دی اور وہ توڑے دار بندوقوں سے بھارتی پولیس اہلکاروں کا مقابلہ کرنے لگے۔ اُن میں مرزا سہام الدین بھی تھے جو اب سہام مرزا کے قلمی نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ ایک دن پولیس سہام مرزا کے گھر پر بھی چڑھ دوڑی۔ اُس وقت بھارتی ظلم سے بچنے کی واحد پناہ گاہ "پاکستان" تھی۔ سہام مرزا کے گھر پر پولیس کی یورش ہوئی تو حسام الدین انہیں رات کے اندھیرے میں ساتھ لے کر حیدرآباد سے چھپتے چھپاتے نکل پڑے اور چند روز میں بمبئی پہنچ گئے۔ ایک رات سہام مرزا نے صابو سیٹھ کے مسافر خانے میں گزاری اور اگلے دن کراچی جانے والے بحری جہاز میں انہیں سوار کرا دیا گیا۔

سہام مرزا جہاز پر سوار یہی سوچ رہے تھے کہ پاکستان میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا کیونکہ وہ تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ چلتے وقت وہ اپنا مخصوص لباس شیروانی اور علی گڑھ پاجامہ وہیں چھوڑ آئے تھے اور اب پینٹ شرٹ میں تھے۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے عرشے پر ٹہل رہے تھے کہ ایک گجراتی شخص اُن کے برابر آ کھڑا ہوا۔

اُس نے پوچھا۔ "کیوں بھائی.....! کہاں سے آرہے ہو؟"

"حیدرآباد سے اور اب کراچی جا رہا ہوں۔"

"کراچی میں کوئی ٹھکانہ بھی ہے؟"

"کیا بات کرتے ہو بھائی، میں تحریک کے لیڈروں میں سے ہوں، حکومتِ پاکستان خود میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہائش کا انتظام کرے گی۔"

"بھائی میرے، حکومت تو ابھی نئی نئی بنی ہے، اسے تو خود بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ تم ایسا کرنا، کراچی میں ٹاور پر میونسپل کارپوریشن کے سامنے ایک سستا ہوٹل "ہوٹل ڈی پاک" ہے، تم سیدھے وہیں چلے جانا۔"

اُس شخص کی بات دل کو لگتی تھی۔ سہام مرزا نے گرہ میں باندھ لی۔ جہاز ساحل پر لگا تو وہ بندرگاہ سے باہر آئے۔ سامنے ایک عجیب ہی منظر تھا، ہر طرف انسان ہی انسان تھے اور انسانوں کی اس بھیڑ میں سہام مرزا خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائیں، کس سے رہنمائی حاصل کریں؟ اُس وقت انہیں اُس گجراتی شخص کا مشورہ یاد آیا اور وہ اُس کے بتائے پتے پر "ڈی پاک" ہوٹل پہنچ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل والے کا تعلق بھی حیدرآباد سے تھا اس لیے بڑے تپاک سے ملا۔

وہ ہوٹل تک پہنچ تو گئے تھے مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ جیب میں صرف ایک چونی پڑی تھی، اس سے کچھ خرید کر کھائیں یا کرایہ دیں، اسی سوچ میں گم تھے کہ ہوٹل والے نے کہا۔

"ارے میاں.....! تھک گئے ہو گے، اُدھر غسل خانہ سے پہلے نہا دھو لو پھر باتیں ہوں گی۔"

انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی پریشانی کس طرح ہوٹل والے کو بتائیں؟ شرم آڑے آ رہی تھی۔ بہرحال نہا دھو کر شہر دیکھنے نکل پڑے۔ جیب میں صرف چونی تھی لہٰذا پیدل ہی مٹرگشت کرتے رہے۔ رات گئے لوٹے تو بھوک سے برا حال تھا مگر اس اکلوتی چونی کو خرچ نہیں کیا تھا کہ جانے کب ہوٹل والا کرایہ مانگ لے۔ ملباری نے اُن کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو سب سمجھ گیا۔

"نوکری نہیں ملی، کوئی بات نہیں، خیر ہے، جب تک کام نہیں ملتا، یہیں رہو۔ جب پیسے آ جائیں، دے دینا۔"

اس طرح تین روز گزر گئے تھے، کام تو نہیں ملا البتہ یہ اجنبی ضرور مل گیا تھا جس نے انہیں مسکہ بن اور آملیٹ کھلایا تھا اور پھر اُن کی جیب میں جانے کس طرح تین سو روپے آ گئے تھے، تاہم بات اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی، یقیناً وہ پراسرار اجنبی اوپر والے کی طرف سے غیبی مدد تھی۔ ان تین سو روپوں کا تعلق بھی اُس شخص سے جڑا ہوا ہی لگتا تھا۔ وہ اِن ہی خیالات میں ڈوبتے ابھرتے ہوٹل پہنچے اور ایک چارپائی پر لیٹ گئے۔ پیٹ میں جانے والی ہلکی پھلکی غذا نے اُن کی بھوک کو چمکا دیا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو تین سو روپے کے کرارے نوٹ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

وہ چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس چارپائی ہوٹل سے نکل کر دہلی مسلم ہوٹل پہنچے۔ جیب میں نوٹ تھے اور ذہن پر تین دن کی بھوک سوار تھی، فوراً کئی ڈشوں کا آرڈر دے ڈالا۔ ایک نوجوان کو اتنا کھانا منگواتا دیکھ کر وہاں موجود لوگ حیران تھے مگر سہام مرزا کو کسی کی کوئی پروا نہیں تھی، اُن کے حواس پر تو اُس وقت صرف بھوک سوار تھی، وہ بھوک جو جرم کرواتی ہے، انسان کی عقل پر پردے ڈال دیتی ہے اور بسا اوقات اسی بھوک کے ہاتھوں انسان ایسے ایسے کام کرنے پر تیار ہو جاتا ہے جو اسے انسانیت سے گرا کر ذلت کی گہرائیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔

سہام مرزا اردگرد سے بے نیاز ہر پلیٹ میں سے ایک ایک لقمہ لے رہے تھے، اس طرح انہوں نے ایک حصہ کھایا اور تین حصے چھوڑ دیا۔ جب شکم پُر ہو گیا تو بل ادا کر کے باہر نکلے جہاں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ بھوک تو وقتی طور پر مٹ گئی تھی مگر یہ تین سو روپے کب تک چلتے

لہٰذا جلد از جلد روزگار سے لگنا ضروری تھا ورنہ چند دن میں نوبت پھر فاقوں تک آ سکتی تھی۔ اتنا بڑا شہر تھا جیسے لوگوں کا جنگل مگر اس جنگل میں وہ خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ کوئی جان پہچان تھی نہ عزیز رشتہ دار، چہار جانب اجنبی چہرے تھے۔ سمجھ نہیں آتا تھا، کہاں جائیں، کس سے کہیں؟

اُن دنوں ڈیلی ڈان، کراچی میں اردو ایڈیشن بھی ہوتا تھا۔ اس ایڈیشن کے ایڈیٹر محمد تقی تھے۔ وہ

سہام مرزا، شوکت صدیقی اور چچا ابرار شمسی، تین مرحوم دوست

رئیس امروہوی کے بھائی تھے۔ سہام مرزا سیدھے اُس اخبار کے آفس پہنچے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد نوکری کی درخواست کی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی، میں حیدرآباد دکن سے آیا ہوں۔"

"ایسا ہے کہ فی الحال ہمارے پاس کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں، زوالِ حیدرآباد پہ کوئی کالم وغیرہ لکھ دیا کریں۔"

"لکھنا لکھانا تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا، ابھی تو مجھے نوکری کی بہت ضرورت ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں، سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے جس کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں پھر کھانے کو روٹی بھی چاہیے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، کچھ لکھ لیا کرو، ایک کالم کے نو روپے ملیں گے۔ ہفتے میں نو روپے کم نہیں ہوتے۔ اگر عوام نے پسند کیا تو ہفتے میں تین چار کالم لگیں گے۔ اس طرح آمدنی کا ذریعہ بن جائے گا۔"

"کیا، لکھنے کے پیسے ملتے ہیں؟" اب تک تو وہ مفت میں لکھتے رہے تھے اس لیے حیران ہونا فطری بات تھی پھر اسی رات انہوں نے پہلا کالم لکھا۔ "میری چشم گناہ گار نے یہ بھی دیکھا" اس پہلے کالم کی دھوم مچ گئی۔ ادبی اور افسانوی طرزِ تحریر کا یہ کالم پڑھنے والوں کو بے حد پسند آیا اور محمد تقی صاحب کو بھی اندازہ ہو گیا کہ نوجوان میں بہت صلاحیت ہے۔ چند کالمز چھپنے کے بعد سہام مرزا کی مقبولیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیزی سے بڑھنے لگی تو انچارج صاحب نے اُن کے معاوضے میں ایک روپے کا اضافہ کردیا۔ اب انہیں فی کالم دس روپے ملنے لگے۔ کالم نگاری سے صحافتی حلقوں میں اُن کا نام گونجنے لگا تھا۔ اُس وقت کراچی میں، دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس کے علاوہ دیگر بڑے شہروں کے صحافی بھی آچکے تھے اور سب اپنے اپنے قلم کا جادو جگا رہے تھے۔ اخبارات میں عثمان آزاد صاحب کا انجام اور میر خلیل الرحمان کا جنگ بھی ہندوستان سے کراچی منتقل ہو چکا تھا۔ انجام، جنگ سے بڑا اخبار تھا لیکن میر خلیل الرحمان صاحب تھوڑے وسائل سے زیادہ اچھا اخبار نکالنے کے متمنی تھے۔ اُن کی خواہش تھی، اُن کے پاس بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد ہوں، اُن کے رپورٹرز، کالم نگار اور صحافی انجام سے بہتر ہوں۔ اسی کوشش میں اُن کی نظر سہام مرزا پر ٹھہری اور انہوں نے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے انہیں اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ کسی بھی اخبار میں سہام مرزا کی یہ پہلی ملازمت تھی۔ انہوں نے اخباری شعبے میں کام کے نئے انداز اختیار کیے۔ اُس وقت پاکستانی اخبارات میں انویسٹی گیٹو رپورٹنگ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا مگر سہام مرزا نے اُسی انداز کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہ صرف خبر حاصل کرتے بلکہ مکمل تحقیق کے بعد اُس خبر کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور پھر ایک مکمل اور جامع رپورٹ کی صورت میں شائع کردیتے۔ اُن کا یہ انداز پسند کیا جانے لگا اور وہ صحافتی حلقوں میں مشہور ہونے لگے۔ اس قسم کی رپورٹنگ سے جہاں مظلوم طبقے کی محبتیں اور دُعائیں ملیں، وہیں دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا، خاص طور پر کرپٹ اور راشی سرکاری افسران تو انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے کیونکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی رپورٹیں شائع کرتے تھے جن میں سرکاری محکموں میں ہونے والی کرپشن اور بدعنوانی کو عوام کے سامنے لایا جاتا تھا۔ عام افسران تو ایک طرف، سہام مرزا کا کاٹ دار قلم پولیس کے جابر قسم کے افسروں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔

اُن دنوں ایک داروغہ صاحب تھے جو ظلم کرنے کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔ اُن کا قول تھا۔ ”ملزم کو پکڑو اور اسے اتنا پیٹو کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آجائے اور جرم کا اقرار کرلے۔“ اسی داروغہ کے متعلق سہام مرزا کو ایک خبر ملی کہ وہ کسی منیجر کی ناجائز حمایت میں ایک شریف آدمی کو ستا رہا ہے۔ قصہ یوں تھا کہ وہ منیجر جو کسی سیٹھ کے ہاں ملازم تھا، اس نے ایک شریف آدمی کی بیٹی کو ورغلایا اور اس کی عزت سے کھیل گیا تھا۔ لڑکی کے والدین خاموش رہے مگر جب کچھ روز بعد انہیں علم ہوا کہ لڑکی پریگننٹ ہے تو وہ اس منیجر کے پاس گئے اور اس سے اپنی بیٹی کو اپنانے کا کہا مگر منیجر نے بجائے اس کی بیٹی سے شادی کرنے کے، الٹا انہیں دھمکیاں دینا شروع کردیں اور اس سلسلے میں اس نے پولیس کے اسی ظالم داروغہ کا سہارا لیا۔

اس لڑکی کا باپ ایک روز سہام مرزا کے پاس آیا اور اپنا مسئلہ سہام مرزا صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ سہام مرزا نے پہلے اس تمام واقعے کی تحقیق کی اور پھر اس رپورٹ کو اخبار میں شائع کردیا۔ رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ منیجر نے اپنے دوست داروغہ پولیس کی مدد لینا چاہی مگر سہام مرزا کے قلم کے آگے وہ داروغہ صاحب بھی کچھ نہ کر سکے اور آخر اس منیجر کو لڑکی کو قبول کرنا پڑی۔

ایسے جانے کتنے مظلوم تھے جن کی دادرسی سہام مرزا نے اپنے قلم کے ذریعے کی اور ڈھیروں دُعائیں سمیٹیں۔ اس دور میں کراچی ریجن میں ایک انگریز آئی جی تھے جس کا نام مسٹر گریس تھا۔ وہ افسر کرپشن اور ظلم و ستم کے معاملے میں بہت مشہور تھا۔

وہ افسر بڑے اور بارسوخ لوگوں کے اشارے پر کمزوروں کو ستاتا تھا۔ چنانچہ سہام مرزا اس کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنے میں جٹ گئے۔ اس بات کی خبر مقبول جلیس کو ہوئی جو کہ خود ایک معتبر صحافی تھے اور دوسرے دوستوں کو ہوئی تو انہوں نے سہام مرزا کو سمجھایا مگر سہام مرزا اپنے مشن سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ سہام مرزا کے عزم کو دیکھ کر سب خاموش ہوگئے پھر جب انہوں نے بہت سے ثبوت

دوشیزہ کی نامور لکھاری فرزانہ آغا، جنرل (ر) معین الدین حیدر سے دوشیزہ ایوارڈ لیتے ہوئے، سہام مرزا موجود ہیں

اکٹھے کرلیے تو خبروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر گریس نے اخبار کے مالک کو دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ وہ ڈر گیا اور اس نے گریس کے خلاف خبریں چھاپنا بند کردیں مگر سہام مرزا اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے اور ایک عزم کے ساتھ اپنا اخبار ”آبشار“ نکالا اور اس میں مسٹر گریس کا کچا چٹھا کھولنے لگے۔ گو کہ ان کا اخبار معمولی سا تھا مگر جلد ہی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے لگا۔ مسٹر گریس کے علم میں جب یہ بات آئی کہ اس کی رسوائی کا سلسلہ تھما نہیں ہے اور سہام مرزا نامی ایک صحافی اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے تو وہ خود پولیس موبائل لے کر سہام مرزا کو گرفتار کرنے نکل پڑا۔ پی پی آئی نامی خبروں کی ایجنسی کے رپورٹر اسلم علی کو جب خبر ہوئی کہ گریس پاگلوں کی طرح سہام مرزا کو ڈھونڈ رہا ہے تو وہ اپنی بائیک پر سہام مرزا کو خبردار کرنے کے لیے نکلے جبکہ مقبول جلیس سمیت دوسرے احباب بھی سہام مرزا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان سب کو خبر ہو چکی تھی کہ مسٹر گریس نے ہر تھانے دار کو سہام مرزا کی گرفتاری کا حکم دے دیا ہے۔ سہام مرزا ان سب باتوں سے بے خبر امروز کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے کہ اسلم علی نے روک لیا۔

”سہام.....! فوراً کراچی چھوڑ دو بلکہ اسی وقت نکل جاؤ.....“

”کیوں بھئی! ایسا کیا ہوگیا کراچی میں؟“

تبھی عقب سے سردار حیدر کی آواز آئی۔ ”ہاں میاں.....! وقت کم ہے، گریس پاگل کتے کی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں تلاش کر رہا ہے۔'' سردار صاحب خود بھی پولیس افسر تھے اور لکھنؤ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ ایک ایماندار اور محبِ وطن پولیس افسر تھے اور خود بھی گریس کو پسند نہیں کرتے تھے اسی لیے سہام مرزا کو خبردار کرنے آ گئے تھے۔ ان لوگوں کے سمجھانے اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سہام مرزا سیدھے اسٹیشن پہنچے اور لاہور کی ٹرین میں سوار ہو گئے جبکہ اِدھر کراچی میں سہام مرزا کی خبروں پر گریس کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی تھی۔ اس کے خلاف سب سے اہم خبر جو سہام مرزا نے چھاپی تھی، وہ یہ تھی کہ گریس نے کسی بے گناہ کو گرفتار کر کے اسے لاک اپ میں تشدد سے ہلاک کر دیا تھا لیکن پولیس نے رپورٹ بنائی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ معاملہ دب جاتا اگر سہام مرزا کو اس واقعے کی خبر نہ ہوتی۔ سہام مرزا نے نہ صرف خبر چھاپی بلکہ مقتول کی بوڑھی ماں کو اس امر کے لیے تیار کیا کہ وہ گورنر ہاؤس کے سامنے جا کر دھرنا دے پھر جب وہ دھرنا دے کر بیٹھ گئی تو اس کی تصویر اپنے اخبار ''آبشار'' میں چھاپ دی۔ بہرحال اس قسم کی خبروں سے گریس کے خلاف انکوائری ہوئی اور اس کی حکومت ختم ہوئی تو سہام مرزا لاہور سے لوٹ آئے اور دوبارہ اپنے اخبار ''آبشار'' کو شائع کرنا شروع کر دیا مگر کچھ ہی عرصے بعد ''آبشار'' پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ سچ ہمارے اربابِ اختیار کو کبھی پسند نہیں آیا۔ ''آبشار'' بند ہوا تو سہام مرزا نے ''فتنہ'' نامی اخبار نکال لیا۔ ''فتنہ'' میں کرپٹ افسروں کی داستان منفرد انداز میں ہوتی تھی۔ راشی افسروں کی تصویر اور ان سے بڑی خبر اس طرح شائع کی جاتی تھی کہ پہلے افسر کی تصویر کے ساتھ کیپشن لگتا تھا، پہلا فتنہ..... اسی طرح دوسرے افسر کی تصویر پر دوسرا فتنہ کا کیپشن لگا ہوتا تھا۔ ''فتنہ'' اخبار گویا سرکاری افسران کا نامہ اعمال ہوتا تھا جو سرکار سے برداشت نہ ہوا اور اس پر بھی قدغن لگا دی گئی۔

سہام مرزا اب تک مختلف اخبارات میں کام کر کے اندازہ لگا چکے تھے کہ اخبار مالکان حالات اور اثر و رسوخ والوں سے ڈر جاتے ہیں پھر ''فتنہ'' اور ''آبشار'' نکال کر یہ بھی جان گئے تھے کہ اس شعبے میں شہرت و عزت تو ہے مگر پیسہ نہیں ہے، بس اتنا کمایا جا سکتا ہے کہ دال روٹی چل سکے۔

اُن دنوں جب وہ فراغت کے ایام گزار رہے تھے، اُن کے دوست شاہد عابدی نے اُن کے دل میں انشورنس کی فیلڈ میں آنے کا خیال ڈالا تھا۔ عابدی صاحب انشورنس کمپنی سے وابستہ تھے۔ بقول اُن کے، تمہارے اندر بہت ٹیلنٹ ہے، تم اس فیلڈ میں کامیاب رہو گے۔ یوں ان کے زور دینے پر سہام مرزا انشورنس کی دنیا میں آ گئے پھر صحافت اور انشورنس ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سہام مرزا کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی دادرسی انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے کی تھی۔ انشورنس کی دنیا میں وہ محض زیادہ تیزی سے ترقی کرتا ہے جس کا حلقۂ احباب وسیع ہو اور جو لوگوں میں مقبول ہو، یہ دونوں چیزیں سہام مرزا کے پاس تھیں چنانچہ وہ انشورنس میں کامیابیاں حاصل کرنے لگے۔ انشورنس میں ان ہی دنوں ان کی دوستی ڈاکٹر سراج سے ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب لائف انشورنس کے پینل پر تھے اس لیے سہام مرزا تقریباً ہر شام ان کے کلینک پر ضرور جاتے تھے۔

اس روز بھی وہ ان کے کلینک کے باہر کھڑے تھے کہ ایک رکشہ آ کر رکا جس میں سے ایک لڑکی کسی خاتون کے ساتھ برآمد ہوئی اور کلینک میں داخل ہو گئی پھر کچھ ہی دیر میں دوائی لے کر واپس چلی گئی۔ سہام مرزا اندر چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے باتوں ہی باتوں میں پوچھ لیا کہ ابھی ابھی جو لڑکی گئی ہے،

اسے کیا مرض ہے؟

''کوئی مرض نہیں ہے، میں بہنوئی ہوں اس کا، اس کی ناک میں سوزش ہو گئی تھی، وہی دکھانے آئی تھی، کیوں خیریت؟''

''ہوں، تو وہ تمہاری سالی ہے، پڑھ رہی ہے؟''

''B.A. میں ہے۔ کیا بات ہے، ارادے تو نیک ہیں؟ کہیں پیغام ویغام دینے کا ارادہ تو نہیں؟''

''اگر ایسا ہو جائے تو.....'' سہام مرزا ہنس پڑے پھر اُسی شام ڈاکٹر صاحب لڑکی کی والدہ سے ملے اور سہام مرزا کے متعلق تمام معلومات دے کر رشتے کے بارے میں اُن کی رائے لی پھر لڑکے کی انکوائری شروع ہو گئی۔ جب ہر طرح سے تسلی ہو گئی تو منگنی کی تاریخ طے ہو گئی۔

یکم ربیع الاول کو منگنی کی تقریب ہوئی۔ منگنی بہت شاندار طریقے سے ہوئی تھی اور پھر ٹھیک تین ماہ بعد سہام مرزا کے آنگن میں رخسانہ صاحبہ دلہن کے روپ میں آ گئیں۔ زندگی میں عورت کا ساتھ ملا تو جیسے سہام مرزا پر لکشمی دیوی بھی مہربان ہو گئی۔ کسی نے واقعی سچ ہی کہا ہے کہ عورت کی قسمت سے مرد کو دولت ملتی ہے۔ شادی کے بعد ان پر بیمہ پالیسیاں لینے والوں نے جیسے یلغار کر دی۔ اس طرح پریمیم کی رقم سے کمیشن کا اماؤنٹ بڑھنے لگا اور زندگی خوش حالی کی طرف گامزن ہو گئی۔ اسی دوران انشورنس کی دنیا میں بہترین کارکردگی پر انہوں نے کئی انعامات بھی جیتے۔ مالی حالات بہتر ہوئے تو ایک بار پھر اپنا پرچہ نکالنے کا خیال دل میں آیا اور وہ اپنے دوست احتشام الدین کے پاس پہنچ گئے۔

''یار، میں پھر سے ایک پرچہ نکالنا چاہتا ہوں۔''

''ہفت روزہ یا روزنامہ؟'' احتشام الدین نے پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے، میں منفرد کام کرنے کا عادی ہوں، نہ روزنامہ اور نہ ہفت روزہ، اس بار ماہنامے کی صورت ایک ڈائجسٹ نکالنے کا خیال ہے، جس میں زندگی سے جڑے ہوئے ہمارے آس پاس سے متعلق افسانے اور کہانیاں ہوں گی۔''

''او بھائی.....! ایسی حماقت نہیں کر بیٹھنا، لوگ دیومالائی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں، انہیں سری ادب سے لگاؤ ہے اور تم انہیں زندگی کی تلخ حقیقتیں دکھانا چاہتے ہو جن سے وہ فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی بے وقوفی کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔''

''تم میری فطرت سے واقف ہو پھر ایسی باتیں کر رہے ہو؟ تم جانتے ہو، میں مشکل پسند ہوں اور مشکل کھیل پسند کرتا ہوں اور پھر زندگی میں رسک لیے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔''

دوست کے لاکھ سمجھانے کے باوجود اُسی دن سہام مرزا نے ڈیکلریشن کے لیے درخواست جمع کرا دی۔ دوست احباب نے بہت سے نام بتائے مگر اپنی پسند سے ڈائجسٹ کا نام ''دوشیزہ'' رکھا۔ اس پرچے کی مدیرہ کے لیے نظرِ انتخاب رعنا فاروقی پر ٹھہری۔ رعنا فاروقی صحافتی دنیا میں جانا پہچانا نام تھیں جو محتاجِ تعارف نہیں تھیں۔ سہام مرزا نے اُن سے رابطہ کیا۔ رعنا ایک بینک میں ملازم تھیں چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ پارٹ ٹائم آ کر پرچے کی ادارت کا کام کیا کریں گی۔ پرچے کا کام زیادہ تھا جو اکیلی رعنا فاروقی نہیں کر سکتی تھیں اس لیے انہوں نے ایک اسسٹنٹ مانگ لیا۔ تلاش کے بعد ایک صاحب ملے، وہ سعادت حسن منٹو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کا نام حسن عباس تھا۔ انہیں رعنا فاروقی کے اسسٹنٹ کے طور پر رکھ لیا گیا۔ اب اُن تین افراد نے پرچے پر کام شروع کیا اور دسمبر 73ء میں ماہنامہ ''دوشیزہ'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آ گیا۔ اس کی قیمت ڈھائی روپے رکھی گئی تھی۔ ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے پہلے شمارے نے ہی قارئین کی توجہ حاصل کر لی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ایسی دھوم مچی کہ اس کی اشاعت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ''دوشیزہ'' کی مقبولیت کی واحد وجہ اس کے منفرد افسانے تھے۔ ادب کا قاری دیومالائی اور غیر حقیقی واقعات پر مبنی کہانیاں پڑھ پڑھ کر بے زار ہو چکا تھا' ایسے میں جب حقیقی زندگی کے تلخ حقائق سے جڑے افسانے ''دوشیزہ'' کے ذریعے قارئین کو پڑھنے کو ملے تو اس خوشگوار تبدیلی کا پڑھنے والوں نے بھرپور خیر مقدم کیا۔ آہستہ آہستہ ادب کے نامور نام ''دوشیزہ'' سے جڑنے لگے مگر سہام مرزا ابھی بھی پوری طرح مطمئن نہ تھے' وہ کچھ ایسا کرنے کے خواہش مند تھے جس میں نیا پن ہو۔ چنانچہ انہوں نے پیشہ ور قلم کاروں کے ساتھ نئے قلم کاروں کی بھی آبیاری شروع کر دی۔ برصغیر میں اردو ادب کی آبیاری کرنے والے تقریباً تمام لکھاری ''دوشیزہ'' کے صفحات پر نظر آتے تھے۔ عصمت چغتائی' واجدہ تبسم' قمر اجنالوی' گلشن نند اور رام لعل جیسے نامور ادیبوں نے سرحد پار سے اپنی نگارشات بھیجیں۔ اُس دور کی خواتین کی لکھاریوں نے بھی بھرپور تعاون کیا جن میں بشریٰ رحمان' اقبال بانو اور رضیہ بٹ وغیرہ نمایاں تھیں' یوں نئے اور کہنہ مشق قلم کاروں کے کمبینیشن نے ''دوشیزہ'' کو ایک نیا اور منفرد رنگ دے دیا۔ اب حالت یہ ہوتی تھی کہ ''دوشیزہ'' مارکیٹ میں آتے ہی غائب ہو جاتا تھا اسی لیے لوگ ہاکروں سے کاپیاں بک کرانے لگے تھے۔ ''دوشیزہ'' بامِ عروج پر پہنچنے لگا تو سہام مرزا کے ذہن میں اور خیال آیا۔ انہوں نے یہ اعلان کر کے گویا دھماکہ کر دیا کہ اب ہم اپنے رائٹرز کو ایوارڈز دیں گے پھر جلد ہی پہلا ایوارڈ فنکشن ہوا تو اگلے روز پورے شہر میں اس پروقار تقریب کے چرچے تھے۔ قلم کاروں کی عظمت کا احساس رکھنے والوں نے سہام مرزا کے اس اقدام کو سراہا جبکہ کچھ پبلشرز اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا' اب رائٹرز خود کو ''اونچی چیز'' سمجھنے لگیں گے۔ بہرحال ''دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ'' کی تقریب ہر سال باقاعدگی سے ہونے لگی۔ اس تقریب کا انعقاد ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں ہوتا تھا جس میں معروف شخصیات مہمانِ خصوصی ہوتی تھیں۔ ''دوشیزہ ایوارڈ'' کا ڈیزائن بھی بہت منفرد انداز میں بنایا گیا تھا۔ قلم تھامے ہوئے ہاتھ والا ایوارڈ ہر طرف موضوعِ گفتگو ہوتا تھا۔ اس ایوارڈ تقریب کی کوریج ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے بھرپور انداز میں ہوتی تھی' یوں اس ایوارڈ کو حاصل کرنے کے لیے قلم کاروں میں جیسے مقابلہ بازی شروع ہو گئی۔ ''دوشیزہ ایوارڈ'' تقریب میں جو نامور ہستیاں مہمانِ خصوصی بن چکی ہیں' اُن میں ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی' شوکت صدیقی' عصمت چغتائی' جیلانی بانو' میر خلیل الرحمان' جاوید جبار' دوست محمد فیضی' اختر علی جی قاضی' صدیق سالک اور جنرل (ر) معین الدین حیدر جیسے لوگ شامل ہیں۔

''دوشیزہ'' کے عروج کے زمانے میں عصمت چغتائی جیسی معتبر ادبی شخصیت نے ''بیسویں صدی'' دہلی میں شائع ہونے والے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ ''جتنے اچھے افسانے پاکستان کے ''دوشیزہ'' میں نظر آ رہے ہیں' اتنے کہیں اور دکھائی نہیں دیتے۔'' ..... ''دوشیزہ'' کی کامیابی کے بعد سہام مرزا نے ''پندرہویں صدی'' نامی ڈائجسٹ کا اجرا کیا۔ یہ پرچہ بھی آہستہ آہستہ مقبولیت کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ''پندرہویں صدی'' کے مدیر فلم و ٹی وی کے مشہور اداکار اور نیلام گھر فیم طارق عزیز تھے۔ اسی پرچے کے علاوہ سلیم ناصر کی ادارت میں ''ٹی وی ٹیبو'' نامی میگزین کا اجرا بھی ہوا اور پھر ''شوبز نس'' جیسا میگزین بھی سہام مرزا نے نکالا۔

سہام مرزا کے ہاتھ جیسے پارس پتھر آ گیا تھا' اُن کے ادارے سے جو بھی پرچہ نکل رہا تھا' کامیابی جیسے اس کی منتظر کھڑی ہوتی تھی۔ ''شوبز نس'' ہندوستان میں بھی بہت شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ وہاں کے نیوز ایجنٹ غیر قانونی طور پر پرچہ لاہور سے ہندوستان لے جاتے تھے۔ پاکستانی فلموں اور ٹی وی کے فنکاروں کی خبروں اور تبصروں سے سجا یہ پرچہ ہاتھوں ہاتھ بکتا تھا۔ سہام مرزا نے بچوں کا رسالہ اور میڈیکل سے متعلق بھی ایک پرچہ ''میڈیکل ورائٹی'' نکالا۔ اسے بھی پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی۔ اُن ہی دنوں طارق عزیز ''پندرہویں صدی'' کے لیے اُس وقت کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا انٹرویو کرنے گئے تو صدر صاحب نے پرچے کے ٹائٹل کے حوالے سے کہا کہ اتنے اچھے پرچے پر عورت کی تصویر زیب نہیں دیتی۔ ٹائٹل پر مناظرِ فطرت کی عکاسی ہونی چاہیے۔ صدر صاحب کی فرمائش پر طارق عزیز اُن سے وعدہ کر آئے کہ ایسا ہی ہوگا۔ واپس آ کر انہوں نے سہام مرزا سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا' بس اتنا کہا کہ میرے خیال میں نئی تبدیلی کو قارئین پسند نہیں کریں گے۔ سہام مرزا کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ٹائٹل کا انداز بدلتے ہی پرچے کی سرکولیشن تواتر سے گرنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اشاعت اس مقام تک پہنچ گئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تو پھر مرزا صاحب نے ایک نیا اور اچھوتا آئیڈیا دیا اور پھر ''پندرہویں صدی'' بند کر کے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا ظہور عمل میں آیا۔ جلد ہی ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کی کامیابیوں کے ڈنکے بجنے لگے۔ مرزا صاحب کے ادارے سے نکلنے والے تمام پرچے کامیابی کے ساتھ محوِ سفر تھے کہ تب ہی سہام مرزا کے دل میں چھپی دیرینہ خواہش انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ وہ ہمیشہ اخبار نکالنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے انہیں یہ وقت سب سے مناسب اور موزوں لگا۔ اُن کے پاس وسائل بھی تھے اور حالات ہر لحاظ سے سازگار تھے لہٰذا ادارے سے نکلنے والے تمام پرچوں میں اخبار ''سویرا'' کی تشہیر کئی ماہ پہلے ہی سے شروع ہو گئی پھر وہ دن بھی

رخسانہ سہام مرزا، جیلانی بانو کے ہمراہ ایک یادگار تصویر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد آ گیا جب اخبار کا پہلا شمارہ مارکیٹ ہوا چونکہ اس کی تشہیر بھرپور انداز میں ہوئی تھی پھر اس کا معیار بھی کسی بڑے اخبار سے کم نہیں تھا لہٰذا پہلے شمارے سے ہی اخبار بھی تیزی سے کامیابیاں سمیٹنے لگا اور اخباری دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس کی رپورٹنگ اتنی بے باک ہوتی تھی کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے مگر یہ کامیابی زیادہ عرصے برقرار نہیں رہ سکی' جلد ہی اخبار کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ ان سازشوں میں بڑے بڑے اخباری مالکان بھی شامل تھے تو ساتھ ہی سیاست کے کچھ کھلاڑی بھی اس کا حصہ تھے اور روزنامہ ''سویرا'' ان سازشوں کا شکار ہوگیا۔ اس کی اشاعت تیزی سے نیچے آنے لگی۔ اس سازش میں شامل وہ لوگ بھی تھے جو بظاہر مرزا صاحب کے دوست تھے مگر درحقیقت آستین کے سانپ تھے۔ اخبار کو سنبھالنے کی تمام کوششیں بے کار ہوگئیں۔ ''سویرا'' کو سہارا دینے کے لیے روزنامہ ''انجام'' کا اجرا ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا' اثاثے بکنے لگے اور ایک وقت وہ آیا کہ ادارے کے پاس تنخواہیں دینے تک کے لیے پیسے نہیں رہے۔

وہ انتہائی کڑا وقت تھا' برے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ سہام مرزا جو کار کے بغیر دفتر نہیں آتے تھے' اب شرف آباد سے رکشا یا ٹیکسی میں یا بعض اوقات پیدل ہی آفس آنے لگے تھے۔ وہ لوگ جو اُن سے اپنی محبت اور وفاداری کا دعویٰ کرتے تھے' انہیں چھوڑ کر جانے لگے۔ ان نامساعد حالات میں جبکہ تنخواہیں دینا بھی دشوار ہوگیا تھا' ایک روز انہوں نے اپنے اسٹاف ممبران کو بلایا اور کہا کہ ادارے پر برا وقت ہے' آپ لوگ بال بچے والے ہو' یہ حالات کب تک رہیں گے' کچھ کہا نہیں جا سکتا لہٰذا اگر آپ میں سے کوئی جانا چاہے تو بے شک جا سکتا ہے۔ بعد میں اچھے دن آئے تو میں اسے بلا لوں گا۔

زیادہ تر لوگ ساتھ چھوڑ گئے اور صرف گنتی کے افراد رہ گئے پھر اُن میں سے بھی لوگ کم ہونے لگے کیونکہ دس ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ سہام مرزا اِدھر اُدھر سے پیسے لا کر آدھی' پونی تنخواہ بمشکل دے پاتے۔ وہ ایسا کڑا وقت تھا' اگر مرزا صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید بہت جلد حوصلہ ہار جاتا مگر ایسے پُرآشوب دور میں بھی وہ باقاعدگی سے دفتر آتے تھے اور اجاڑ' سنسان دفتر میں چند ایک ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ اس دوران قرض خواہ آتے اور اپنے پیسوں کا مطالبہ کرتے ہوئے اُن سے بدتمیزی کرتے مگر مرزا صاحب کمال ہمت و حوصلے سے اُن کی ناشائستگی کو برداشت کرتے ہوئے محض یہی کہتے کہ ابھی میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن میں بھاگوں گا نہیں' تمہارا تمام قرضہ چکاؤں گا۔ کچھ قرض خواہ تو ایسے بھی آتے تھے جو بدتمیزی کرنے کے ساتھ ساتھ آفس کی کوئی شے اٹھا کر ساتھ لے جاتے کہ جب پیسے دو گے تو اپنی چیز واپس لے جانا۔

صبر اور آزمائش کے یہ شب و روز آہنی حوصلہ رکھنے والے سہام مرزا کے قدم متزلزل نہیں کر سکے اور وہ ادارے کو دوبارہ اٹھانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ انہوں نے شوبزنس اور بچوں کا رسالہ بند کر کے اپنی تمام تر توجہ صرف دوشیزہ اور سچی کہانیاں پر لگا دی۔ اس طرح نئے جذبے کے ساتھ کام شروع ہوا۔ نیت صاف اور حوصلے جوان ہوں تو بڑی سے بڑی مصیبت ریت کے ذروں کی طرح ہوا ہو جاتی ہے۔ سہام مرزا اور ساتھیوں کی انتھک کوششوں سے پرچے پہلے کی طرح چلنے لگے۔ سہام مرزا کے اس سفر جرائد میں ادارتی ٹیم کے طور پر کل اور آج کی یہ معروف شخصیات شامل رہیں۔ دانش دیروی مرحوم' آغا نذیر کاوش مرحوم' شمیم نوید مرحوم' ابن حسن عثمان آبادی مرحوم' حاجی عدیل مرحوم' مقبول جلیس مرحوم' زبیر عباسی مرحوم' زیب ملیح آبادی' سیما غزل' سلیم فاروقی' پرویز بلگرامی' سلیم آذر' مصطفیٰ ہاشمی' محمد علی سید' ناصر رضا' عابدہ رؤف' وسیم اے صدیقی' فہیم صدیقی' نعیم حبیب' فریدہ مسرور وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی کا سفر اسی طرح جاری و ساری تھا کہ جنوری 2001ء میں دانش دیروی داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ دانش دیروی کی موت کا اثر سب سے زیادہ سہام مرزا نے لیا تھا۔ اب وہ اکثر کہنے لگے تھے کہ اب تو میں بونس میں جی رہا ہوں۔ اُن کی اپنی طبیعت بھی اب گری گری سی رہنے لگی تھی اسی لیے اُن کے اپنوں کو اُن کی صحت کی فکر رہنے لگی تھی مگر اُن سے چیک اپ کے لیے کہا جاتا تو وہ ٹال جاتے پھر ایک روز انہیں ڈاکٹر علی کے پاس لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے علامتیں سنیں تو چونک گئے اور کچھ ٹیسٹ لکھ دیئے پھر جب رپورٹس آئیں تو اس مرض کا علم ہوا جسے سہام مرزا جانے کب سے اپنے اندر پال رہے تھے' تاہم اس مرض کے بارے میں سہام صاحب کو نہیں بتایا گیا مگر وہ جہاں دیدہ آدمی تھے' فوراً سمجھ گئے کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ انہوں نے تصدیق کے لیے ڈاکٹر سے پوچھا تو ڈاکٹر نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''مرض خطرناک ہے......''

''کینسر ہے نا...... یہی چھپا رہے ہیں آپ مجھ سے؟ آپ کے چھپانے سے مرض تو اپنی جگہ برقرار رہے گا۔''

اُن کی بات پر ڈاکٹر انہیں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب باقاعدہ طور پر کینسر کا علاج شروع ہوا۔ علاج کی غرض سے امریکا جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ کسی نے شوکت خانم ہسپتال کا مشورہ دیا۔ وہاں بھی وہی علاج ہوتا ہے جو امریکا میں ہوتا ہے۔ کینسر کا نام سن کر گھر والے بھی پریشان ہوگئے تھے مگر مریض یعنی سہام مرزا مطمئن تھے' اُن کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار نہیں تھے پھر لاہور جانے کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

وہ دن اُن کے دفتر کا شاید ہی کوئی رکن بھول سکتا ہو' اُس روز وہ تھوڑی دیر کے لیے دفتر آئے تھے۔ اپنے کمرے سے کچھ ضروری کاغذات اکٹھے کیے اور پھر فرداً فرداً سب سے ملاقات کی اور رخصت ہوگئے تھے۔ اُس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سہام مرزا اب کبھی دفتر نہیں آئیں گے۔ لاہور میں اُن کے تمام ٹیسٹ ہوئے اور انہیں علاج شروع کرنے کا وقت دے دیا گیا اور وہ لوٹ آئے۔ کراچی آتے ہی اُن کی طبیعت بگڑ گئی اور انہیں آغا خان ہسپتال لے جایا گیا۔ دفتروں کے ساتھیوں کو پتہ چلا تو وہ بھی دوڑے دوڑے گئے۔ اُن کی حالت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ ایک روز طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ آغا خان کے ICU میں داخل کرنا پڑا۔ اُن پر یرقان کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چند روز میں ہی اُن کی حالت انتہائی شکستہ ہوگئی تھی۔ وہ شخص جس نے زندگی میں آنے والے بڑے سے بڑے طوفان کو پھونک مار کر اڑا دیا تھا' اب موت سے برسرِ پیکار تھا۔

اسی کیفیت میں 29 جولائی 2002ء کی وہ شب آ گئی جسے ڈاکٹروں نے بھاری قرار دیا تھا۔ اُس رات دنیائے ادب و صحافت کا یہ روشن چراغ جس نے اپنی روشنی سے جانے کتنے لوگوں کے اندھیرے دور کیے تھے' اب خود ٹمٹما رہا تھا۔ ڈوبتے سورج سے پیار کرنے والے سہام مرزا جو خود سینکڑوں قلم کاروں کے لیے سورج سے کم نہیں تھے۔ 29 جولائی کی اُس شب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی وادیوں میں غروب ہوگئے۔

یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن
اگر آ جائے جینا' جاوداں ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مورخہ ۱۳ جون ۲۰۱۲ء بروز بدھ دوپہر سوا بارہ بجے شہنشاہِ غزل مہدی حسن کی سانسوں کی لے ٹوٹ گئی۔ ساز کا' آواز کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ بے مثال آواز کے مالک' باکمال گائیک مہدی حسن نے زندگی سے دوری کا یہ سفر آغا خان اسپتال میں اختیار کیا..... اس آغا خان اسپتال میں ہی..... گئے برسوں میری زندگی کی وہ اداس شام بھی آئی تھی جب میں نے اس اسپتال کے ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹے شہنشاہِ غزل مہدی حسن کو اُس حال و مآل میں دیکھا تھا کہ میری آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے' دل کی زمین بھی نم ناک ہوگئی تھی۔

میں اس بات پہ ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہوں کہ کسی بھی ملک کی شان' نام اور پہچان اس ملک کے فنکار' کھلاڑی' ادبی' علمی اور سماجی شخصیات ہوتی ہیں' باقی سب بس اندر کا شور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے' سچے اور پکے کھلاڑیوں' فنکاروں' ادیبوں' علمی اور سماجی شخصیات کی محفلوں میں بیٹھنا' ان سے مکالمہ کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ خان صاحب مہدی حسن کا شمار بھی ان شخصیات میں ہوتا تھا جن کا میں دم بھرتا ہوں' سنتا ہوں تو بس سنتا ہی چلا جاتا ہوں۔ آپ کی آواز انسانی سماعت سے رشتہ جوڑے اور سننے والے کا دل نہ جھومے' یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟

❋ گلوں میں رنگ بھرے' بادِ نوبہار چلے (فیض صاحب)

❋ جس نے مرے دل کو درد دیا' اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں (منیر نیازی)

❋ ترکِ الفت کا صلہ پا ہی لیا ہے' میں نے (قتیل شفائی)

❋ رات کی بے سکوں خموشی میں (سیف الدین سیف)

❋ قصہ غم میں تیرا نام نہ آنے دیں گے (فیاض ہاشمی)

❋ شکوہ نہ کر' گلہ نہ کر (مشیر کاظمی)

❋ اک ستم اور مری جاں' ابھی جاں باقی ہے (مسرور انور)

❋ لاگی رے لاگی لگن (کلیم عثمانی)

❋ جانِ من' آج تو جو پاس نہیں (فضل احمد کریم فضلی)

❋ زندگی ایک سفر ہے جس میں لوگ ملتے ہیں' بچھڑ جاتے ہیں (قتیل شفائی)

❋ دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں (دکھی پریم نگری)

❋ پیار بھرے دو شرمیلے نین (خواجہ پرویز)

❋ خداوندا! یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں؟ (حمایت علی شاعر)

❋ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے (حبیب جالب)

❋ مجھ کو آواز دے' تو کہاں ہے؟ (تنویر نقوی)

❋ اک بار چلے آؤ (تسلیم فاضلی)

❋ تم ضد تو کر رہے ہو' پر کیا تمہیں سنائیں؟ (اختر یوسف)

❋ غنچہ شوق لگا ہے کھلنے (محسن نقوی)

❋ شعلہ سا جل بجھا ہوں (احمد فراز)

❋ کوبہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی (پروین شاکر)

یہ اور ایسے بے شمار' بے حساب گیت' غزلیں خان صاحب مہدی حسن صاحب کی آواز اور گائیکی کا وہ خوب صورت شہکار ہیں جنہوں نے لتا جی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ مہدی حسن صاحب کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔

یہ گئے زمانے کی بات ہے' میں مہدی حسن صاحب کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ اپنے بچپن اور جوانی کا قصہ کچھ یوں سنا رہے تھے۔

میں کلاونت خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ صرف گویوں کا خاندان ہے' یہ کوئی اور کام نہیں کرتے تھے۔ ہم لوگ راجہ' مہاراجوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی سرپرستی میں میری پرورش بھی راجواڑوں میں ہوئی ہے۔ یوپی میں جتنی ریاستیں تھیں' ہم وہاں جاتے تھے اور اس کے علاوہ مہاراجہ اندور' مہاراجہ نیپال' مہاراجہ بڑودہ وغیرہ کے درمیان میرا بچپن گزرا۔ پانچ چھے سال کی عمر سے گانا شروع کیا۔ میری پیدائش 1934ء میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد ہم منگنری اور چیچہ وطنی آئے' یہاں میری پھوپھی وغیرہ رہتی تھیں۔ دراصل میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک والدہ سے تو ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے جبکہ دوسری والدہ سے دو بھائی اور دو بہنیں اور ہیں۔ میری والدہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ انہوں نے میرا نام ''ماول پترا'' رکھا تھا یعنی ماں کا بیٹا۔ والد کا نام خان صاحب عظیم تھا جبکہ میرے چچا اسماعیل خان بھی بہت بڑے گویے تھے۔ ہم سب ساتھ رہتے تھے۔ چچا (مرحوم) نے ہی دراصل میری موسیقی کی تعلیم میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ والد صاحب کی سرپرستی تھی لیکن چچا نے مجھ پر محنت زیادہ کی جبکہ مجھے بھی گانے کا بہت شوق تھا۔ ہماری رہائش گاہ پرانے چیچہ وطنی میں تھی۔ میں ہر وقت موسیقی کی ہی دھن میں لگا رہتا تھا۔ والد صاحب جب مجھے بازار سے سودا لینے بھیجتے تو ہر وقت چلتے پھرتے میں کچھ نہ کچھ گاتا رہتا تھا' کوئی نہ کوئی بول ترتیب دیتا رہتا تھا۔ بازار سے گزرتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ عظیم خان صاحب کا چھوٹا لڑکا شاید پاگل ہے۔ ایک دن لوگوں نے والد صاحب سے کہہ بھی دیا تو وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ وہ پاگل نہیں بلکہ اپنی لائن میں مست ہے۔ میں شروع سے اپنے کام میں اتنا مگن رہتا تھا' کسی اور طرف دھیان ہی نہیں رہتا تھا۔

مہدی حسن صاحب کے بچوں اور کچھ دوسرے عزیزوں سے میری خاصی گہری رفاقت رہی ہے خصوصاً خان صاحب کے بیٹوں طارق اور آصف مہدی' داماد حنیف جو میرے ایک بہت ہی اچھے دوست' اعلیٰ درجے کے گائیک واحد حسین (مشہور سارنگی نواز مرحوم استاد زاہد حسین کے صاحب زادے جو ان دنوں ABL میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں) کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ایک اور عزیز گلوکار بلال عبداللہ جو نامور موسیقار نہال عبداللہ کے صاحب زادے ہیں' یہی وجہ ہے کہ خان صاحب کو live گاتے خصوصاً غزل کی محفلوں میں رنگ جماتے بہت دیکھا اور سنا۔ ویسے تو ہر قسم کی گائیکی میں خان صاحب کا جواب نہیں لیکن غزل کی گائیکی میں تو ان کا جواب ہی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے غزل گائیکی میں نیا اسلوب متعارف کروایا اور غزل کو زندہ رکھنے میں جن گلوکاروں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے' ان میں آپ سرِفہرست ہیں۔

موسیقی کے حوالے سے خان صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ کو 1965ء کی جنگ کے دوران میں قومی نغمات ریکارڈ کرانے اور اعلیٰ کارکردگی پر ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' بھی دیا جا چکا ہے جبکہ 1966ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے بیرونِ ملک میں پاکستان کا نام روشن کرنے پر اعلیٰ سرکاری اعزاز ''تمغۂ امتیاز'' بھی دیا گیا۔ 2001ء میں آپ کی عمر بھر کی مجموعی کارکردگی پر ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' دیا گیا۔ 23 مارچ 2003ء کو اعلیٰ سرکاری اعزاز ''ہلالِ امتیاز'' سے بھی نوازا گیا۔ آپ کو نیپال کا قومی اعزاز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پانے کا شرف بھی حاصل ہے۔شہنشاہِ نیپال نے جب آپ کو یہ ایوارڈ دیا تھا' اس وقت 21 توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ آپ کو بھارت میں ''سہگل ایوارڈ'' بھی مل چکا ہے اور ملک کے کئی شہروں میں تاج پوشی بھی کی جا چکی ہے۔ آپ کے شاگردوں میں پرویز مہدی (مرحوم)' غلام عباس' سلامت علی' نعیم مہدی' فرخ مہدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

☆.....☆

زندگی کے ساز پہ مہدی حسن صاحب کامیابی کے گیت گاتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک دکھ اور افسردگی نے آپ کی دونوں بیگمات کی یکے بعد دیگرے وفات کی صورت آپ کے گھر اور دل کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ خان صاحب کو اپنی دونوں بیگمات سے بہت زیادہ محبت رہی' سو ان کے بچھڑنے کا غم آپ کو پہلے اندر ہی اندر اور پھر 28 نومبر 2000ء کو فالج کی صورت مار گیا۔ پہلے پاکستان اور پھر بھارت میں بھی آپ کے علاج کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اسی دوران ''مہدی حسن فاؤنڈیشن'' کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس فاؤنڈیشن کے صدر عارف حسن' وائس چیئرمین طارق حسن' سینئر نائب صدر آصف مہدی جبکہ چیئرمین مہدی حسن صاحب خود ہیں۔ اس ادارے کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اندازہ بھارت میں اس کے عہدے داروں اور ممبران کے ناموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ بھارت میں اس فاؤنڈیشن کے جنرل سیکریٹری انٹرنیشنل پروموٹر' من میت سنگھ رتن ہیں جبکہ دیگر ممبران اور عہدے داران میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی' دلیپ کمار' سائرہ بانو' لتا منگیشکر' امیتابھ بچن اور موسیقار اعظم نوشاد مرحوم رہے۔ گئے برسوں بھارت میں علاج کے بعد جب خان صاحب کی واپسی ہوئی تھی تو اُن سے یہ مکالمہ ہوا تھا۔

''وہاں میرا علاج بہت بہتر طریقے سے ہوا ہے۔ آیورویدک طریقۂ علاج سے مجھے بہت آرام آیا ہے اور اب میں کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ انڈیا میں پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مجھے آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ گلزار' دلیپ کمار' لتا منگیشکر' موسیقار نوشاد' امیتابھ بچن' جگجیت سنگھ غرض کون نہیں تھا جس نے خیریت نہ پوچھی ہو۔ سب ہی لوگ فکرمند تھے۔ سابق وزیراعظم واجپائی بھی بہت اچھے انداز سے ملے تھے۔ دلیپ کمار صاحب نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ میں وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ جب دلیپ کمار صاحب نے یہ بات محسوس کی تو انہوں نے میرے بیٹے عارف کے ہاتھ سے وہیل چیئر لے لی اور خود مجھے بیڈروم میں لے گئے اور بیڈ پر لٹا دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ وہاں پرانے دوستوں سے مل کر طبیعت ویسے ہی بہتر ہو گئی تھی پھر وہاں جس توجہ سے میرا علاج کیا گیا' شاید یہ اس کی وجہ ہے کہ اپنی طبیعت میں بہت بہتری محسوس کر رہا ہوں۔

پاکستان اور بھارت میں موسیقی کے موجودہ معیار کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں آپ نے کہا تھا۔

''یہ بات بہت خوش آیند ہے کہ بھارت میں موسیقی آج بھی جوان ہے' وہاں سیکھنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ انڈسٹری میں آج بھی بہت سریلے نوجوان ہیں جن کو سن کر دل خوش ہوتا ہے لیکن ہمارے یہاں اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ نئے نوجوان سیکھنے پر توجہ نہیں دیتے' صرف مقبولیت کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہمارے دور میں سالوں تربیت حاصل کی جاتی تھی۔ ہم لوگ روزانہ گھنٹوں ریاض کرتے تھے لیکن آج کا سنگر راتوں رات سپرہٹ ہونا چاہتا ہے۔ اس میں ہمارے ٹی وی چینلز کا بھی بڑا دخل ہے جو راتوں

رات ہر اچھے برے گانے والے کو اسٹار بنا دیتے ہیں۔ پاکستان میں اب موسیقی کا وہ معیار نہیں رہا جو ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ آج بھی یہ ہے کہ جو آرٹسٹ ہوتا ہے' وہ الگ نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں تو زیادہ تر نئے سنگرز خود ہی دھنیں تیار کر رہے ہیں' خود ہی شاعری بھی کر رہے ہیں اور گا بھی رہے ہیں' اس سے تو معیار خراب ہوتا ہے۔ ایک اچھا گانا اچھی ٹیم سے بنتا ہے اور اس ٹیم میں شاعر' موسیقار' اس کے سازندے اور گلوکار سب شامل ہوتے ہیں۔ جب سارے کام ایک ہی آدمی کرے گا تو ظاہر ہے' کوئی نہ کوئی شعبہ کمزور رہ ہی جائے گا اور ایک اچھا گانا نہیں بن سکے گا۔ موسمی گانے تو بہت سننے کو ملتے ہیں لیکن اچھا گانا وہی ہے جو لوگوں کو سالوں یاد رہے۔ انڈیا اور پاکستان کے ماضی کے ہزاروں گانے ایسے ہیں جو آج بھی سننے والوں میں مقبول ہیں' لوگوں کو ان کی طرزیں یاد ہیں' ان کی شاعری یاد ہے۔ آج کا کوئی گانا بتا دیں آپ جو لوگوں کو یاد رہ جاتا ہو؟ اچھی موسیقی انسان اسی وقت سیکھ سکتا ہے جب اس کو اس کا جنون کی حد تک شوق ہو اور پھر تعلیم حاصل کی جائے تو اس فن کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات تربیت کی ہے' نئے آنے والوں کو موسیقی کی تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔''

آپ کے صاحب زادے آصف مہدی بھی موسیقی سے وابستہ ہیں لیکن انہیں وہ مقام نہیں ملا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں خان صاحب مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

''اگر آج کے دور میں وہ میرا والا مقام لیں گے تو مشکل میں آ جائیں گے کیونکہ آج اچھی موسیقی سننے اور سمجھنے والوں کی کمی ہے۔''

مرحومہ میڈم نور جہاں کے بعد موسیقی کے شعبے میں آپ کس پاکستانی گلوکارہ کو بہتر مانتے ہیں؟

''اپنی مہناز اور فریدہ خانم جو اچھا گا رہی ہیں' غزلیات میں بھی یہ بہت بہتر ہیں جبکہ لڑکوں میں غلام عباس اچھا ہے' سریلا گاتا ہے۔''

اُس اداس شام آغا خان اسپتال کے بیڈ پر لیٹے وہ کچھ بھی نہیں کہہ پائے تھے لیکن ان کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں' شاید وہ گزری ہوئی خوشیوں اور کامیابیوں کا نوحہ تھا جبھی تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں..... اُس اداس شام میں بھیگی آنکھوں اور بھیگے دل کے ساتھ اسپتال سے واپسی کے وقت بس یہی سوچ رہا تھا کہ..... 'خان صاحب کے لیے کیا دُعا کروں؟؟؟ کہ..... عمر اور ''زندگی'' میں تو بہت فرق ہوتا ہے ناں؟؟؟'

اور اَب یہ عالم ہے کہ اس اداس دن جب خان صاحب مہدی حسن کی زندگی نے موت سے رشتہ جوڑ لیا ہے تو میرے اپنے لفظ خاموش اور سوگوار ہیں..... اور کسی اور کا ایک خیال ہے جو دل اور ذہن میں کروٹیں لے رہا ہے.....

نگارِ وقت اب اُسے لہو سے کیا چمن کریں؟
یہ دستِ جاں کہ ہانپتا رہا سراب اوڑھ کر
لبوں کے حرفِ نرم کی تپش سے مت جگا اسے
یہ دل تو کب کا سو چکا 'ردائے خواب' اوڑھ کر

یہ گئی کل کی بات ہے مہدی حسن خاں صاحب کہہ رہے تھے کہ..... ''میری جو زندگی گزر گئی' میں اُسے دوبارہ گزارنا چاہتا ہوں' پرانا دور پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ وقت جو ایک اچھے گلوکار کی حیثیت سے میں نے اور فلم انڈسٹری میں گزارا۔ اب وہی میرا کُل سرمایۂ حیات ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

2 خصوصی کہانیاں اپنے موضوع اور خیال کے اعتبار سے منفرد اور مختلف سچی کہانیاں

روشانے سبعین

میرا آشیاں کہاں ہے؟

حمیرا راحت کا خیال

کسی کی ملکیت ہو اور نہ ورثہ
میں وہ جاگیر ہونا چاہتی ہوں

روایتوں کی زنجیروں میں جکڑی ایک عورت کی خصوصی اشک اشک کہانی

اپنے اندر کی گھٹن کو دور کرنے کے لیے آج میں آپ سے بہت سی باتیں شیئر کرنا چاہتی ہوں لیکن ٹھہریئے، پہلے میں اپنا تعارف کروادوں تاکہ آپ کو میری باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو لیکن میرا اتنا تعارف کافی نہ ہوگا کہ میں ایک عورت ہوں۔ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں جہاں عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کے متعلق بہت سی باتیں کی جاتی ہیں، وہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ کہ ہر فیلڈ میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود میں صدیوں پرانی عورت کی طرح آج بھی بے بس اور مجبور ہوں۔

کھوکھلی وضع داری نبھاتے نبھاتے میں تھک چکی ہوں۔ نامعلوم منزل کی طرف اٹھنے والے قدموں اور طویل مسافت نے مجھے رنجور کر ڈالا ہے۔ میں انجان منزلوں کی طرف محوِ سفر ہوں۔ گزرے وقت کی دھول نے میرے خدوخال دھندلا دیئے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے خود کو پہچاننے میں بھی خاصی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ اکثر میرے اندر بہت سے سوال کلبلاتے ہیں۔

میں کون ہوں؟

میری پہچان کیا ہے؟

میری ذات، میرے وجود کا مقصد کیا ہے؟

میری تخلیق کیوں کی گئی؟

میرے جینے کا جواز کیا ہے؟

مختلف لوگوں سے ان سوالوں کے جواب مختلف انداز میں ملے لیکن کوئی بھی جواب ایسا نہیں ہے جو میری تشنگی کو مٹا سکے۔

ساری زندگی میں رشتوں کی چکی پھیریوں میں گھری رہتی ہوں۔ کبھی ایک ماں کا فرض نبھا رہی ہوں تو کہیں ایک بیوی کی ذمہ داری، کبھی بیٹی ہونے کا خراج دے رہی ہوں تو کبھی بہن ہونے کا۔ اس دنیا میں میرے بہت سے رشتے ہیں جن میں، میں الجھی رہتی ہوں لیکن ان سب سے پہلے میں ایک عورت ہوں، گوشت پوست کی بنی ایک انسان جس سے غلطیاں بھی سرزد ہوسکتی ہیں اور میں کوتاہیوں کی مرتکب بھی ہوسکتی ہوں لیکن کوئی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے۔ جب حالات کی کڑی دھوپ کی تمازت میرے وجود کو جھلسائے دیتی ہے، جھوٹی روایات کی زنجیریں مجھے جکڑے رکھتی ہیں، تب مجھے احساس ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے شہر میں کس قدر اکیلی ہوں، میری ہستی کتنی بے نام ونشاں ہے۔

مرد کہتا ہے، میں کم عقل ہوں۔ زمین پہ سارے جھگڑے فساد وجودِ زن ہی کی بدولت ہیں۔ ازل سے گھما پھرا کر وہ اسی بات پر آجاتا ہے کہ صدیوں پہلے اپنی بے وقوفی اور کم فہمی کے باعث میں نے اُسے باغِ عدن سے نکلوایا جبکہ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر اسے لگتا ہے کہ میں نے اسے ورغلایا اور اس کے نتیجے میں اسے جنت سے نکلنا پڑا تو وہ تو خدا کا نائب ہے، عقل مند ہے تو پھر اس نے خدا کی ودیعت کردہ عقل کو استعمال کیوں نہیں کیا؟ یہ مجھ سے سرزد ہوئی ایسی غلطی ہے جو مرد کے نزدیک ناقابلِ معافی ہے اور جس کی تلافی آج تک ممکن نہیں ہوسکی۔

اس دنیا میں آتے ہی میری پیدائش کے ساتھ ہی میرا وقتِ آزمائش شروع ہوجاتا ہے۔ پہلے پہل تو پیدا ہوتے ہی مجھے زندہ درگور کردیا جاتا تھا پھر آہستہ آہستہ میری تقدیر بدلی، حالات بدلے تو یہ سلسلہ موقوف ہوگیا لیکن جیسے جیسے وقت گزرنے لگا، مجھے سزا دینے کے نت نئے طریقے دریافت ہونے لگے۔ کبھی ذہنی اذیت تو کبھی جسمانی اذیت، مقصد صرف اس بظاہر مہذب معاشرے میں میری حیثیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا تعین تھا۔ بچپن سے ہی مجھے سکھا دیا جاتا کہ خاموش رہنا ہے۔ باپ' بھائیوں اور خاوند کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں ہے چاہے کتنی بھی ناانصافی کی جائے پھر بھی مجھے لبوں پہ قفل سجائے رکھنے کا حکم ہے ورنہ اپنے حقوق کے لیے اٹھنے والی میری آواز کو کچل دیا جائے گا' دبا دیا جائے گا' سچ بولنے کی کڑی سے کڑی سزا دی جائے گی' زمانہ مجھے قدموں تلے روند ڈالے گا اس لیے مجھے بالکل بھی بولنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ میں بیٹی ہوں' بہن ہوں اور اچھی بیٹی کو سر جھکائے ہی رہنا چاہیے' وہ خاموش ہی بھلی لگتی ہیں۔ حکمِ حاکم' مرگِ مفاجات کے مصداق' میں آج تک مہر بہ لب ہوں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجھے قصوروار گردانتے ہوئے سزا کا مستحق ٹھہرا دیا جاتا ہے پھر سزا کی بھٹی میں تاحیات جلتے رہنا میرا مقدر بن جاتا ہے۔

میں عدن شیرازی بھی ایسی ہی سزا کی مستحق ٹھہرائی گئی۔ ایک عدالت سجائی گئی جس کے کٹہرے میں کھڑی مجرم میں تھی۔ وکیل بھی مرد تھا اور جج بھی۔ مجھ پہ محبت کرنے کا فردِ جرم عائد کیا گیا۔ یہ ایک ایسا مقدمہ تھا جس میں ملزم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی۔ بنا مقدمہ لڑے ہی فیصلہ سنا دیا گیا اور مجھے سزا دی گئی جلاوطنی کی۔ اپنی ماں کے دیس' گھر آنگن' بہن بھائی' گڑیاں' کھلونے ان سب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جانے کا سن کر میرے حواس گم ہو گئے۔

''بابا جان' مجھ پہ رحم کریں' میں یہ سب نہیں سہ پاؤں گی۔ مجھے معاف کر دیں۔'' میں اُن کے قدموں میں سر رکھ کر گڑگڑائی۔

انہوں نے نخوت سے مجھے پرے دھکیل دیا۔

''عائشہ بیگم! اس سے کہو' اپنی منحوس صورت لے کر ہماری نظروں کے سامنے سے دور ہو جائے۔ اگر کبھی تم نے اس سے چوری چھپے ملنے کی کوشش کی اس نے کبھی ہماری دہلیز پہ قدم رکھنے کی جرأت کی تو ہم اسے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیں گے۔'' بابا جان بلند آواز میں دھاڑے۔

اشتعال اور غصے سے اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''خدارا' شیرازی صاحب.....! اسے معاف کر دیں' بچی ہے' غلطی ہو گئی۔'' مجبور ماں نے منمناتے ہوئے بے بس نظروں سے بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے شوہر سے التجا کی۔

''بس عائشہ بیگم.....! بہت ہو گیا' بیٹیاں تو باپ کے شملے کو اونچا رکھتی ہیں لیکن اس بدبخت نے تو ہماری عزت و وقار کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا' اس کے پیدا ہوتے ہی ہم نے اس کا گلا دبا دیا ہوتا۔ اب اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا یا ہمارے حکم سے انحراف کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو ہمارا مرا ہوا منہ دیکھو گی۔'' بابا جان کی کڑک دار آواز فضا میں گونجی تو میرے ساتھ ساتھ ماں بھی سناٹوں میں گھر گئی۔ یکدم میرے سینے میں شدتوں کا درد اٹھا۔ میں دل پہ ہاتھ رکھ کر لڑکھڑا گئی۔

''ماں.....!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

سر اٹھا کر میں نے اُس عورت کی طرف دیکھا جو میری ماں تھی۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی شوہر اور بیٹی کے رشتے میں پس رہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ شدتِ غم سے زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پہ دہشت اور خوف سے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں اسے مزید آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ میں نے حسرت سے اس پہ ایک الوداعی نظر ڈالی' اس کی آنکھوں میں درد ہی درد تیر رہا تھا جبکہ بابا جان کے چہرے پہ چٹانوں کی سی سختی تھی۔ میں جان گئی' یہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ پہ بند ہو چکے تھے۔ اب شیرازی ہاؤس کے مکین میرے لیے خواب و خیال تھے' ایسا سراب تھے جس کے پیچھے مجھے تمام عمر بھاگنا تھا اور بدلے میں میرے ہاتھ کیا آتا' نارسائی' دکھ اور آبلہ پائی' میرا جرم کیا تھا' محض عورت ہونا۔ کیا عورت ہونا اتنا بڑا جرم ہے کہ ہر غلطی پہ مجھ اکیلی کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جائے؟ آج تک سوچ رہی ہوں' کیا محبت کرنا' کسی کو چاہنا اتنی بڑی خطا تھی جس کی پاداش میں مجھے ایسی کڑی سزا سنائی گئی؟

یہ تو سزائے موت سے بھی بڑی سزا تھی۔ زندہ رہتے ہوئے پل پل مرنا' شاید یہی میرا مقدر تھا.....

زرد چہرہ' ویران آنکھیں لیے میں نے وہ دہلیز لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پار کی۔ وہ رشتے جو دل کے بہت قریب تھے' اب میری دسترس سے بہت دور ہو چکے تھے جن تک رسائی حاصل کرنا میرے لیے یکا یک ناممکن ہو گیا تھا۔

•.....•.....•

ہمارے گھرانے کا شمار شہر کے رئیس گھرانوں میں ہوتا تھا' روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ گھر میں صرف بابا جان کا حکم چلتا تھا۔ ان کے رعب اور دبدبے کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ یہاں تک کہ بڑے بھیا اور ماں بھی ان کے غصے سے خائف رہتے۔ گھریلو اور کاروباری معاملات میں اہم ترین فیصلے کرنے کا حق صرف بابا جان کے پاس تھا۔ بابا جان لڑکیوں کی ضرورت سے زیادہ تعلیم اور آزادی کے قائل نہ تھے۔ لڑکیوں کا اکیلے باہر جانا' دوست بنانا' فون پہ طویل گفتگو کرنا' زمانے کے مطابق فیشن کرنا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میری تربیت بڑے سخت اور کڑے ماحول میں کی گئی۔

جب شعور کی دنیا میں دم رکھا' تبھی ماں نے سمجھا دیا کہ باپ اور بھائیوں کے سامنے ہمیشہ سر پہ دوپٹہ اوڑھے نیچے نگاہ رکھ کے بات کرنا۔

لڑکیوں کا بڑھ چڑھ کر بولنا' بلند آواز میں قہقہے لگانا' فرمائشیں کرنا یا خوامخواہ کا بحث مباحثہ بابا جان کو بالکل پسند نہ تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ میں ایک بے جان گڑیا ہوں جسے اپنی مرضی سے سانس تک لینے کی اجازت نہ تھی۔ ہر بات میں بلاوجہ کی روک ٹوک' پابندیاں' سختیاں چاروں طرف سے مجھے گھیرے رکھتیں۔ مجھے لگتا جیسے میں اَن دیکھی زنجیروں میں قید ہوں۔ بابا جان کا بس چلتا تو شاید وہ ہمارے آنگن سے گزرنے والی ہواؤں پہ بھی پابندی لگا دیتے۔

قفس سے آزادی کی خواہش دل ہی دل میں شدت سے مچلنے لگتی۔ کبھی جی چاہتا' کاش' کچھ ایسا ہو جائے کہ میں آزاد فضاؤں میں پرواز کر سکوں۔ اس نیلگوں آکاش کی وسعتوں میں کھو جاؤں' پر یہ سب میرے اختیار میں کہاں' میری تو سانسوں پہ بھی پہرہ تھا۔ بیٹی ہونا میرا سب سے بڑا جرم بن گیا تھا۔ اگرچہ بابا جان لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے خلاف تھے اور انٹر کے بعد انہوں نے مجھے بھی گھر میں بٹھا دیا لیکن میری تعلیم سے لگن اور حصولِ علم کی خواہش ماں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی پھر جانے انہوں نے کیا جتن کیے کہ بابا جان نے مجھے مزید پڑھنے کی اجازت دے دی۔

میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ مجھے کالج سے لانے اور چھوڑنے کی ذمہ داری بڑے بھیا کی تھی جو بالکل بابا جان کا پرتو تھے۔ بابا جان کی طرح ان کے سامنے بھی میں نے کبھی نظریں اٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ انہیں بھی بابا جان کی طرح میری ہر ایک بات پہ اعتراض تھا۔ اب اگر میں حسن کی دولت سے مالا مال تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ کالج لاتے لے جاتے وقت ان کی سخت نظریں ہمیشہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے سراپے کا طواف کرتی رہتیں۔

''عدن' دوپٹہ ٹھیک سے لپیٹ کر لو۔'' وہ کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے تنبیہ کرتے۔

''جی بھیا.....!'' میں سر سے پیر تک چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سہم جاتی۔

ان کی کسی بات سے اختلاف کرنے یا کسی بھی قسم کی وضاحت دینے کی مجھ میں ہمت نہ تھی چونکہ بابا جان کو سہیلیاں بنانا یا ان کے گھروں میں آنا جانا پسند نہیں تھا اس لیے میں نے شروع سے ہی احتیاط برتی اور خود کو اپنی پڑھائی تک ہی محدود رکھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ایک آدھ سہیلی بن گئی جس کے ساتھ دوستی صرف کالج کی حد تک ہی محدود رہی یا کبھی کبھار ٹیلی فون پہ بات ہو جاتی اور اگر گفتگو طویل ہو جاتی' تب بھی ایک مصیبت بن جاتی۔

ناسازیٔ طبع کے باعث اگر کبھی کالج سے چھٹی ہو جاتی تو سب کی پوچھ گچھ شروع ہو جاتی۔ اگر کسی محفل میں جاتی تو وہاں سب سے نمایاں نظر آتی۔

ماں میرے دن بہ دن گلابوں سے نکھرتے حسن سے خوفزدہ تھی۔ میں اس کے ڈر کی وجہ جانتی تھی کہ وہ بھی میری طرح ایک بے بس عورت ہے' وہ بھی جانتی ہے کہ خوبصورت نظر آنا میرا قصور ٹھہرایا جا سکتا ہے اور پھر اچانک وہ ہو گیا جو میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ نوید الحسن میری زندگی میں بہار بن کر آ گیا۔ دل کی اس واردات پہ میں سہم گئی۔

گو کہ کسی واقعہ کی بھنک تک نہ پڑی کہ وہ شخص میری گھٹن زدہ زندگی میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند داخل ہو گیا ہے پھر بھی میں بولائی بولائی پھرتی۔ نوید الحسن' میری ماں کی چچازاد بہن کا بیٹا تھا۔ وہ لوگ ایک عرصے سے لندن میں مقیم تھے۔ حال ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے تو ایک خاندانی تقریب میں ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔ پہلی ہی نظر میں وہ میرے دل میں کھب گیا۔ سارے فنکشن میں وہ بھی بہانے بہانے سے میرے اردگرد منڈلاتا رہا لیکن میں جانتی تھی کہ بابا جان میرے ننھیال والوں کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے اس لیے میں نے اس کی والہانہ محبت کی ذرا بھی حوصلہ افزائی نہ کی اور اس کی محبت کو دل کے نہاں خانے میں مقید کر لیا۔

'دل پہ ایک اور گھاؤ سہی' پہلے بھی تو اس دل میں کئی درد پنہاں ہیں۔ میں اس سے محبت تو کرتی ہوں ناں تو کیا ہوا' اگر بابا جان کے ڈر کی وجہ سے میں اس کی پذیرائی نہیں کر سکتی۔ میں نے آزردگی سے گھر کر سوچا۔

اب وہ بہانے بہانے سے ذکیہ خالہ (نوید الحسن کی والدہ) کے ساتھ اور کبھی تنہا ہمارے گھر کے چکر لگانے لگا۔ ان لوگوں کی بار بار آمد پہ بابا جان کی پیشانی پہ بل ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ انہیں اپنے یہاں نوید الحسن کے خاندان کی آمدورفت خاصی ناگوار گزر رہی تھی اس لیے جب جب وہ میری طرف قدم بڑھاتا تو میں کترا کے دامن بچا جاتی۔ اس کی نظروں کی وارفتگی سے گھبرا کر نظریں چرا لیتی پھر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو موقع دیکھ کر بالآخر اس نے مجھے گھیر لیا۔

''عدن شیرازی! تم کیا سمجھتی ہو' میں پاگل ہوں' سر پھرا ہوں جو تمہارے عشق میں اس گھر کے چکر لگانے کے علاوہ مجھے اور کوئی کام نہیں؟ ہاں' کیا سمجھتی ہو تم خود کو' میں کوئی گرا پڑا شخص ہوں؟'' میری کلائی پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔ اس کے تیور مجھے خوفزدہ کر گئے۔ میری آنکھوں کی سطح نمکین پانیوں سے لبریز ہو گئی۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ..... کوئی آ جائے گا۔''

لاؤنج میں ہم دونوں تنہا تھے' کوئی بھی آ سکتا تھا۔ خوف سے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میری آنکھوں میں نمی دیکھ کر اس نے فی الفور اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

''بس' یہیں آ کر تو میں ہار جاتا ہوں' کیا کمی ہے مجھ میں عدن شیرازی' جو تم میری محبت کو اس طرح رد کر رہی ہو؟ جب جب میں تمہاری طرف قدم بڑھاتا ہوں' تم رخ پھیر لیتی ہو؟ کتنی بار تم سے میں نے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کیا ہے لیکن تمہاری طرف سے ہنوز خاموشی؟ یہ جان لیوا خاموشی مجھے مار ڈالے گی عدن' تمہاری سرد مہری کو کیا نام دوں؟ کیا میرے جذبے اتنے ارزاں ہیں؟'' وہ سراپا احتجاج تھا۔

''نہیں نوید الحسن' کمی آپ میں نہیں' مجھ میں ہے۔ خوشیاں میرا مقدر کہاں' میری تقدیر میں محبت لکھی ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اونچی آواز میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے کجا کہ محبت کرنا۔ مجھے کسی کو چاہنے کا' کسی کی چاہت پانے کا کوئی حق نہیں ہے' سمجھے آپ؟'' میں نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے کی حسرت اور تشنگی نے اسے تڑپا دیا۔

''تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے' حقیقت سے نظریں چرا کر حقائق سے منہ موڑا جا سکتا ہے؟ کیوں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہو تم؟ کیوں نہیں کہہ دیتی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ مجھے دیکھ کر تمہاری آنکھوں میں قوس و قزح کے جو رنگ اترتے ہیں' انہیں تم مجھ سے کیسے چھپا سکتی ہو؟ محض میری آواز سن کر ہی تمہارے عارض و رخسار پہ ایک گلال سا بکھر جاتا ہے۔ میری آمد پہ میرے سامنے نہ آنا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیر تلک چھپ چھپ کے مجھے تکتے رہنا' یہ سب کیا ہے عدن؟ محبت نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں' بولو' چاہے تم اپنی محبت کا اظہار کر دیا نہ کرو' تم اپنی محبت کو مجھ سے نہیں چھپا سکتی۔ ارے' محبت تو ایک خودرو پودے کی مانند ہے جو آپ ہی آپ من میں جگہ بنانے لگتی ہے۔ مان کیوں نہیں لیتی کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے' محبت ہے؟'' وہ بضد تھا۔

میں اس کی باتیں سن کے دنگ رہ گئی کہ دل کے سارے راز اس پہ افشا ہوئے تو کیسے؟

''نوید الحسن' ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ غلط سمجھے ہیں۔'' میں نے اپنے دفاع کی کمزور سی کوشش کی۔

''ایسی ہی بات ہے عدن شیرازی' اور تم کس بات سے ڈر رہی ہو؟ کیوں ڈرتی ہو اتنا؟ توڑ ڈالو ان جھوٹی روایات کی زنجیروں کو' محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے' کیوں اعتبار اور بے اعتباری کے بیچ جھول رہی ہو' میں زندگی کے ہر ہر قدم پہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ نوید الحسن ایسا کمزور مرد نہیں ہے جو حالات کے سامنے جھک جائے یا اپنی محبت سے دستبردار ہو جائے۔ مجھے حالات کو اپنے حق میں سازگار کرنا اچھی طرح سے آتا ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟ میں تمہارے ساتھ ہوں ناں' میرا اعتبار کرو' میں زندگی کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔'' وہ میرے یخ ہوتے ہاتھوں کو تھام کر اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔

نوید الحسن میری زندگی میں وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنی محبت کا مان دے کر میری ہستی کو معتبر کر دیا تھا' میری ذات کو اعتبار بخشا تھا۔ میں پگھلنے لگی' تصویرِ زیست چاہت کے رنگوں سے سجنے لگی۔

ایک پل کو دل چاہا' آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات پہ اعتبار کرتی چلی جاؤں۔ زندگی کے ہر ایک لمحے سے خوشیاں کشید کر لوں' تا حیات اس کے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہوں' میرے دل کی پیاسی دھرتی پہ نوید الحسن کی چاہت ابر بن کر برسی تو تشنگیاں مٹنے لگیں۔ میں چاہت کی متلاشی تھی اور وہ محبت کا دیوتا.....

میں چاہتوں کی ترسی ہوئی تھی اس لیے اس کی ہر بات کا اعتبار کرتی چلی گئی۔ نادان تھی' کم فہم تھی اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے یہ نہ جان سکی کہ اتنی بے لوث محبت کا اظہار کرنے والا نئے نئے اجلے خواب دکھانے والا بھی ایک مرد ہی ہے جو سدا سے حاکم ہے اور میں محکوم' کبھی جبر اور کبھی محبت' ہر طریقے سے اس کا صرف ایک ہی کام ہے عورت کو زیر کرنا' اس کو جھکانا' اس کی مردانہ انا کی تسکین صرف اسی طرح سے ممکن ہے اور میں حوا کی بیٹی سدا کی کمزور' بے بس' ناتواں وجود کی مالک اس کے رنگین جال میں پھنستی چلی گئی۔ وہ سبز باغ دکھاتا رہا اور میں سراب کے پیچھے بھاگتی رہی۔ بھول گئی کہ دائمی خوشیوں پہ میرا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ میں ایک عورت ہوں اور وہ مرد جس کی فطرت میں حاکمیت ہے' حکم چلانا اور عورت کو اس کی تعمیل میں سر جھکائے دیکھنا وہ اپنا حق سمجھتا ہے پھر میں اس کی باتوں میں کیسے آ گئی؟ کیسے اعتبار کر لیا اس پہ؟ لیکن اس وقت مجھ پہ صرف اس کی محبت کا خمار تھا اور میں کم عقل سر جھکائے اس کی چاہت کا یقین کرتی چلی گئی۔

''نوید الحسن' بابا جان کبھی نہیں مانیں گے اور مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میں ان کے سامنے اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکوں۔'' میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''عدن' محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے' میں سارے معاملات سنبھال لوں گا' سب سے بات کر لوں گا' تم بالکل فکر نہ کرو لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے مستقبل کے متعلق ایک دوسرے سے تفصیلی بات چیت کر لیں اور گھر پہ یہ گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے' تم کسی طرح سے مجھے باہر ملو۔ ہم کسی ریستوران میں سکون سے بیٹھ کر تمام مسائل کا حل نکالیں گے۔'' وہ رسان سے بولا۔

''نہیں..... نہیں.....'' میں گھبرا گئی۔

''یہ میرے لیے ممکن نہیں ہوگا' اکیلے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے مجھے۔''

''نہیں عدن' کچھ کرو' کوئی بہانہ بنا کر' صرف آدھے گھنٹے کے لیے ہی سہی لیکن ضرور آنا۔'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

''کل شام ٹھیک چار بجے Rose Restaurant میں۔'' آس بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''او کے' میں پوری کوشش کروں گی۔'' بالآخر میں نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ اس نے سرشاری سے میرا ہاتھ دبایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

•.....•.....•

ریستوران کے الگ تھلگ کونے میں بیٹھے ہوئے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نوید الحسن سامنے بیٹھا تھا' یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا' جب میں گھر سے یوں تنہا باہر نکلی تھی اور کسی مرد کے ساتھ اس طرح سے آمنے سامنے بیٹھی تھی۔

کئی لمحے خامشی کی نذر ہو گئے۔ نوید الحسن کافی دیر تک گہری نظروں سے میری پل پل بدلتی ہوئی کیفیت نوٹ کرتا رہا پھر اس نے گلا کھنکار کر اس جان لیوا خاموشی کو توڑا۔

''کیوں اتنا ڈر رہی ہو عدن' دیکھو ذرا اپنی حالت' کپکپاتے لرزتے لب' اڑی اڑی رنگت' ٹھنڈے ہاتھ' یہ سب کیا ہے؟ تم بھی ناں' اب کیا کہوں میں تمہیں؟'' وہ چڑ کر بولا۔ میری سراسیمگی اور بدحواسی اسے زچ کر رہی تھی۔

''نہیں..... وہ..... دراصل..... آپ نہیں جانتے..... میں پہلی مرتبہ اس طرح اکیلی.....'' اضطراب سے میں نے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''پگلی نہ ہو تو..... خوامخواہ ہی گھبرا جاتی ہے۔ اب تو اکیلی نہیں ہو ناں؟ میں ساتھ ہوں تمہارے۔'' میرے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ غالباً میرے ہاتھوں کا ارتعاش اس سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔

''نوید الحسن' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو..... گھر سے بہانہ بنا کر جس مشکل سے میں یہاں آئی ہوں' یہ آپ نہیں جانتے۔'' میں نے بے بسی سے روہانسی ہو کر کہا۔

''یار' کوئی نہیں دیکھتا' یہاں کس نے آنا ہے۔ ویسے بھی ہم بالکل الگ تھلگ جگہ پہ بیٹھے ہیں اور میں زندگی کے ہر قدم پہ تمہارے ساتھ ہوں پھر کیوں ڈرتی ہو؟'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب بیٹھ کر اپنا بازو میرے شانے پہ دھرے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

اس کی اتنی قربت مجھے ہراساں کر گئی' کسی کا یوں اتنے قریب بیٹھنا میرے لیے ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔

''ریلیکس یار.....'' وہ میری بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''ہٹو پیچھے۔'' میں نے بمشکل خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹا کر دھیرے سے کہا۔

''اچھا بابا' ہو گیا پیچھے اور کچھ؟'' وہ تھوڑا پیچھے اسرک کر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بولا۔

''نوید الحسن' میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں' کہو۔'' وہ فی الفور متوجہ ہوا۔

''وہ بات یہ ہے کہ.....'' میں شدید تذبذب کا شکار تھی۔

وہ بھی الجھن میں گھرا استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''نوید الحسن' مسئلہ یہ ہے کہ میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی جس سے میرے بابا جان کی عزت پہ ذرا بھی آنچ آئے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس رشتے کے لیے کبھی مانیں گے۔ میں کل رات سے مسلسل سوچ رہی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اپنے قدم یہیں روک لینے چاہئیں۔ ہمارے سامنے اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ آپ اپنے دل سے میرا خیال نکال دیں۔ میں یہاں آج آپ سے یہی کہنے آئی ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ محبت کے دشوار گزار' کٹھور رستوں پہ آپ کا ہاتھ تھام کر تاحیات قدم سے قدم ملا کر چل سکوں۔ میں کمزور ہوں' مجبور ہوں' میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے' نہیں کر سکتی میں یہ سب۔'' میں نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بے بسی سے اپنی بزدلی کا اعتراف کیا۔ میری باتیں سن کر وہ پھر گیا۔

''اسی بہادری کی توقع تھی مجھے تم سے' سوائے ڈرنے اور رونے کے تمہیں اور کام بھی کیا ہے؟ کاش کہ میں تمہیں اپنے دل سے نکال سکتا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ سے محبت کرنے کے باوجود تم میرا ساتھ نہیں دو گی پھر بھی میں تمہیں نہیں بھول سکتا' بہت آگے جا چکا ہوں میں' نہیں ہٹا سکتا اپنے قدم پیچھے' اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے' میں زندہ نہیں رہ سکتا تمہارے بنا' سمجھیں تم؟ اور اب یہ معاملہ میں اپنے طریقے سے نپٹاؤں گا۔ خود بات کروں گا تمہارے بابا جان سے۔'' درشتگی سے کہتا ہوا وہ اٹل لہجے میں بولا تو میں ساکت رہ گئی۔

''نہیں..... نہیں..... بابا جان سے بات مت کرنا..... انہیں مت بتانا..... اگر انہیں پتہ چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔'' میرے آنسو ایک تواتر سے گرنے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بس' یہیں آ کر تو ہار جاتا ہوں میں۔'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''پلیز' تم اپنا یہ رونا بند کرو' تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جاتے مجھ سے۔'' اس نے لہجے کو نسبتاً نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی میں نے تو تمہیں یہاں یہ پوچھنے کے لیے بلایا تھا کہ اپنے امی ابا کو تمہارے گھر کب بھجواؤں لیکن تم تو مجھے نت نئے رستے دکھا رہی ہو؟'' وہ خاصا برہم تھا۔

''تو کیا کروں میں؟'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے' جو کرنا ہے' میں خود کروں گا۔'' انداز حتمی تھا۔ میں بے اختیار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہاری ان سب باتوں کے باوجود میں اپنے والدین کو ضرور بھجواؤں گا' وہ بہت سلیقے سے تمہارے بابا جان سے بات کریں گے' انہیں کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں بلکہ وہ یہی سمجھیں گے کہ یہ امی ابا کی خواہش ہے اور ہمارا پردہ بھی رہ جائے گا۔ ٹھیک؟ اچھا بتاؤ' کب بھیجوں انہیں؟ اب رہا بھی تو نہیں جاتا تمہارے بنا۔'' وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر تھا۔

اس کے پل پل بدلتے ہوئے موڈ کو دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔ کچھ دیر پہلے وہ اتنے اشتعال میں بات کر رہا تھا اور اب اتنی نرمی سے پوچھا جا رہا تھا۔

''عدن' خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو۔'' وہ دھیرے سے گویا ہوا۔

میں نے پل بھر کے لیے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے پھر سے سر جھکا لیا۔

''پاگل.....'' اس کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ گھلنے لگی پھر میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

''بزدل لڑکی.....! کچھ بھی نہیں ہوتا' میں ناں' تمہارے ساتھ۔ میرے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا ذرا سا بھی اعتبار نہیں ہے پر؟'' وہ جھک کے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت سے پوچھ رہا تھا تبھی میری نگاہ سامنے آتے ہوئے بڑے بھیا پہ پڑی جو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس سے آگے جیسے آسمان میرے سر پہ آن گرا ہو۔ وہی ہوا جو ڈرتا تھا' میرے سارے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ بڑے بھیا اپنے کسی دوست سے ملنے آئے تھے' اب یہ میری بدقسمتی کہ انہوں نے نوید الحسن کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا۔

''تم کیا کر رہی ہو یہاں؟'' اپنی حیرت چھپاتے ہوئے انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔

''بھیا.....! وہ میں..... یہاں.....'' ہکلاتے ہوئے میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ میرے ساتھ انہونی ہوگئی تھی' خوف سے میری آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی تھی۔

''اٹھو' گھر چلو۔''

انہوں نے میرا بازو آہنی گرفت میں لے کر اتنے سخت لہجے میں کہا کہ شدتِ خوف سے میرے رگوں میں برف سی جمنے لگی۔ ان کی سخت انگلیاں میرے بازو میں پیوست ہوگئیں۔ درد کی شدت سے میرے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔

میری حالت دیکھ کر نوید الحسن نے اس سختی سے ہونٹ بھینچ لیے کہ مجھے لگا کہ جیسے ابھی اس کے ہونٹوں سے خون چھلک پڑے گا پھر اس نے آگے بڑھ کر مجھے ان کی گرفت سے چھڑانا چاہا تو بڑے بھیا غصے سے بھڑک اٹھے۔

''بس نوید الحسن' بس' اس سے پہلے کہ میں اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پار کر جاؤں، بہتر ہے، تم اپنی حد میں رہو، ہمارے
میں نقب لگانے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟''
بڑے بھیا نے انتہائی غضب ناک لہجے میں
تے ہوئے ایک سرد نگاہ اس پہ ڈالی پھر اردگرد کے
وں کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے تقریباً گھسیٹتے
ئے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

نویدالحسن تذلیل کے احساس سے ہونٹ کچلتا
خاموشی سے ہمیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ غالباً
بھی اس غیر متوقع صورتِ حال پہ بھونچکا رہ گیا تھا
لیے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے ری ایکٹ
رے؟

بھیا کی زبانی ساری بات سن کر بابا جان نے
ے صفائی کا کوئی بھی موقع دیئے بغیر مجرم ٹھہرا دیا۔

''آج اسی وقت اس بدبخت کا نکاح اس نامراد
ے ساتھ پڑھا کر ہمارے گھر سے دفع کر دو احمد......
اس بے حیا لڑکی کا چہرہ تک دیکھنے کے روادار نہیں
ں۔'' انہوں نے نفرت سے میری طرف دیکھ کر
ے بھیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ نفرت اور
تعال سے ان کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ انہوں نے
نے گھر اور دل کے دروازے مجھ پہ ہمیشہ کے لیے
کر دیئے۔ میں بہت روئی، گڑگڑائی، تڑپی، ان کے
موں سے لپٹ کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی
گی لیکن ان کا دل موم نہ ہوا۔ ماں بے بسی کی تصویر
مہر بہ لب تھی۔ میں ایک ایسی مجرم تھی جسے اپنی
فائی میں کچھ کہنے یا وضاحت دینے کے لیے ایک
فظ تک بولنے کی اجازت نہ دی گئی اور سزا سنا دی
ئی۔ محض چند گھنٹوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔
یری زندگی میں اتنا بڑا طوفان آیا تھا جو آناً فاناً میری
شیوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا پھر صرف دو دن
ں نویدالحسن کے ساتھ میرا نکاح کر دیا گیا اور ساتھ
ں بابا جان نے یہ حکم بھی صادر کر دیا کہ آج کے بعد
میں کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ شیرازی
ہاؤس سے نکلتے ہوئے میں صرف یہ سوچ رہی
تھی۔ 'کیا محبت کرنا جرم ہے، گناہ ہے؟ اور اگر یہ
جرم سرزد ہو جائے تو کیا اس کی کوئی معافی نہیں؟'

•......•......•......•

آج نویدالحسن سے میری شادی کو گیارہ سال
بیت چکے ہیں۔ میں اس کے تین بچوں کی ماں ہوں
لیکن کچھ بھی تو نہیں بدلا، میرے حالات جوں کے
توں ہیں، ویسے کے ویسے ہی، وہی مرد کی اجارہ داری،
اب فرق صرف اتنا ہے کہ رشتوں کی نوعیت بدل گئی
ہے، پہلے طاقت اور اختیارات بابا جان اور بڑے بھیا
کے ہاتھ میں تھے، اب ان کی جگہ نویدالحسن نے لے لی
ہے۔ آج تک میں اس بات کو سمجھ نہیں سکی کہ مرد ہمیشہ
عورت کو اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنے کی خواہش کیوں
رکھتا ہے؟ ہاں، شاید اپنی male ego کی satisfaction
کے لیے، میں سمجھتی تھی کہ طویل رفاقتیں رشتوں کو
پائیدار کرتی ہیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ محبت گہری
ہی ہوتی چلی جاتی ہے لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی،
نویدالحسن کے ساتھ گیارہ سال کی طویل رفاقت نے
ہمارے رشتے کو ایک ایسا موڑ دیا جہاں ہمارے
سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا، سمجھوتہ۔

مجھے لگتا تھا، محبت ایک خوشبو ہے، ایک انجانا سحر
جو پُرفسوں لمحوں میں پورے وجود کو اپنی گرفت میں
لے لیتا ہے۔ آنکھوں میں دھنک رنگے خواب سجنے
لگتے ہیں پھر سچے موتیوں سے احساسات بُننے لگتے
ہیں، تب محبت دھیرے دھیرے پختہ ہونے لگتی ہے
سچے عشق میں ڈھلنے لگتی ہے، وہ عشق جو رب کا ودیعت
کردہ انمول تحفہ ہے۔ اس عشق میں سب کچھ بھول
جاتا ہے، ساری احتیاطیں، ساری تدبیریں دھری کی
دھری رہ جاتی ہیں اور دل کی مسند پہ پوری تمکنت سے
کوئی قابض ہو جاتا ہے۔ اس عشق میں کیسی کیسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کٹھنائیاں، دشواریاں، آبلہ پائی، کیسی کیسی رسوائیاں ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی قدم ان رستوں کی طرف اٹھنے لگتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں۔ ہاں، یہ نازک سے احساسات اس عدن شیرازی کے تھے جس کی زندگی میں کوئی نوید الحسن محبت کا پیامبر بن کر آیا تھا۔ میں تو سچی چاہتوں کی ترسی ہوئی تھی، کیا جانتی تھی کہ محبت کے نام پہ یوں بے خبری میں لٹ جاؤں گی؟ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو محبت کو پالینے کے بعد سمجھتے ہیں کہ منزل انہیں مل گئی ہے۔ وہ شاداں وفرحاں سے اپنی خوش قسمتی پہ اتراتے نظر آتے ہیں۔

کتنی بدقسمت ہوں میں جو اپنی منزل پالینے کے بعد بھی اندھیروں میں گھری ہوئی ہوں۔ یہ محبت کیا ہے، جو نہ ملے تب بھی ایک کسک دل میں سدا پنہاں رہتی ہے۔ اگر جو مل جائے تو رشتوں کے بدلتے ہی یہ بھی روپ بدل لیتی ہے، منہ موڑ لیتی ہے۔

مرد جب محبوب ہوتا ہے، تب عورت کی ہر ادا پہ دل و جان سے فریفتہ ہوتا ہے لیکن شوہر بنتے ہی اسی عورت کی کئی کئی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ آج نوید الحسن کے بدلے ہوئے رویئے کو دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی مرد ہے جو کہتا تھا۔

''میں زندگی کے ہر قدم پہ تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بغیر ادھورا ہوں، مجھے مکمل کردو، میری زندگی کی ہر خوشی تم سے وابستہ ہے۔'' وہ ساری باتیں، وہ شیریں لب ولہجہ ایک خواب سا لگتا ہے۔

وہ عدن شیرازی جو دیوانگی میں ہر حد سے گزر جانے کو تیار تھا، آج اس کے لیے میں ایک ماتحت کی سی حیثیت رکھتی تھی جس کا اولین فرض شوہر کا حکم بجا لانا ہے۔ اب وہ محبت گزرے وقت کی دھول میں جانے کہاں کھو گئی ہے۔ کبھی اس کی باتیں سنتی تھی تو لگتا تھا جیسے دل کے سونے صحرا میں محبت کا ابر برسنے لگے گا جبکہ آج وہی لب نخوت سے انگارے برساتے ہوئے مجھے میری خامیاں گنواتے ہیں۔

سوچتی ہوں، نہ تو بابا جان خسارے میں رہے نہ ہی نوید الحسن، سارا نقصان جس کے حصے میں آیا تو میں ہوں، صرف اس لیے کہ میں عورت ہوں۔ باپ کے گھر کئی سال گزارنے کے باوجود بھی احساس دلایا جاتا ہے کہ بیٹیاں پرائی امانت ہیں، لاشعور میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ ماں کا گھر تمہارا گھر نہیں ہے بلکہ تمہارا اصل گھر تمہارا شوہر کا ہے پھر عمر کا طویل حصہ شوہر کے گزارنے کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی احساسِ ملکیت نہیں دیتا۔ ادھر کوئی غلطی ہوگئی، حکم صادر کردیا۔

''نکل جاؤ میرے گھر سے..... چلی جاؤ ماں باپ کے گھر۔''

پھر بیٹے کی باری آتی ہے تو وہ کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے؟ واضح کر ہی دیتا ہے۔

''ماں.....! یہ میرا گھر ہے۔''

کیا عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں جہاں وہ مرضی سے پوری آزادی سے رہ سکے؟ کیا زندگی خود کو کھوجنا، ایک آشیاں کی تلاش میں بھٹکنا اس کا مقدر ہے؟ کیا وہ ہمیشہ یہی سوچتی رہے گی معاشرے میں اس کا کیا مقام ہے؟ کیا آج عورت خود کو تلاش کر پائے گی؟ خود کو اپنی ذات پہچان دے پائے گی؟ میں وہ عورت ہوں جو حاصل کر کے بھی خالی دل، خالی دامن لیے ہے۔ ڈھیروں تشنگی اور تہی دست احساسات جب وقت گھیرے رکھتے ہیں۔ میرا جرم کیا تھا؟ محبت عورت ہونا جو میرے حصے میں دونوں طرف آئی۔ جانے عورت کب تک ایک آشیاں کی میں سرگرداں رہے گی؟ وہ گھر، وہ آشیاں پورے استحقاق سے اپنا کہہ سکے؟

نسرین نکہت سبزواری

بھابی ماں

بشیر بدر کا خیال

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے بننے پہ سو رہا ہے کوئی

پاگل خانے سے آئی ایک باہوش پاگل کی عبرت انگیز روداد خصوصی

یہ میرے طالب علمی کے زمانے کا قصہ ہے۔ ان دنوں میں نفسیات میں ایم اے کر رہی تھی اور اسی سلسلے میں مجھے اپنے تھیسس کے لیے ایک روز مینٹل ہاسپٹل جانے کا اتفاق ہوا، وہاں مجھے ادراک ہوا کہ اس پاگل خانے میں تو بے شمار زندہ کہانیاں اردگرد بکھری پڑی ہیں، ان ہی کہانیوں میں سے ایک کہانی عادل کی بھی تھی۔

اس دماغی ہسپتال کے ایک ہال نما کمرے میں بہت سے پاگل جمع تھے اور ہر ایک کوئی نہ کوئی عجیب حرکت کر رہا تھا۔ ایک پاگل دوسرے پاگل کے سر پر

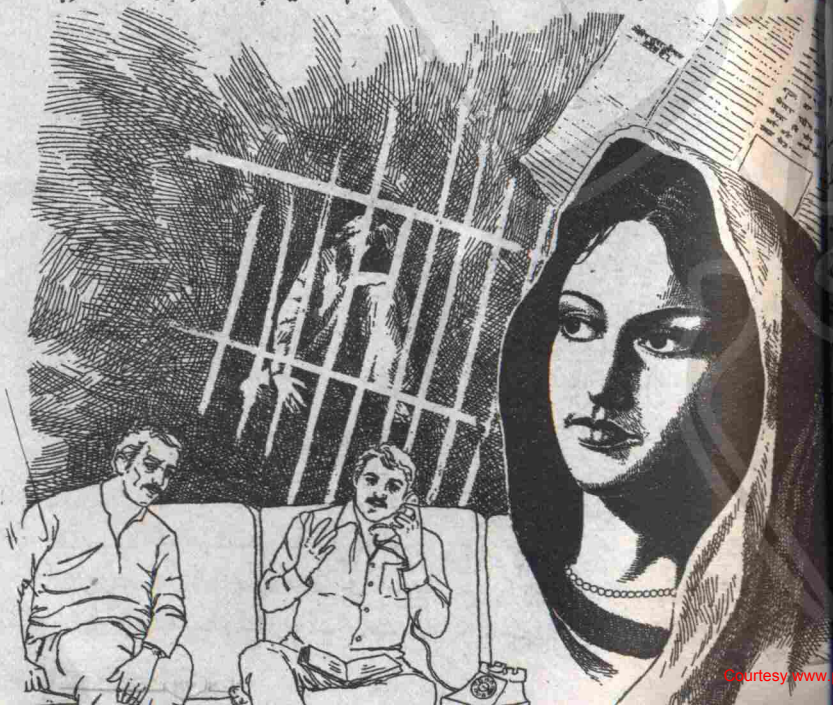

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طبلہ بجا رہا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کوئی فلمی گانا گا رہا تھا۔ ایک اور پاگل دوسرے کا سر دونوں ہاتھوں میں دبوچے اس کے گنجے سر میں شاید جوئیں تلاش کر رہا تھا۔ ایک ذہنی مریض کسی سیاسی لیڈر کی طرح بلند آواز میں تقریر کر رہا تھا غرضیکہ ہر شخص اپنی دنیا میں مصروف تھا سوائے ایک نوجوان کے جو ایک گوشے میں بالکل خاموش بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔

اس کی عمر تیئس، چوبیس سال سے زیادہ نہیں تھی، اس کے چہرے پر مخبوط الحواسی کے آثار بھی نہیں تھے خستہ حالی کے باوجود اس کا سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور تیکھے خدوخال نمایاں تھے۔ نہ جانے وہ کون تھا اور کیا حالات تھے جنہوں نے اسے اس نوعمری میں یہاں پہنچا دیا تھا؟ ابھی تو اس کی پوری زندگی پڑی تھی، کیا وہ اپنی بقیہ زندگی اس پاگل خانے میں گزار دے گا یا کبھی ٹھیک ہو سکے گا؟ اسے دیکھ کر ایسے بہت سے سوالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ ڈاکٹر فرحان ان پاگلوں کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے بتا رہے تھے کہ بہت کم رشتے دار ان پاگلوں کی خبر لینے آتے ہیں اور آتے بھی ہیں تو ان کے انداز میں بے زاری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ شاذونادر مریض ایسے ہوتے ہیں جن کے والدین، بہن بھائی یا اولاد ان کے نارمل ہونے کی خواہش کرتے ہیں اور ان میں سے چند لوگ ٹھیک ہو کر یہاں سے چلے جاتے ہیں ورنہ اکثریت پاگل خانے میں ہی اپنی باقی ماندہ زندگی گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

مجھے اس نوجوان کے حالات میں دلچسپی ہو رہی تھی اور دل میں یہ خواہش شدت سے ابھری تھی کہ کاش یہ لڑکا ٹھیک ہو سکے۔ اچانک اس کے جسم میں لرزش سی ہونے لگی پھر اس میں شدت آ گئی۔ اب وہ پوری طرح سے کانپ رہا تھا پھر اچانک اس نے بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔

''بھائی.....! بھائی.....! مجھے معاف دے..... اللہ کے واسطے..... نہیں..... نہیں مجھے معاف نہ کرنا، میں اس قابل نہیں ہوں، مجھے ڈالو وہاں، مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو۔'' ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا، منہ سے جھاگ رہے تھے پھر اس نے اپنے ہی منہ پر تھپڑ شروع کر دیئے اس کا منہ سرخ ہو گیا تھا، آنکھ باہر کو نکل آئی تھیں اور چیخیں خوفناک حد تک ہو گئی تھیں۔ وہ مسلسل اپنے منہ پر تھپڑ مار رہا آخر ہسپتال کی انتظامیہ حرکت میں آ گئی۔ چار آدمیوں نے اسے قابو میں کیا اور ڈاکٹر صاد نے اس کے بازو میں ایک انجکشن گھسیڑ دیا پھ ہی دیر میں وہ پرسکون ہو گیا اور پھر اسے وہیں لٹا کر ہسپتال کا عملہ واپس چلا گیا۔ ذہنی مریض اپنی اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر اس کی طرف ہو گئے تھے، دوبارہ مصروف ہو گئے۔

میں اس نوجوان کے بارے میں جاننا چاہتی چنانچہ جب ڈاکٹر فرحان سے اس کے متعلق پو انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکا عام طور پر خاموش رہتا دن میں دو تین دفعہ اسے پاگل پن کے دور پڑتے ہیں۔ اس مریض سے کبھی کبھار کوئی ملا ہے۔ اپنی پرسکون کیفیت کے دوران اس نے کہانی ہمیں سنائی تھی، اس پر ایک رپورٹ تیار تھی۔ وہ رپورٹ اسی کے الفاظ میں تھی۔ ڈاکٹر نے وہ رپورٹ میرے حوالے کر دی جس سے اس نوجوان کی عبرت انگیز کہانی کے بارے معلوم ہوا۔ وہ کہانی کچھ یوں تھی۔

.....•.....•.....•

میں ساہیوال کے قریب ایک گاؤں کا رہنے ہوں۔ میرا نام محمد عادل ہے۔ میری پانچ بہنیں

ایک بھائی تھا۔ میرا بھائی دلاور بہن بھائیوں میں سب سے بڑا اور میں سب سے چھوٹا تھا۔ دلاور اور میری عمروں میں انیس سال کا فرق تھا۔ میری عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔ بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو کر ماں، دلاور کی شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ موت نے اسے آ لیا۔ دلاور کی شادی بہت جلدی میں ہوئی کیونکہ ماں کے بعد میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ میرا باپ اور بھائی کھیتوں پر کام کرنے چلے جاتے تو میں گلیوں میں آوارہ گھومتا رہتا تھا۔

اس دن میں بہت خوش تھا۔ ہمارا گھر رنگین جھنڈیوں اور پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ گھر کے سامنے والے میدان میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔ مہمان جوق در جوق آ رہے تھے اور کھانا کھا کر جا رہے تھے۔ میراثیوں اور ہیجڑوں نے شور مچا رکھا تھا اور میرا باپ خوشی سے نہال ہو کر انہیں ''ویلیں'' (ناچنے والوں کو پیسے دینا) دے رہا تھا پھر شام ہو گئی اور سارے مہمان رخصت ہو گئے۔ اب صرف قریبی رشتہ دار اور گھر والے رہ گئے تھے تو مجھے اپنی بھابی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اس کے پاس آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

میری بھابی تو بس چاند کا ٹکڑا تھی۔ خدا نے جیسے اس کی مٹی کو دودھ، میدے میں گوندھ کر بنایا تھا۔

دودھ کی طرح سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، یاقوتی ہونٹ اور سیاہ لانبے بال، زیور سے لدی اور پھولوں سے سجی، لال جوڑے میں ملبوس وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ اس سے نظر ہٹانے کو میرا دل نہیں کر رہا تھا۔ اس کی نازک سی ناک میں چمکتی ہوئی نتھنی مجھے بہت پیاری لگی۔ ماتھے پر ٹیکہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں تو بس اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ میرا بھائی بھی اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سنہری

کاتبِ تقدیر

اے کاتبِ تقدیر!
میری تقدیر میں لکھ دے
غم و آلام سے دوری
خوشیوں سے بھرے دن

عائشہ خورشید۔ کراچی

شیروانی میں سر پر کلاہ باندھے اور گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے وہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا مگر میری نظر تو بس بھابی پر جمی تھی۔ بھابی بہت کم عمر تھی، وہ بہ مشکل سترہ سال کی تھی، الہڑ اور کامنی سی۔ مجھے اپنی طرف مسلسل دیکھتے پا کر وہ ہولے سے مسکرا دی۔ شاداب ہونٹوں پر مسکراہٹ نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا۔ اس نے اپنے مہندی اور چوڑیوں سے سجے ہاتھ سے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو میں جیسے کسی سحر کے زیر اثر اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے بکھرے ہوئے بال ہٹا کر میرا ماتھا چوم لیا۔ میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے باہر بھاگ گیا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

اگلے دن ہی بھابی نے گھر کا کام سنبھال لیا کیونکہ دلاور کی شادی اسی لیے تو جلدی کی گئی تھی کہ ماں کے بعد کوئی گھر دیکھنے والا نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنی سجی سجائی، زیور سے لدی، اچھے اچھے کپڑے پہنے، حنائی ہاتھوں میں چوڑیوں کی چھن چھن کے ساتھ سارے کام نمٹاتی ہوئی بھابی بہت اچھی لگتی تھی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے آنے سے تو گھر سج گیا تھا۔ وہ میرا ہر کام ماں کی طرح کرتی تھی مگر مجھے دلہن کا روپ لیے بھابی ماں سے زیادہ اچھی لگی تھی' خاص طور سے اس کی لمبی چوٹی میں پڑا ہوا گھنگھروؤں والا پراندہ جو اس کی ہر حرکت پر چھن چھن کرنے لگتا تھا' مجھے بے حد پسند تھا پھر اس کے مہندی لگے چوڑیوں سے بھرے ہاتھ..... جب سے بھائی دلاور نے اس کے مہندی اور چوڑیوں والے ہاتھوں کی تعریف کی تھی' وہ مہندی اور چوڑیاں اترنے ہی نہیں دیتی تھی۔ جیسے ہی ہاتھوں میں چوڑیاں کم ہو جاتیں تو وہ چوڑیوں والی ماسی کو بلا کر پھر ہاتھ بھرا لیتی اور پھیکی مہندی کو پھر سے گہرا کر لیتی۔ اس کے مرمریں پیروں میں چاندی کی جھانجھنیں اس کی آمد کا اعلان کر دیتی تھیں اور میں جاگ بھی رہا ہوتا تو جان بوجھ کر سوتا بن جاتا۔

''اٹھ بھرا' دیکھ' سورج چڑھ آیا ہے' اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے اٹھانے کی کوششیں کرتی اور میں اسے ایک آنکھ کھول کر دیکھتا رہتا۔ ''اچھا نہ اٹھ' اب میں تجھے اٹھانے نہیں آؤں گی۔'' وہ روٹھ کر جانے لگتی تو میں جھٹ سے آنکھیں کھول دیتا پھر وہ اپنے سرخ سرخ ہاتھوں سے مجھے لسی کا گلاس دیتی تو میں اسے دیکھتا چلا جاتا اور وہ میری محویت پر الہڑپن سے مسکرا دیتی۔ آہستہ آہستہ اس نے گھر کے سارے کام اپنے ذمہ لے لیے تھے۔

وہ اذان کی آواز کے ساتھ اٹھ جاتی' مویشیوں کو چارہ ڈال کر سارے گھر کی صفائی کرتی' سسر اور شوہر کو کھیتوں پر بھیجنے کے بعد وہ بڑے پیار سے مجھے اٹھاتی' نہلا دھلا کر' ناشتا کرا کے مجھے اسکول بھیجتی۔ میرا تو دل چاہتا تھا کہ ہر وقت اپنی من موہنی بھابی کی صورت دیکھتا رہوں۔ اسکول میں میرا دل ہی نہ لگتا' میں تو اسکول میں بھی اپنی نئی نویلی بھابی کی باتیں کرتا رہتا۔ مجھے تو بھابی کا بھائی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میرا دل کرتا تھا کہ وہ ہر وقت میرے پاس رہے' مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرے اور رات کو مجھے کہانیاں سنائے۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ رات کو وہ مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلاتی پھر میرا سر سہلانے لگتی اور جب تک میں سو نہ جاتا' میرے سرہانے سے نہ اٹھتی۔ اس معصوم سی لڑکی میں نہ جانے اتنی ممتا کہاں سے آ گئی تھی۔

وقت کا پنچھی اڑتا رہا اور بھائی دلاور کی شادی کو پانچ سال ہونے کو آئے تھے مگر بھابی نوراں کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ محلے' پڑوس اور رشتے داروں میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں مگر بھابی کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی' وہ اپنی دنیا میں مگن تھی مگر پھر بابو نے جیسے دھمکی دی کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر دے گا۔

''اس سے نہ سہی' دوسری بہو سے سہی' مجھے تو اپنے پتر کی اولاد چاہیے' بھلا میرا دلاور رے ساری حیاتی بے اولاد رہے' یہ میری زندگی میں نہیں ہو سکتا۔'' بابو کی بات نے دلاور کے بھی کان کھڑے کر دیئے اور وہ ناراض ناراض سی بھابی کو زبردستی گاؤں کی ڈسپنسری لے گیا۔ بھابی کو اولاد کا کوئی غم نہیں تھا' بس یہی خوف تھا کہ باپ سے بے حد ڈرنے والا دلاور کہیں دوسری شادی پر راضی نہ ہو جائے' وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر سوتن نہیں۔ اس نے اتنے سال اس گھر پر راج کیا تھا' اب اپنی راج دھانی میں کسی اور کو بھلا کیسے شریک کر لیتی؟ مجھے بھی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں بھابی کے روپ میں کسی اور کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر کیا کرتا' بابو کے سامنے بولنے کی ہمت میرے اندر بھی نہیں تھی۔

گاؤں کی ڈسپنسری کے بعد شہر کے ہسپتال میں بھی بھابی کا معائنہ ہوا تھا اور پتہ چلا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے ساتھ ہی کہہ دیا کہ دلاور بھی اپنا معائنہ کروالے۔

بھابی کو تو اب بھی کوئی پروا نہیں تھی' اس کی ممتا تو اپنے چہیتے دیور سے ہی سیراب ہو گئی تھی مگر دلاور کی انا کا سوال تھا' وہ اپنی مردانگی پر یہ الزام نہیں سہہ سکتا تھا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا کہ اس کے اتنے لمبے چوڑے وجود میں کوئی ایسی کمی ہو سکتی ہے کہ وہ باپ نہ بن سکے؟ جس دن وہ شہر سے معائنہ کروا کے آیا' سارا دن کمرے میں منہ چھپائے پڑا رہا' نہ روٹی نہ پانی..... بے چاری بھابی منتیں کر کر کے ہار گئی مگر دلاور نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ آخرکار بھابی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور قریب تھا کہ وہ بلک بلک کر رو دے کہ دلاور اٹھ بیٹھا۔ اس نے آج تک بھابی نوراں کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیئے تھے' اب کیسے رونے دیتا؟ نوراں نے اس کے شانے پہ سر رکھ دیا۔

''دلاورے' ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ اصل بات کیا ہے تو بے شک کہہ دینا' خرابی میرے اندر ہے..... دنیا جو کہتی ہے' کہنے دے' ہمیں پروا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' دلاور پیار بھری نظروں سے اس خلوص و وفا کے پیکر کو دیکھتا رہا تھا۔

''ایک بات سچی سچی بتاؤں دلاورے' میں جس دن بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی' میں نے بن ماں کے عادل کو اپنا بیٹا مان لیا تھا۔ جب شادی کی رات وہ میری گود سے لپٹ کر سویا تھا تو میں اسی وقت ماں بن گئی تھی۔ اس کی پیاری پیاری باتوں اور محبت بھرے سلوک نے مجھے لگنے ہی نہیں دیا کہ ابھی تک میری گود نہیں بھری ہے۔ عادل کے ہوتے ہوئے ہمیں اولاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تو ہی بتا' کیا وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے؟'' پھر وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ ''بلکہ میں تو آج بہت خوش ہوں تو سوچ ذرا' اگر ہمارے ہاں کوئی اولاد ہو جاتی تو شاید وہ مجھے عادل سے زیادہ پیاری ہو جاتی پھر میں وہ وعدہ کیسے نبھاتی جو میں نے اپنے آپ سے کیا تھا کہ میں عادل کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔'' دلاور کچھ نہ بول سکا' بس ٹکٹکی باندھے اس کی صورت کو تکے گیا تھا۔ میں نے بھابھی اور بھائی کی یہ باتیں چھپ کر سنی تھیں۔ واقعی عورت کا سب سے خوب صورت روپ وہ ہوتا ہے جب وہ ماں بنتی ہے اور نوراں تو اسی دن ماں بن گئی تھی جب وہ اس گھر میں آئی تھی۔

میں نے میٹرک کیا تو باپ اور بھائی دونوں کی مرضی تھی کہ میں اب پڑھائی چھوڑ کر کھیتی باڑی میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن مجھے لاہور جا کر پڑھنے کا جنون تھا۔ یہ بات باپو سے تو کہنے کی میری ہمت نہیں تھی اس لیے بھابی سے ہی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میری پڑھائی چھوڑنے کی بات آئی تو بھابی نوراں آڑے آ گئی۔ اس نے ضد کر کے سسر اور شوہر سے مجھے کالج میں داخلے کی اجازت لے کر چھوڑی' یوں بھی اس نے سب کا دل جیت لیا تھا۔ گھر کے ہر فرد کی دل و جان سے خدمت کرتی تھی اور بدلے میں پیار وصول کرتی تھی۔ مجھے پڑھائی کے لیے لاہور جانا تھا اور ہوسٹل میں رہنا تھا۔ کالج اور ہوسٹل میں داخلے کے لیے ایک بڑی رقم درکار تھی۔ باپو نے تو صاف انکار کر دیا' یوں تو زمین کافی تھی لیکن بہنوں اور بھائی کی شادیوں پر دنیا دکھاوے کے لیے ایک بڑی رقم ادھار لینی پڑی تھی۔ اس کا بیاج بڑھتا جاتا تھا۔ بھابی کی بری کے سارے گہنے بھی اس پر قربان ہو گئے تھے۔ ہاں' اس کے پاس جہیز کا زیور بہت تھا۔ بھابھی نے سونے کے کڑے اتارے اور باپو کی جھولی میں ڈال دیئے۔ باپو نے لینے سے انکار کیا تو وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''یہ تو سونے کے کڑے ہیں نا چاچا.....! اگر اپنے دیور کی پڑھائی کے لیے مجھے اپنے آپ کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیچنا پڑے تو میں راضی ہوں۔"

اس رات جب وہ دودھ کا گلاس دینے آئی تو میں اس کے ہاتھ تھام کے رو پڑا۔

"ہا..... ہائے..... یہ چھ فٹ کا جوان روتا ہو ااچھا لگتا ہے کیا؟" بھابی نے مذاق میں بات ٹالنی چاہی تو میں اور زور سے رو پڑا۔

"بھابی' سچی تو میری بھابی نہیں' میری ماں ہے۔" حالانکہ وہ ماں تو کیا' میری بڑی بہن بھی مشکل سے لگتی تھی۔ گزرتے وقت نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا' وہی رنگ روپ' وہی الھڑپن' وہی بھولاپن۔ جب بیاہ کر آئی تھی تو دھان پان سی تھی' اب ذرا بدن بھر گیا تھا جس نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا۔

میری بات کے جواب میں اس نے میرے سر پر ہلکی سی چپت مار کے کہا۔ "شکر ہے تو نے مجھے ماں مانا تو سہی' بس میری دُعا قبول ہوگئی۔"

میں دوبارہ اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا' پر اس کے لاکھ کہنے پر بھی میں دوبارہ اسے ماں کہہ کر نہ پکار سکا حالاں کہ یہ اس کی بڑی خواہشوں میں سے ایک تھی۔

اُن دنوں جب میں ہوسٹل جانے والا تھا تو بھابی بالکل گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اتنا بڑا ہو گیا تھا لیکن وہ میرے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھنا' کپڑے دھونا' استری کرنا پھر جب میں امتحانوں کے نزدیک رات گئے تک پڑھائی کرتا تو وہ میرے آس پاس ہی منڈلاتی رہتی' کبھی گرم دودھ لا کر دیتی' کبھی چائے بنا کر دیتی' کبھی ضد کر کے میرے سر میں تیل لگاتی۔

وہ اداس ہو کر کہتی۔ "وے عادلا' تیرے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا؟ میں تو بالکل کلم کلی ہو جاؤں گی۔ بابا اور دلاور کھیتوں پر چلے جایا کریں گے اور میں خالی گھر میں کملیوں کی طرح پھرا کروں گی۔ میں نے تو اپنی سکھی سہیلیوں کو بھی تیرے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

"تو اداس ہوتی ہے تو میں نہیں جاتا۔" مجھ سے اس کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی۔

"نہ عادلا' ایسا نہ بول' جانا تو تجھے ہے۔ پڑھ لکھ کر بڑا افسر نہیں بننا تجھے؟"

چھٹیوں میں گھر آتا تو بھابی پھول کی طرح کِھل جاتی تھی اور یہ وقت بہت تیزی سے گزر جاتا۔ جوں جوں میرے جانے کے دن قریب آتے' بھابی کے چہرے پر ویرانی پھر لوٹ آتی اور وہ اداس ہونے لگتی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور بھابی کے بدن پر گہنے کم ہوتے جا رہے تھے۔ کالج کے اخراجات بڑھتے ہی جاتے تھے۔ میں جب بھی باپو سے پیسوں کا مطالبہ کرتا' اس کا پارہ چڑھ جاتا۔

"چل' اب بس کر' بہت پڑھ لیا' میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے' بڑا ولایت پاس کرے گا' سیدھے سیدھے گاؤں آ کر اپنے حصے کا کام سنبھال یا شہر میں کوئی روزگار کر' بڑا بھئی تیرا نوکر نہیں کہ وہ تجھے کما کما کے پالتا رہے اور تو عیش کرے۔"

مگر میری ضرورت بھابی پورا کر دیتی تھی۔ وہ نہ کبھی خود کچھ کہتی نہ دلاور کو کچھ کہنے دیتی' خاموشی سے اپنے گہنوں میں سے ایک گہنہ نکال کر میرے حوالے کر دیتی۔ سچ تو یہی تھا کہ میرے سارے خرچ بھابی اپنے زیوروں سے پورے کر رہی تھی۔ میرے لیے اس نے نہ جانے کتنے خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں مجھے بڑا افسر دیکھا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی میں پڑھ کر فارغ ہوں گا' بہت بڑا افسر لگ جاؤں گا۔ ہم ایک بڑا سا گھر لے لیں گے جس کے آگے چوہدری کی لینڈ کروزر جیسی گاڑی کھڑی ہوگی۔ گاؤں کی چوہدرائن کی طرح جب وہ اس گاڑی میں بیٹھنے لگے گی تو ڈرائیور آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دے گا اور وہ بڑی شان سے اس میں بیٹھ جائے گی۔ امیدیں تو اس کی اور بھی تھیں مگر اس کے آگے اس کا سیدھا سادہ ذہن کام نہیں کرتا تھا۔

میں نے ایف اے پاس کر کے بی اے میں داخلہ لیا تو یہاں بھی بھابی کا زیور ہی کام آیا تھا۔ ان ہی دنوں میرے دوستوں میں چند اور دوستوں کا اضافہ ہوا۔ انہوں نے مجھے ایک ایسی دنیا کی سیر کرائی کہ میں تعلیم وغیرہ بھول کر اس کی رنگینیوں میں کھو گیا۔

ایک دن ہوسٹل کے وارڈن نے ہمیں ہوسٹل کے کمرے میں نشہ کرتے اور جوا کھیلتے پکڑ لیا اور ہمیں کالج سے نکال دیا گیا لیکن میں نے گاؤں میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی پھر مجھے جوئے' شراب کی ایسی لت پڑی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں وہی عادل تھا جو بھابی کے خالی ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رو پڑتا تھا اور دل میں عہد کرتا تھا کہ میں اسے ان سے زیادہ بھاری کڑے بنوا کر دوں گا۔ اب میں اس کے تمام زیور بیچ کر کھا چکا تھا اور ابھی تک اسے یہی خواب دکھا رہا تھا کہ ایک دن میں بہت بڑا افسر بن جاؤں گا۔

میری آوارگی اور گمراہی کے قصے گاؤں تک پہنچ رہے تھے۔ دلاور کو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہ تھی' باپو میرے مستقبل کے خواب آنکھوں میں بسائے اس دنیا سے سدھار چکا تھا' ایک بھابی تھی جو اپنے اندیشوں اور وسوسوں کو دل میں دبائے ابھی تک میری کامیابی کی دُعائیں مانگا کرتی تھی۔ اسے ان باتوں پر یقین ہی نہیں ہوتا تھا۔

برے کاموں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا' شراب اور جوئے سے آگے بڑھ کر میں بری عورتوں کے چکر میں بھی پڑ چکا تھا لیکن اب بھابی کے زیور ختم ہو گئے تھے۔ میرے پاس آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا اس لیے میں نے قرضہ لینا شروع کر دیا پھر جب قرض خواہوں نے جینا دوبھر کر دیا تو میں شہر سے بھاگ کر گاؤں آ گیا۔ گھر میں بھابھی کو یہی بتایا کہ میری چھٹیاں ہیں مگر کافی دن گزرنے پر بھابھی حیران تھی کہ میری چھٹیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ کرنے کو میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں' سارا دن کھٹیا پر پڑا سوتا رہتا' شام ڈھلے گھر سے نکلتا اور صبح کی اذانوں کے بعد میں گھستا۔ ان دنوں قسمت مہربان تھی' ساتھ والے گاؤں میں ایک دوست کے خالی مکان میں جوا ہوتا تھا اور میں مسلسل جیت رہا تھا' پیسہ جیب میں ہو تو بازاری عورتیں بھی مہربان ہو جاتی ہیں۔ مجھے اب شہر جا کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ایک دوست کے پاس جیپ تھی' ہم راتوں رات شہر جاتے اور داد عیش دے کر صبح تک واپس آ جاتے۔ میں نے بھابی سے کہہ دیا تھا کہ ساتھ والے گاؤں میں میرا ایک دوست رہتا ہے' میں اس کے ساتھ رات بھر پڑھتا ہوں' اس کے پاس بہت اچھی اور مہنگی کتابیں ہیں جو میں نہیں خرید سکتا۔ بھابھی بے چاری شرمندہ ہو کر رہ جاتی تھی کہ وہ مجھے ایسی کتابیں خرید کر نہیں دے سکتی تھی۔ جھوٹ بولنا بس ایک بار مشکل ہوتا ہے پھر آدمی بے تکان جھوٹ بولتا جاتا ہے۔ یہی حال میرا تھا' میں نے بھابی کو بتایا تھا کہ میرے فائنل امتحان ہونے والے ہیں پھر میں پڑھائی سے فارغ ہو کر نوکری پر لگ جاؤں گا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح امتحان کے لیے پیسوں کا انتظام کر دے گی۔ میں نے اس بھولی بھالی عورت سے کافی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ دلاور کو کچھ نہیں بتائے گی کہ میں بھائی کو کامیاب ہو کر حیران کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر بھابی نہال ہو گئی تھی۔

ایک روز اس نے مجھے بتایا تھا کہ میری نوکری لگتے ہی وہ میری شادی کر دینا چاہتی ہے۔ اس نے تو گاؤں کی تمام لڑکیوں کا جائزہ بھی لے لیا تھا لیکن کوئی لڑکی اس کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی۔ اس کے خیال میں اسے ایک بڑے افسر کی بیوی بننا تھا۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہونا چاہیے تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے بہت زیادہ پڑھے لکھے دیور کی بیوی کو کم از کم دسویں پاس تو ہونا چاہیے۔

اُس روز مغرب کا وقت تھا۔ ہم دونوں بھائی صحن میں چارپائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بھابی گرم گرم روٹیاں پکا کر ہمیں دے رہی تھی۔ روٹیاں پکاتے پکاتے بھابی نوراں کو خیال آ گیا۔

''دلاور، ماسی جیراں نے بتایا ہے کہ چاچا محمد رمضان کی بیٹی نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ وہ بڑی سوہنی کڑی ہے۔ پانچ وقت کی نمازی ہے۔ گھر کے کام کاج میں ماہر ہے۔ کل چل کر دیکھ آتے ہیں، یہ ساتھ ہی تو گاؤں ہے۔ عادل کی پڑھائی کے تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں اور کچھ نہیں تو منگنی ہی کر دیں اس کی۔ سچ، بڑا جی کرتا ہے گھر میں ذرا ہلہ گلہ ہو۔ اکیلے رہ رہ کر اوب گئی ہوں۔'' میں نے نظر اٹھا کر بھابی کی طرف دیکھا، گزرے پندرہ سالوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

وہی رنگ، وہی روپ، شاید تھوڑی دیر پہلے نہا کر آئی تھی، لمبے گھنے بال پشت پر پڑے تھے، پسینے کی وجہ سے چند لٹیں صندلی پیشانی پر چپکی ہوئی تھیں، وہ پیڑہ بنا رہی تھی اور عادتاً تیز تیز بول رہی تھی۔

''بھابی، میری دلہن بس تیری جیسی ہونی چاہیے، ذرا بھی فرق نہ ہو۔'' میں بے اختیار بول پڑا۔ بھابی بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرا دی۔

''لے...... جھلا نہ ہو تو، میں ٹھہری چٹی اَن پڑھ دیہاتی، تیرے لیے تو میں اپنے سے بہت اچھی دلہن لاؤں گی پڑھی لکھی اور تمیز والی۔''

''نہیں بھابی......!'' میں مچل اٹھا۔ ''مجھے تو بس تیری جیسی دلہن چاہیے نہ کم نہ زیادہ۔''

''دیکھ لے دلاور، یہ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہا ہے، بھلا میں اپنے جیسی لڑکی کہاں سے ڈھونڈوں؟ میرے سے اچھی تو مل جائے گی، پر بالکل اپنے جیسی کہاں سے لاؤں؟''

''مجھے کیا کہہ رہی ہے بھلی لوکے، تو جانے اور تیرا لاڈلہ دیور جانے۔'' یہ کہتے ہوئے دلاور نے چارپائی پر لیٹ کر ٹانگیں پھیلائیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ جب بھابی اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے فضا میں گونج رہے تھے۔

''ہاں...... ہاں...... مجھے معلوم ہے، مجھے ہی سب کچھ کرنا ہے۔ تو، تو کھیتوں میں رہا کر یا کھاٹ پر۔'' بھابی جھنجلا کر بولی اور دودھ کا گلاس مجھے پکڑا دیا۔

''جا ویرا، تو، تو جانے کی تیاری پکڑ، تیرے نصیب میں رات کو سونا کہاں لکھا ہے۔'' اس کے خیال میں مجھے دوست کے گھر جا کر ساری رات پڑھنا تھا۔

بھابی اپنے ہی خیالوں میں مگن تھی، اس کے سارے اندیشے میرے گاؤں آتے ہی دم توڑ گئے تھے اور وہ میری طرف سے پوری طرح مطمئن ہو گئی تھی لیکن ایک دن اس کے تمام خواب ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے اور ان کی کرچیوں نے اس کی جاگتے میں خواب دیکھتی آنکھوں کو زخمی کر دیا۔ بھابی کا چچازاد بھائی لاہور سے شہر آیا تو اس نے میرا سا کچا چٹھا کھول دیا۔ اس کی ملاقات اچانک میرے ایک کلاس فیلو سے ہو گئی تھی۔ اس نے بھابی کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ مجھے ایف اے کے بعد ہوسٹل اور کالج سے نکال دیا گیا تھا اور یہ بھی کہ میں نے بھابی کے زیور پڑھائی میں نہیں بلکہ جوا، شراب اور بازار حسن کی نذر کر دیئے تھے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ میں نے گاؤں آ کر ایسے دوست ڈھونڈ لیے ہیں جو جوئے اور شراب کے رسیا ہیں اور میں پڑھائی کے بہانے ان کے پاس جاتا ہوں۔

بھابی یہ سب سن کر سناٹے میں آ گئی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی کہ دلاور کو یہ سب بتائے نہ بتائے اور بتائے تو کیسے بتائے؟ دلاور کو پہلے ہی اس کے زیور بک جانے کا غم تھا اور بھابی اسے یہی کہہ کر تسلی دیا کرتی تھی کہ جب عادل بہت بڑا افسر بن جائے گا تو ہمارے سارے ارمان پورے کر دے گا۔

وہ کہا کرتی تھی۔ ''بس تو اس کی کامیابی اور حیاتی کی دُعا کیا کر، میرا سوہنا پتر، اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ وہ تو تجھ سے بھی زیادہ گبھرو جوان ہے۔''

وہ یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ یہ سب دلاور کو کیسے بتائے؟ وہ تو ویسے ہی زیور بیچنے کے خلاف تھا۔ اب ان خوابوں کا کیا ہو گا جو اس نے دلاور کے ساتھ مل کر دیکھے تھے۔ ان دونوں نے ہی میری تعلیم کے لیے بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں لیکن زبان سے اف تک نہ کی تھی۔ دلاور غصے کا بھی تیز تھا، وہ تو بھابی تھی جو کبھی جھوٹ بول کر اور کبھی نرمی سے تسلی دے کر تلخی کی نوبت نہیں آنے دیتی تھی لیکن آج اسے اس طوفان کو روکنا بہت دشوار لگ رہا تھا۔

مجھے تمام حالات کا علم ہو گیا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا، آنے والے طوفان کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ میں بھابی کے دل کی کیفیت بھی جانتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ بھابی کے اس چچازاد کو قتل کر دوں...... جس نے میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا لیکن یہ بھی احساس تھا کہ حقیقت کو کب تک چھپایا جا سکتا تھا؟ ادھر میری قسمت نامہربان ہو گئی تھی، میں جوئے میں بڑی رقم ہار کر قلاش ہو چکا تھا، جواریوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، وہ جیتنے کی امید میں ہارتے ہی رہتے ہیں، شراب اور برے کاموں کی لت انہیں اور زیادہ برباد کر ڈالتی ہے لیکن جھوٹی آس ساتھ نہیں چھوڑتی۔

دل بہت پریشان تھا، سوچا، چنبیلی بائی کے پاس جا کر ذرا دل بہلاؤں، کم از کم ایک رات تو سب کچھ بھلا کے سکون سے گزاروں پھر جو ہو گا، دیکھا جائے گا لیکن اس کم بخت عورت کو بھی میری کنگالی کا پتہ تھا، شراب تو ایک دوست نے پلا دی تھی لیکن اس عورت نے مجھے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیا، دھکے دے کے گیٹ سے واپس کر دیا۔ شدید غصے اور مایوسی کی وجہ سے سر پھٹا جا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا مجھ سے ناراض ہے، مجھ سے نفرت کرتی ہے، دنیا میں کوئی میرا ہمدرد نہیں ہے۔ اسی وقت بھابی کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے تصور میں ابھرا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ 'تو کیوں پریشان ہوتا ہے عادلا، میں ہوں نا، ہمیشہ تیری ہر مشکل میں کام آنے والی۔' پھر میں بغیر کچھ سوچے سمجھے گھر کی طرف چل پڑا۔ دل میں یہی خواہش تھی کہ بھابی سے جا کر سر میں تیل ڈلواؤں گا۔ میں جب بھی کسی وجہ سے پریشان ہوتا تھا، وہ یہی کیا کرتی تھی اور میرا سر ہلکا ہو جاتا تھا، نہ جانے اس کی نرم و نازک انگلیوں میں کیسا جادو تھا۔ مجھے معلوم تھا، آج دلاور گھر پر نہیں ہو گا، اسے کسی کام سے ساہیوال جانا تھا۔ وہ کبھی لاہور نہیں جاتا تھا، اس کے سارے کام ساہیوال میں ہی ہو جاتے تھے۔ یہ بھی میری خوش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نصیبی تھی ورنہ تو میرا پول بہت پہلے کھل چکا ہوتا۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ اب تک بھابی نے دلاور سے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی ہے مگر پھر بھی اس کے سامنے آنے سے گھبرا رہا تھا۔ بھابی نے کنڈی کھولی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ گھر میں اکیلی تھی اور اکیلی ہونے کی وجہ سے ڈری ڈری سی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی مگر میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں نے شراب پی رکھی ہے۔ میرے خیال میں بھابی نے شراب کی بو محسوس کرلی تھی مگر یا تو وہ پہچان نہ سکی یا میری حالت دیکھ کر اتنی پریشان ہوگئی تھی کہ وہ اس کو نظر انداز کرگئی۔ اس نے مجھے کھانے کو پوچھا تو میں نے منع کردیا۔

''نہیں بھابی' سر میں سخت درد ہے تو ذرا سر میں تیل ڈال دے تو میں سو جاؤں گا۔''

''نہ ویرا' خالی پیٹ نہیں سونا' درد اور بڑھ جائے گا اور برے برے خواب بھی آئیں گے۔'' میں کچھ نہ بولا' خاموشی سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ بھابی گرم دودھ لے آئی۔ میرے کہنے پر اس نے دودھ کا گلاس ایک طرف رکھ دیا اور سرہانے بیٹھ کر میرا سر دبانے لگی۔

آنکھیں بند کرتے ہی تھوڑی دیر پہلے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ جب چنبیلی بائی نے میری بے عزتی کی تھی' اپنے ایک اور آشنا کے سامنے مجھے ذلیل کیا تھا' میرا خون اندر ہی اندر کھول رہا تھا' جی چاہتا تھا' جا کر اس کا گلہ دبا دوں۔ میں کتنی بے قراری سے اس کے پاس گیا تھا' مجھے اس وقت کسی عورت کی شدید ضرورت تھی اور اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا' صرف اس لیے کہ میں کنگال تھا' اس کی قیمت ادا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے بھابی کا خوبصورت اور مہربان چہرہ تھا۔

چاندنی رات میں اس کا روپ اور بھی نکھر آیا تھا' سیاہ گھنیرے بالوں کے درمیان اس کا حسن چاند کو شرما رہا تھا' نشیلی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں' وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی' اس کے گداز ہاتھوں کا لمس میرے اندر عجیب سے جذبات جگا رہا تھا۔ میں اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ میرے سامنے جو عورت بیٹھی ہے' وہ میری کون ہے۔ شراب کے نشے میں بس ایک احساس باقی رہ گیا تھا کہ میرے سامنے ایک عورت بیٹھی ہے' ایک حسین اور جوان عورت..... مجھے یوں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ کر بھابی نوراں بھی گھبرا گئی' شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ آج ان آنکھوں میں وہ معصوم جذبہ نہیں ہے جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ میں لاکھ بھابی سے بے تکلف سہی مگر ہمارے درمیان احترام کا احساس ہمیشہ رہتا تھا۔ وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے اوپر جھکا لیا' بھابی کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا' اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑائے اور پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کردیا تھا اور وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ میں نے آ کر پیچھے سے اس کی کمر میں دونوں بازو حمائل کردیئے۔ بھابی دیکھنے میں نازک اندام سہی مگر تھی تو گاؤں کی جٹی' اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور کمرے میں گھس گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کنڈی لگاتی' میں اندر داخل ہوگیا۔ اسی وقت بجلی جو کافی دیر سے غائب تھی' اچانک آ گئی۔ میں اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔ نوراں کے ہاتھ میں دلاور کا پستول تھا نہ جانے کس لمحے اس نے لوہے کی الماری سے وہ پستول نکال لیا تھا۔

''ویرے' ہوش کر' کیا ہوگیا ہے تجھے' میں تیری ماں ہوں۔'' اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی

اور کپکپا رہی تھی۔

میرے اوپر تو اس وقت شیطان سوار تھا۔ ''تو میری ماں نہیں ہے' میری بھابھی بلکہ آج رات تو' تو میری کچھ بھی نہیں' بس ایک عورت ہے جس کی مجھے ضرورت ہے' بس آج کی رات..... نوراں..... بس آج کی رات..... کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا' بس ایک رات کی بات ہے۔'' میرا انداز گھگھیانے والا تھا۔

''شرم کر عادلے' تو اپنی ماں کا نام لے رہا ہے۔ اس سے پہلے تو' تو نے کبھی ایسا نہیں کیا؟'' نوراں کی آواز میں جیسے صدیوں کا درد تھا۔ ''نہ..... نہ..... عادلے' اپنی جگہ سے نہ ہلنا' دیکھ' میرے ہاتھ میں پستول ہے.....'' نوراں نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

''دیکھ عادلے' میرے قریب نہ آنا' باز آجا..... ویرا' تجھے پتہ ہے' میں تجھے گولی نہیں مار سکتی مگر اپنے آپ کو تو مار سکتی ہوں۔ مان جا ویرا..... میں تیرے بھائی کی عزت ہوں' تیری ماں ہوں۔ دیکھ عادل پتر' مجھے اپنی زندگی بہت پیاری ہے' مجھے زندہ رہنا ہے تیرے لیے' دلاور کے لیے' اپنی آنے والی خوشیوں کے لیے۔ ابھی تو ہم نے خوشیوں کے سپنے ہی دیکھے ہیں' اب تو ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے۔ میں نے تیری شادی کے نہ جانے کتنے خواب دیکھے ہیں۔ مجھے مرنے پر مجبور نہ کر ویرا' مجھے جینے دے' میرا جینے کو بہت دل کرتا ہے۔ موت سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ میں اس دنیا میں' اس گھر میں جینا چاہتی ہوں' اس گھر سے' گھر والوں سے مجھے بہت پیار ہے' مجھے جینے دے عادلے' میں جینا چاہتی ہوں بڑی عمر تک..... بڑھاپے تک..... مجھے نہ مار ویرا' مجھے نہ مار۔'' وہ پستول ہاتھ میں تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا مگر پستول پر اس کی گرفت سخت تھی۔

''عادل' تجھے ڈر لگ رہا ہے نا' پر تو نہ ڈر' میں تجھے نہیں' اپنے آپ کو گولی ماروں گی۔ تو نے کبھی سنا ہے کہ کسی ماں نے اپنے پتر کو گولی ماری ہو؟ نہ عادلے' تجھے رب کا واسطہ' تو کمرے سے نکل جا' چلا جا یہاں سے' میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی..... دلاور سے کو بھی نہیں۔ میں خود بھی سب کچھ بھول جاؤں گی۔ ہم پہلے کی طرح ہنسی خوشی رہیں گے تو بس میری بات مان لے' جا' چلا جا یہاں سے' اگر تو میرے دس گننے تک باہر نہیں گیا تو میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گی۔''

میں پتھر بنا اسے دیکھ رہا تھا' اس وقت تک میں پوری طرح ہوش میں آچکا تھا۔ اب میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ بھابی کے ہاتھ سے پستول کیسے چھینوں؟ اس نے جس طرح پستول اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا' مجھے ڈر تھا کہ کسی وقت بھی لبلبی دب سکتی ہے۔ ادھر بھابی نے گنتی شروع کردی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کیا خبر' گولی غلطی سے چل جائے۔ وہ گنتی گنے جا رہی تھی۔ میں بہت آہستگی سے آگے بڑھا لیکن اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی اور بھابی خون میں لت پت ہو کر زمین پر آ رہی۔ نہ جانے اس نے پستول چلا دیا تھا یا گولی غلطی سے چل گئی تھی؟ میں لپک کر آگے بڑھا اور بھابی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

میں نے سنا' بھابی ڈوبتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''مجھے ماں کہہ کر پکار عادل.....! بس ایک بار..... ایک بار ماں کہہ دے۔ میرے کان ساری حیاتی اس لفظ کو ترستے رہے ہیں' بس آخری بار مجھے ماں کہہ دے پتر.....!'' بھابھی کی آواز ڈوب رہی تھی۔ ''تو نہیں کہے گا' اچھا' رہنے دے' جا' میں نے تجھے معاف کیا۔ میرا مولا بھی تجھے معاف کردے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس دلاور سے اتنا کہہ دینا' نوراں ہمیشہ سے اس کی تھی اور اس کی ہو کر اس دنیا سے جا رہی ہے'' یہ کہتے کہتے اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے تڑپ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ماں.....! سن لے' میں تجھے ماں کہہ رہا ہوں' سن لے ماں.....! تجھے میری قسم' جانے سے پہلے ایک بار سن لے تو میری بھابی نہیں' میری ماں ہے۔'' میں دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا' تڑپ رہا تھا لیکن میرے منہ سے ماں کا لفظ سننے کو ترسنے والی ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا' میں کہاں ہوں' کیا کر رہا ہوں' مجھ پر بھابی کے قتل کا الزام لگ سکتا تھا مگر میں ہر بات سے بے خبر تھا۔ بھابی کی لاش کو سینے سے لگائے چیخ چیخ کے رو رہا تھا' اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا' دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا' میرے سر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا لیکن میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والی سکون سے گہری نیند سو رہی تھی پھر اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

•.....•.....•.....•

آگے کی کہانی اس پولیس رپورٹ کے ذریعے مکمل کی گئی تھی جو پولیس نے محلے والوں کے بیانات کے ذریعے تیار کی تھی۔

دلاور تو عادل کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ اگر محلے والوں نے اسے پکڑ کر پولیس والوں کے حوالے نہ کر دیا ہوتا تو وہ اسے جان سے مار ڈالتا لیکن عادل چند مہینوں میں ہی قتل کے اس مقدمے سے بری ہو گیا۔ پستول پر اس کی بہن نوراں کی انگلیوں کے نشان تھے اور شواہد سے یہی ثابت ہوا تھا کہ نوراں نے خود اپنے آپ کو گولی ماری تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ عادل اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ محلے والوں کا یہی خیال تھا کہ عادل' بھابی کے غم میں دیوانہ ہو گیا ہے جسے وہ بے حد پیار کرتا تھا اور بھابی بھی اسے اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ دلاور جب تک زندہ رہا' حیران' پریشان رہا کہ نوراں نے اپنی جان کیوں لی؟ اسے تو سینے دیکھنے کا شوق تھا' وہ سوتے جاگتے خواب دیکھا کرتی تھی اور خواب دیکھنے والے تو کبھی مایوس نہیں ہوتے کہ اپنی جان لے لیں۔

دلاور' نوراں کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا۔ ایک دن خاموشی سے دل کے دورے میں اپنی جان سے گزر گیا۔ عادل جیل سے تو رہا ہو گیا مگر اس کا ٹھکانہ اب دماغی ہسپتال تھا۔ وہ ضمیر کی خلش کے ہاتھوں اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے' وہ پچھتاووں سے بھری اپنی کہانی اپنے دماغی دوروں کے دوران خود ہی سنا دیتا ہے۔ ضمیر کے کچوکے تو اسے پاگل پن کے دوروں کے دوران بھی چین نہیں لینے دیتے' اس پر وقفے وقفے سے دورے پڑتے ہیں' اپنے ذہنی کرب میں وہ اپنے آپ کو مار ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کون جانے اسے کب تک اس حال میں رہنا ہے؟

عادل کی بہنیں بھی اس سے نفرت کرتی ہیں کیونکہ خود عادل ہی کی زبانی انہیں کافی حد تک حقیقت کا پتہ چل گیا ہے۔

عادل سے ملنے کوئی نہیں آتا' کوئی اسے دیکھنے نہیں آتا کہ اسے اپنی جان سے عزیز رکھنے والی کی موت کا ذمہ دار تو وہ خود ہے' اس نے شراب کا زہر پی کر اپنی ہنستی بستی جنت اجاڑ لی۔ اس ذہنی کرب سے اسے پاگل پن کے دوروں کے درمیان بھی نجات نہیں ملتی۔ وہ ہوش میں ہو یا نہ ہو' اسے اپنا جرم یاد رہتا ہے اور اسے مستقل ذہنی عذاب میں مبتلا رکھتا ہے' اسے کہیں چین نہیں' کہیں امان نہیں' کون جانے اسے کب تک یہ عذاب سہنا ہے؟ شاید اس زندگی کے بعد بھی.....!

شہید کی کہانی | ہمارے وطن کا دفاع کرنیوالے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ

منزہ سہام مرزا

شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پروازِ خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

میں بہت بے چین ہوں' بہت دکھی ہوں' سسکیاں' چیخیں' آہیں مجھے تڑپاتی ہیں۔ خوف اور تکلیف سے پھٹی آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جیسے کہتی ہوں۔ ''دیر' تو کیا گیا' میرا وطن تو ویروں سے خالی ہو گیا۔'' میں بہت بے بس ہوں' شہید کا درجہ اور مقام آپ بھی جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود دل بے قرار ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ڈھیروں خوشیاں بانٹوں۔ آپ کے چہروں پر خوشیاں رقصاں دیکھوں مگر افسوس' جب آپ سے بات کرتا ہوں' دل خون کے آنسو رو رہا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو حیرت ہو رہی ہو گی نا کہ ایک فوجی ہو کر آنسوؤں کی بات کیسے کر رہا ہوں؟ تو میرے پیارے ہم وطنو.....! فوجی بھی تو انسان ہوتا ہے' اس کی صبر اور برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ روزانہ جب اپنے وطن پر نظر ڈالتا ہوں تو ظلم اور بربریت کے عجیب نظارے دیکھتا ہوں' ایسے نظارے جنہیں دیکھ کر شیطان بھی شرما جائے۔ اگر حکمران طبقہ نااہل ہے' آپ لوگوں سے مخلص نہیں' ملک کو لوٹ رہا ہے تو عزیزو.....! آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ خود کہاں کھڑے ہو؟ یہ جو ننھی منی پریاں اغوا کر کے قتل کی جا رہی ہیں' ان کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ سب ہماری اپنی بیٹیاں نہیں؟ قوم کی بیٹی' سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ جب انہیں دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی فاطمہ یاد آ جاتی ہے۔ جب میں دنیا سے آیا تھا' تب وہ بہت چھوٹی تھی۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس بچی کے سر پر باپ کا سایہ نہیں' یہ شہید کی بیٹی ہے' تب سب نے اسے اپنی بیٹی جان کر پالا' اس کی حفاظت کی ذمہ داری سارے گاؤں کی تھی۔

ایک بار فاطمہ پڑوس کے چاچا فضل دین کی دھی کے ساتھ نہر کے کنارے آم کے باغ میں چلی گئی تھی تاکہ کچی کچی امبیاں توڑ سکے' تب اس کی ماں نے پریشان ہو کر چاچا فضل دین کو کہلوا بھیجا اور وہ گاؤں کے پانچ چھے لوگوں کو لے کر ان دونوں کو تلاش کرنے نکلے تھے۔ تھوڑی دور گئے تھے' تب ڈاکیے چاچا کے ساتھ دونوں کو آتے دیکھا۔ ڈاکیے چاچا نے بتایا کہ یہ امبیاں توڑ رہی تھیں۔ انہوں نے امبیاں بھی توڑ کر دیں اور ساتھ لے کر بھی آئے۔

ہمارے دور میں تو لوگ ایسے تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں ہیں؟ گاؤں کا ہر آدمی' ہر بچے پر نظر رکھتا تھا۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں' یہ تو بڑوں کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت کریں۔ میں تو سوچتا ہوں کہ اب والدین کو کیا ہو گیا ہے؟ اپنے بچوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اتنے بے خبر کیوں ہیں؟ محلے پڑوس کے لوگ اتنے بے نیاز کیوں ہو گئے ہیں؟ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ آج اگر کسی اور کی دھی کو نہ بچایا تو کل ان کی دھی کو بھی کوئی نہیں بچائے گا؟

اب میں تو سو گیا ہوں۔ آپ لوگ اب بھی اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھیں گے؟ ماں کہتی تھی۔ ''پتر......! جب انسان اپنے فرائض پورے کرتا ہے' تب اس کو اس کے حقوق بھی ملتے ہیں۔'' خدا کے واسطے' اپنے اوپر نہیں تو مجھ پر رحم کریں' میری خاطر جاگ جائیں' میں نے آپ کی خاطر جان دی ہے' مجھے اب صلہ چاہیے' مجھے اُس احسان کا بدلہ چاہیے جو میں نے آپ پر اور آپ کی اولادوں پر کیا۔ اپنی جان دے کر آپ کو آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع دیا۔ جب تک زندہ رہا' اپنے گھر والوں سے آپ کی خاطر دور رہا' سرحدوں کی حفاظت پر معمور رہا۔ آنکھیں کھلی رکھیں تاکہ آپ چین سے سو سکیں پھر ہمیشہ کے لیے اپنے پیاروں سے دور ہو گیا۔ کتنی باتیں دل ہی میں رہ گئیں جو ماں باپ سے نہ کہہ سکا۔ کتنی باتیں فاطمہ کی ماں سے اَن کہی رہ گئیں' پر کوئی دکھ نہیں' میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ میرے ہم وطن' اپنے وطن میں محفوظ رہیں' سکھ کی سانس لیں اور چین کی نیند سوئیں پھر یہ کیا ہوا' میری دھی رانیاں اپنے وطن ہی میں محفوظ نہیں؟ کوئی ایک بھی گبھرو جوان باقی نہیں بچا جو میری شہزادیوں کو ان شیطانوں سے بچا سکے؟ زندگی رحمٰن کی امانت ہے آپ کے پاس' آپ امین ہیں' ان امانتوں کا حساب دینا ہوگا۔ کیسے دیں گے؟ کیا کہیں گے؟ وہ دنیا کے رَب کی عدالت ہوگی۔ رَبِ کائنات منصف ہوگا۔ سوچیے' آپ کا کیا ہوگا؟ امانت میں خیانت کے مرتکب ہونے والوں کا کیا انجام ہوگا؟ مجھے وہ چیخیں دہلاتی ہیں' میں بے بسی سے ہاتھ ملتا ہوں' مجھے وہ معصوم آنکھیں رلاتی ہیں' وہ ادھڑی لاش...... اُف...... میرے اللہ! آپ لوگ کیسے یہ سب دیکھ کر زندہ ہیں؟ کیسے پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں؟ کیسے چین کی نیند سوتے ہیں؟ کچرا کنڈی میں پڑی لاش' گٹر میں ڈوبی لاش' بوری میں لپٹی لاش' کسی کی بیٹی' کسی کی شہزادی ہے۔

ماں کہا کرتی تھی۔ ''پتر......! بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں تو بے فکر ہو کر ڈیوٹی پر جا۔ تیری دھی سارے گاؤں کی دھی ہے۔''

کیا واقعی میں بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں یا ماں جھوٹ کہتی تھی؟ مجھے جواب ضرور دیں' آپ کے جواب مجھ تک پہنچانے کی ذمہ داری میری ایک اور دھی منزہ سہام کی ہے' وہ مجھے بتائے گی کہ آپ لوگوں نے کیا جواب دیا؟

شہیدِ وطن!

مینا

موچی بابا

الماس روحی کا خیال

انسان کی میت سرِ بازار برہنہ
غیرت کا کفن نامِ خدا مانگ رہی ہے

لوگوں کی جوتیاں سی کر اپنی قسمت رفو کرنے والے ایک موچی کی حقیقی کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''موچی...... موچی...... میرا جوتا سی دو......'' ش'
''اچھا' جوتا ٹوٹ گیا ہے۔''
یا پھر
''موچی بابا...... کہاں ہے میرا جوتا؟''

ایسی بے شمار نظمیں میرے بچپن کا حصہ بنی ہوئی ہیں جن میں موچی کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اتنے سالوں بعد آج بھی جب میں کسی موچی کو دیکھتی ہوں تو یہ نظمیں میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہیں۔

کاندھے پر مختصر سا لکڑی کا بکس اٹھائے جو اندر سے موٹی سوئی دھاگے اور چمڑے کے مختلف رنگوں کے ٹکڑوں سے سجا ہوتا تھا اور گلی گلی' محلے محلے صدا لگاتا موچی بابا......

''چپل سلائی کرالو۔''

گزرتے زمانے کے ساتھ یہ صدا ماضی کا حصہ بنتے ہوئے بس اسٹاپ' چوک کے کنارے یا کسی مسجد کے باہر چھوٹی سی موچی کی کٹیا میں تبدیل ہوگئی ہے۔ موچی کے کام کا انداز تو بدل گیا مگر اس کے حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی' وہ آج بھی غربت کے اسی مقام پر ہے اور اس بات کا انکشاف مجھے سڑک کہانی کی تلاش کے دوران ہوا۔

بڑی سی مسجد کے باہر کونے پر سبز بیلوں اور چٹائی سے بنی چھت کے نیچے بیٹھا' موسم کی سختی جھیلتا جان ولی موچی جانے کتنے برسوں سے لوگوں کی جوتیاں سی کر اپنے مقدر کی پیوندکاری میں مصروف ہے۔ اسے دیکھ کر بازگشت میں مجھے ''موچی آیا' چپل جوتے سلائی کرالو۔'' کی صدا سنائی دینے لگی اور اسی بازگشت نے مجھے اس کی کٹیا کے پاس بیٹھنے پر مجبور کردیا۔

جان ولی جو کہ پشاور شہر کے دیہات کا رہائشی ہے جہاں روزگار میسر نہ ہونے کی بنا پر اسے کراچی جیسے بڑے شہر کا رخ کرنا پڑا مگر یہاں آنے کے بعد بھی اسے خاطر خواہ کام نہ مل سکا۔ تعلیم کی کمی کے باعث وہ موچی کے علاوہ کوئی اور کام کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اس بات کا اقرار کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عیاں ہوتا درد نمایاں ہوگیا تھا۔

''ایک روز میں کتنا کما لیتے ہو آپ؟'' میں سوالات کی زد میں لاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

''تین سو روپے پھر اس میں سامان بھی خرید کر لاتے ہیں جیسے جوتے کا سول' چمڑے کی پٹیاں' وغیرہ اور اگر ہڑتال ہوجائے یا کوئی ہنگامہ تو یہ تین سو روپے بھی مر جاتے ہیں اور اگر مسلسل دو تین دن حالات خراب رہیں تو پھر وقت بہت عذاب میں گزرتا ہے۔ کھانے پینے سے معذور ہوجاتے ہیں' ہوٹل بند ہونے سے چائے تک نصیب نہیں ہوتی۔''

''رہتے کہاں ہیں؟''

''پرانی سبزی منڈی میں تین ہزار دو سو روپے کرایہ پر دس افراد مل کر رہتے ہیں اور مل کر کرایہ ادا کرتے ہیں۔ شام ڈھلے جب واپس ٹھکانے پر جاتے ہیں تو پیسے ملا کر کھانے کا بندوست کرتے ہیں' خود پکاتے ہیں۔ گلشن اقبال سے سبزی منڈی تک کا سفر پیدل طے کرتے ہیں۔ گاؤں میں رقم بھیجنے کے لیے اسی طرح ایک ایک روپیہ بچاتے ہیں۔''

''کتنے پیسے گاؤں بھیجتے ہیں؟''

''چار' پانچ ہزار روپے' دو مہینے کے بعد یا کبھی تین مہینے بعد۔''

''کیا اتنے پیسوں میں تمہارے گھر والوں کا گزارہ ہوجاتا ہے؟''

''غریب کو گزارہ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہر حالت میں' خواہش کرنے کی اسے اجازت نہیں ہوتی باجی......! گاؤں میں گیس نہیں' لکڑی جلاتے ہیں اس لیے گیس کا خرچہ نہیں' بجلی ہے مگر ایک بلب جلانے کی وجہ سے بجلی کا بل کم آتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور یہ کون ہے؟'' میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے سترہ سالہ پٹھان نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو بڑے انہماک سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔

''یہ ہمارا بیٹا ہے بادشاہ زادہ' یہ بھی ادھر آیا ہے ہمارے ساتھ کام کرنے۔''

''کمال کرتے ہو جان ولی' ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے خود کہا تھا کہ تعلیم کی کمی کے باعث تم یہ کام کررہے ہو پھر بھی تم نے اپنے بیٹے کو تعلیم دلانا ضروری نہیں سمجھا؟''

جان ولی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مذاق اور لطیفے تم لوگ پٹھانوں پر بناتے ہو مگر لگتا ہے' تم بھی پٹھان ہو جو ایسا سوال کررہی ہو؟ ساری داستان تمہارے کو سنادی' کیا تم کو معلوم نہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے واسطے بھی پیسے کی ضرورت ہوتی ہے؟ اُدھر دیہات میں دور تک کوئی اسکول نہیں......''

''لالہ...... نسوار کی دو پڑیاں پکڑانا۔''

اور مستعدی سے بادشاہ زادہ نے نسوار کی دو پڑیاں گاہک کو پکڑاتے ہوئے بارہ روپے لے لیے۔

''او شہزادے' میرے جوتے پالش کردو جلدی سے' آفس کو دیر ہورہی ہے۔'' قریب کی بلڈنگ سے نکلتے ہوئے ایک شخص نے موچی کی کٹیا میں کھڑے ہوتے اپنے جوتے اتارتے ہوئے بادشاہ زادہ کو مخاطب کیا اور بادشاہ زادہ کے ہاتھ تیزی سے اس کے پرانے جوتے پر پالش لگا کر برش چلانے میں مصروف ہوگئے۔

''او یار' تیز ہاتھ چلاؤ' دم ہی نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں۔ لالہ...... تمہارا بیٹا بڑا سست ہے' اسے کام سکھاؤ پھر کام پر لگاؤ۔ کام آتا نہیں اور بیٹھ جاتے ہیں نوٹ چھاپنے......'' وہ شخص بڑبڑاتا ہوا جان ولی کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑا کر چلتا بنا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک پندرہ' سولہ برس کا لڑکا کٹیا کی طرف بڑھا۔ ''لالہ...... میرا جوتا تیار ہے؟''

''جی' تیار ہے' کل شام کو ہی تیار ہوگیا تھا' پر آپ آئے ہی نہیں۔'' بادشاہ زادہ جس کا تھوڑی دیر قبل پالش کروانے والے آدمی کی بک بک کی وجہ سے چہرہ اداس ہوگیا تھا' سب کچھ بھول بھال کر دوسرے گاہک سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوتا سامنے رکھ دیا۔ لڑکا جو کاندھے پر بیگ اٹھائے تھا' اسٹوڈنٹ تھا۔ جوتے کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''پکا سول لگایا ہے نا' ایسا نہ ہو کہ دو قدم چل کر جواب دے جائے؟''

''نہیں' نہیں' ایسا نہیں ہوگا' اب تک جتنے بھی چائنا کے بنے جوتے لوگوں نے خریدے ہیں' سب ایک دفعہ استعمال کے بعد ہمارے پاس سول لگانے کے لیے آتے ہیں کیونکہ ان میں پائیداری نہیں ہوتا۔''

''اچھا' اچھا' زیادہ قابلیت مت جھاڑو' اتنے قابل ہوتے تو یہ کام کیوں کرتے؟ کتنے پیسے ہوئے؟''

''جی' سول اور سلائی سمیت ایک سو بیس روپے۔'' بجھے لہجے میں بادشاہ زادہ نے جواب دیا۔ عمر میں اس سے چھوٹا لڑکا بدتمیزی سے بات کرکے چلا گیا تھا محض طبقاتی فرق کی بنا پر گاؤں سے آنے کے بعد روزی کمانے کے لیے اپنی عزتِ نفس کو بھی گاؤں چھوڑ کر آنا ہوگا' یہ بات شاید اسے اس کے باپ جان ولی نے بخوبی سمجھا دی تھی جبھی گاہکوں کی تلخ باتوں کو امرت کی طرح پی کر اپنے کام میں مصروف ہوجاتا تھا۔

''تم لوگ کس دن چھٹی کرتے ہو؟''

"چھٹی کر کے کیا کرے گا بی بی' ادھر کام ویسے ہی مندا رہتا ہے' کبھی کبھی تو ایک دو گاہک کے علاوہ کوئی نہیں آتا پھر وقت بے وقت ہڑتال یا کسی کے سوگ کی وجہ سے کاروبار بند ہو جاتا ہے' پر ہم لوگ جو روز کما کر کھانے والے ہیں' ایسے میں بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"لالہ..... یہ تم نے کیسا میرے بچے کا اسکول بیگ سی کر دیا تھا؟ ابھی ایک ہفتہ گزرا نہیں کہ پھر پھٹ گیا؟" چھوٹے سے بچے کی انگلی تھامے عورت بیگ ہاتھ میں لیے جان ولی پر برس رہی تھی جبکہ بچے کی آنکھیں شرارت سے ناچ رہی تھیں۔

"لائیں باجی' میں سی دیتا ہوں' ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ پر باجی' میں نے جو سلائی لگائی تھی' اس جگہ سے نہیں بلکہ بیگ دوسری جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ میرے ہاتھ کی سلائی تو نہیں پھٹی۔" بیگ ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہی جان ولی نے کہا۔

"چلو' جہاں سے بھی پھٹا ہو' سی دو۔ جب تک میں سودا لے کر آتی ہوں' فوراً سی دو۔ یہ نہ ہو کہ دوسرا کام پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔"

"باجی' یہ جو باجی کے ساتھ بچہ تھا نا' بڑا شرارتی ہے۔ ہر ہفتے اسکول سے بیگ پھاڑ کر لاتا ہے اور اس کی ماں ہر دو مہینے بعد نیا بیگ لے کر دیتی ہے۔" عورت کے جاتے ہی جان ولی نے بتایا۔

"بھئی' یہ تو اس کے بچے کی غلطی ہے' تم پر کیوں غصہ کرتی ہے؟"

"بس جی' لوگوں کو اپنا غصہ کسی پر تو اتارنا ہوتا ہے نا۔"

محنت میں عظمت ہے مگر لگتا ہے' موجودہ نسل اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے جبھی دس روپے میں بوٹ پالش کروانے کے ساتھ موچی کی محنت اور عزت کو بھی اپنے جوتے تلے روند کر چل پڑتے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے محنت کی عظمت جیسے لفظوں کو ایک سو بیس روپے کے جوتے کے سول تلے دبا دیا یا پھر وہ ماں جو اپنے بچے کی غلطیوں کو موچی کے کھاتے میں بیس روپے بیگ کی سلائی کے ساتھ ڈالتے ہوئے اپنا غصہ اتار کر چل پڑتی ہے۔

.....•.....•.....•

اُس روز 26 مارچ بروز منگل تھا۔ شہر کراچی' شہرِ خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یومِ سوگ منایا جا رہا تھا اور غریبوں کے لیے یومِ بھوک یا یومِ فاقہ.....

میری نگاہوں میں جان ولی کا عمر رسیدہ' تفکرات میں گھرا چہرہ اور اس کے بیٹے بادشاہ زادہ کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ آج پھر اُن کی ایک دن کی دیہاڑی سوگ کی نذر ہوگئی۔ ایک دن پھر فاقہ کشی کی نذر ہو گیا ہوگا۔ میرے خیالوں میں' ان کی نگاہوں میں مچلتا سوال زبان تک آ پہنچا۔

"بی بی' سوگ کا مطلب بتا دیں ہمیں' کیا کسی ایک کی موت لاکھوں غریب زندہ افراد کو بے موت مارنا سوگ ہے؟"

کتنے جان ولی' کتنے بادشاہ زادہ جیسے محنت کش جن کا روزگار سڑک سے وابستہ ہے' آج بھوکے پیٹ رہے ہوں گے؟ کیا ان کے دلوں میں اس سوگ کے لیے ہمدردی ہوگی یا پھر.....

یہ معصوم محنت کش پہلے ہی زندگی کا عذاب جھیل رہے ہیں' انہیں اجرت کے علاوہ اپنے لفظوں کے نشتر سے محفوظ رکھیں۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کے فعال کردار ہیں' ان کی عزتِ نفس کو چند ٹکوں کے عوض پامال کرنے سے گریز کریں۔ انہیں بھی باعزت زندگی گزارنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہمیں اور آپ کو۔

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

☆..... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے جس کا گزشتہ انتالیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

☆..... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

☆..... اس میں غیر معیاری، اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

☆..... پوری دنیا میں پھیلے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

☆..... اس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

☆..... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

☆..... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت ان تک پہنچ سکتے ہیں۔

☆..... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات ماہنامہ دوشیزہ کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

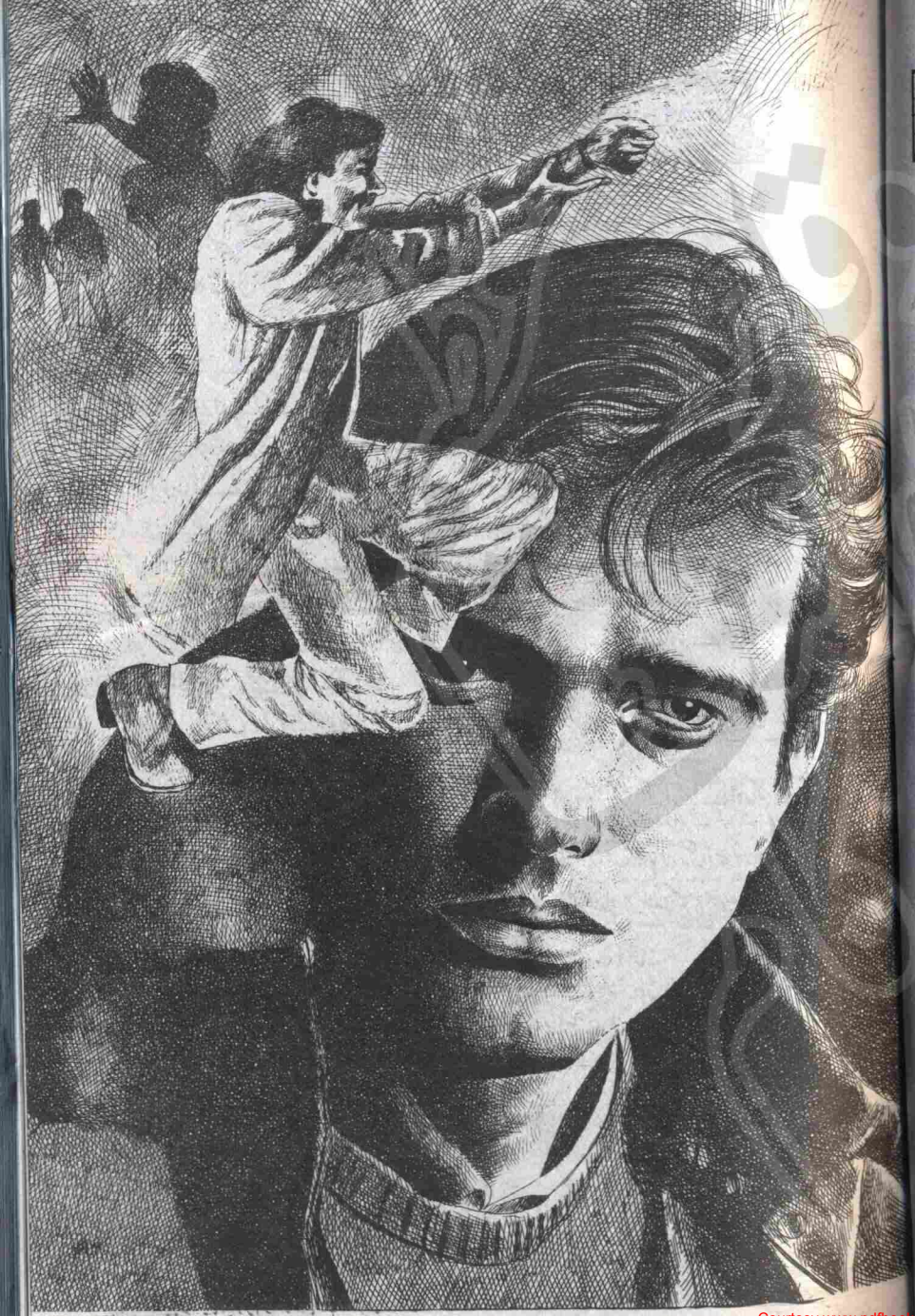

سلسلہ خاص — ایک نامور لکھاری کا تہلکہ خیز سلسلہ، جسے پڑھنے والے مدتوں یاد رکھیں گے

سلیم فاروقی

آتشِ جنوں

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 4

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت منداور اپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے......ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔عمران کا ایک دوست راشد ہے، جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں'اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آجاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔اسی دوران پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ..... یہ..... کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں نے ان کے ساتھ چائے پی ہے؟ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی؟"

"وہ اس صدمے سے مرگئی کہ پولیس اس کے بیٹے کو ایک مرتبہ پھر گرفتار کرنے آئی ہے۔"

"ویری سیڈ....." بیرسٹر صاحب نے کہا پھر بولے۔ "انسپکٹر آپ کو اب اتنی مہلت تو دینا ہی پڑے گی کہ عمران اپنی والدہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوجائے۔"

"ہاں یہ اس کا قانونی حق ہے۔" انسپکٹر نے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے دوسرے بھائیوں کو اطلاع دے دو۔"

گھر کے ملازمین نے انہیں اب تک اطلاع دے دی ہوگی۔" میں نے کہا پھر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس وقت تیمور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "بھیا! مجھے آپ کے دکھ کا اندازہ ہے لیکن برداشت تو آپ کو کرنا پڑے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، میں سارے انتظامات کرلوں گا۔"

"تم ابو کو ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ مجھے ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

ابو کرسی پر بیٹھے تھے، ان کا سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ جوان بیٹی کے بعد اب اُن کی زندگی کی شریک بھی انہیں چھوڑ گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابو امی سے کتنی محبت کرتے تھے۔ وہ امی کی کسی بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ شائستہ کو بھی وہ اتنا ہی چاہتے تھے۔

"ابو.....!" میں نے انہیں آواز دی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے غور سے اُن کا جائزہ لیا۔ سر درد کے باوجود اُن کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

"تیمور.....!" میں نے کہا۔ "ابو کی طبیعت بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، تم پہلے انہیں ہاسپٹل لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" تیمور نے کہا پھر ابو سے بولا۔ "آیئے انکل.....!"

ابو نے کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف چلنے کی کوشش کی پھر وہ لڑکھڑا کر گر پڑے اور گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

میں لپک کر ان کے نزدیک پہنچا اور پھر بولا۔ "ابو.....! آپ....."

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں نے ان کی نبض دیکھی جو بالکل ساکت تھی۔ سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی لیکن وہاں سناٹا تھا۔

میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ "ابو.....! آنکھیں کھولیں ابو.....!" پھر میں تیمور سے بولا۔ "تیمور.....! ابو کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دو اور کسی ڈاکٹر کو بلا لو۔"

تیمور نے ابو کو اٹھا کر ڈرائنگ روم کے صوفے پر لٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد تیمور ڈاکٹر کو بھی لے آیا۔ اس نے ابو کا جائزہ لیا، امی کا معائنہ کیا اور بولا۔ "صبر کریں عمران صاحب.....! دے آر نو مور۔" (They are no more.)

میں دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ میں اچانک یتیم ہوگیا تھا۔

تیمور، امی اور ابو کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف ہوگیا۔ میرا تو ذہن ہی ماؤف ہو رہا تھا۔

اچانک ارسلان آ گیا، اسے شاید گھر کے کسی ملازم یا پھر تیمور نے اطلاع دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عدنان بھی

آ گیا پھر وہ دونوں اس بری طرح روئے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

رات تک امی اور ابو کی تدفین ہوگئی۔ دو جنازے ایک ساتھ گھر سے باہر نکلے تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ مجھے اپنے سر پر پھیلتی ہوئی دھوپ کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے سر سے ماں اور باپ کا سائبان اچانک ہی ہٹ گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ دہاڑیں مار مار کے روؤں لیکن میں، ارسلان اور عدنان کی وجہ سے ضبط کر رہا تھا۔ عدنان پر تو گویا سکتہ ہوگیا تھا۔

عجلت میں، میں نے ابو کے جاننے والوں اور دور و نزدیک کے تمام رشتے داروں کو اطلاع دے ڈالی۔

میں نے اُن لوگوں میں سے کچھ کو یہ کہتے سنا۔ "بے چارے کب تک صدمے برداشت کرتے؟ بیٹی گھر سے بھاگ گئی، بیٹے ہیروئن اور اسلحے کے کاروبار میں اندر ہیں۔ احسن صاحب شریف آدمی تھے۔ اُن سے یہ صدمات برداشت نہ ہوسکے۔"

ایک اور صاحب بولے۔ "بھئی، جب گھر کی عزت ہی چہرے پر کالک مل کر گھر سے فرار ہوجائے تو اُن ماں باپ کا کیا حال ہوگا؟"

"آپ لوگ بکواس بند کریں....." میں نے چیخ کر کہا۔ "اور دفع ہوجائیں یہاں سے....."

"سچی بات ہے، کڑوی تو لگے گی۔" ان صاحب نے منہ بنا کر کہا۔

"اٹھو یہاں سے۔" ارسلان نے کہا۔ وہ میری آواز سن کر وہاں آ گیا تھا۔ "نکلو یہاں سے....." اس نے گریبان پکڑ کر ان صاحب کو اٹھا لیا۔

تیمور نے کہا۔ "ارسلان.....! کیا کر رہے ہو؟ کہنے دو ان لوگوں کو، ان کا کام ہی باتیں بنانا ہے۔"

اس پہ بہت سے 'مہمان' بکتے جھکتے وہاں سے چلے گئے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد سب انسپکٹر ایک دفعہ پھر میرے سر پہ نازل ہوگیا۔ "نواب صاحب....." اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب چلیں۔"

"آپ کھانا کھائیں۔" میں نے کہا۔ "پھر چلتے ہیں۔ تیمور.....! ان لوگوں کو کھانا کھلاؤ۔"

وہ لوگ کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

سب انسپکٹر نے میری ہتھکڑی کھول دی تھی لیکن گھر کے دروازے پر پولیس کا پہرہ تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک عدنان کمرے میں آیا اور بولا۔ "بھیا.....! آپ کے خلاف سازش ہوئی ہے، وہ بیرسٹر بھی پولیس کے ہاتھوں بک گیا ہے....."

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بیرسٹر، سب انسپکٹر سے کہہ رہا تھا کہ اس مرتبہ اس سے ایک کروڑ وصول کرنا۔"

"تاکہ اس لحاظ سے آپ کا حصہ بھی بڑھ جائے؟" سب انسپکٹر مسکرا کر بولا۔

"میرا حصہ تو ففٹی ففٹی کا ہے، میں اس کیس کو ایسا الجھا دوں گا کہ عمران باقی زندگی جیل میں گزارے گا۔"

"یہ باتیں تمہیں کس نے بتائیں؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے خود سنی ہیں بھیا.....!" عدنان نے کہا۔ "میں اُس وقت دوسرے کمرے میں تھا۔ وہاں تیمور بھائی اور ارسلان بھائی بھی موجود نہیں تھے اس لیے وہ کھل کر بول رہے تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم خاموشی سے ارسلان اور تیمور کو یہاں بلالاؤ۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد تیمور اور ارسلان دونوں وہاں آ گئے۔ میں نے اُن دونوں کو بیرسٹر کے بارے میں بتایا تو ارسلان بھی حیران رہ گیا۔

''وہ یو ایس بی کہاں ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''وہ تو میں نے بیرسٹر کو دے دی تھی۔''

''آپ ابھی جا کر اس سے یو ایس بی کے بارے میں پوچھیں۔ وہ اگر پولیس کے ساتھ مل گیا ہے تو ٹال مٹول سے کام لے گا حالانکہ اس کا بریف کیس اس کے پاس ہے اور اس نے وہ یو ایس بی بھی اسی بریف کیس میں رکھی ہوگی۔''

میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو پولیس والے اور بیرسٹر وغیرہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''انکل..... آپ کے پاس وہ یو ایس بی موجود ہے نا؟''

''ہاں، وہ میرے پاس موجود ہے۔'' بیرسٹر نے جواب دیا۔

''آپ ایسا کریں، وہ یو ایس بی مجھے دے دیں، میں اس کی دو تین کاپیاں مزید بنوا کر آپ کو لوٹا دوں گا۔''

''وہ اس وقت تو میرے پاس موجود نہیں ہے۔'' بیرسٹر نے کہا۔

''تو پھر گھر سے لے آئیں یا تیمور کو اپنے ساتھ لے جائیں، وہ اس کی کاپیاں کرا لے گا۔''

''تمہیں ایسی کیا جلدی ہے؟'' بیرسٹر صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ یو ایس بی ہی تو میری بے گناہی کا واحد ثبوت ہے، آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے جلدی کیا ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ابھی اور بھی کام ہیں۔'' بیرسٹر نے جواب دیا۔ ''جب موقع آئے گا تو وہ یو ایس بی عدالت میں پیش کر دوں گا۔''

''میں اصل میں اپنا کیس لیگل ایڈوائزر کو دینا چاہتا ہوں۔ وہ کراچی سے باہر تھے لیکن اب وہ کراچی پہنچ گئے ہیں اور ابھی یہاں آنے والے ہیں۔'' میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

''تو تم وکالت نامہ کینسل کر رہے ہو؟'' بیرسٹر صاحب نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''آپ ایسا ہی سمجھ لیں.....'' میں نے بھی درشت لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر وہ یو ایس بی بھی اب میرے پاس نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو آپ کو دینا پڑے گی۔'' ارسلان نے اچانک بھپر کر کہا۔ ''صاف صاف کہیں کہ آپ بھی پولیس کے ہاتھوں بک گئے ہیں؟''

''ہاں..... میں پولیس کے ہاتھوں بک گیا ہوں۔ اب تم لوگ اپنی خیر مناؤ۔''

ارسلان نے اچانک ریوالور اٹھا لیا اور بولا۔ ''ڈبل کراس کرنے والے کو تو میں کبھی معاف نہیں کرتا.....''

''یہ..... یہ..... تم کیا کر رہے ہو؟'' بیرسٹر ہکلا کر بولا۔

سب انسپکٹر نے اپنا سروس ریوالور اٹھانے کی کوشش کی لیکن تیمور نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

سب انسپکٹر یوں ساکت ہو گیا جیسے سانس لینا بھول گیا ہو۔ دوسرے سپاہیوں کی رائفلیں بھی کچھ فاصلے پر رکھی تھیں۔ وہ سب تو کھانے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔

''تمہارے جو مسلح سنتری گیٹ پر ہیں، انہیں بھی یہاں بلاؤ، وہ بھی کھانا کھا لیں۔'' تیمور نے درشت لہجے میں کہا۔

''یہ..... تم..... اچھا نہیں..... کر رہے ہو؟'' بیرسٹر نے کہا۔

تیمور نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ کرسی سے الٹ کر فرش پہ جا پڑے۔ ''تم نے بہت اچھا کیا ہے ہمارے ساتھ؟'' وہ پھر رک کر بولا۔ ''گھٹیا آدمی..... تو پولیس سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اب پچاس لاکھ کی بجائے ایک کروڑ روپے طلب کرے؟ بول، تو نے کہا تھا یا نہیں؟''

''میں..... نے..... تو.....''

''بکواس مت کرنا۔'' ارسلان نے کہا۔ ''تو جانتا ہے کہ میرا بھائی الیکٹرانک جینئس ہے، اس کمرے میں ایسا سسٹم لگا ہے کہ تم لوگوں کی ساری بات چیت ہم نے سن لی ہے۔''

فرزانہ آغا ماہنامہ دوشیزہ کی وہ مصنفہ جس کے افسانوں کے عنوان بھی بولتے ہیں اور کردار بھی.....

رقصِ طاؤس کے بعد ایک اور افسانوی مجموعہ

کہانی پوچھو تم

منظرِ عام پر آ گیا ہے

کتاب ملنے کا پتہ

علی میاں پبلیکیشنز

20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور

فون: 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت چاروں سنتری اندر داخل ہوئے۔ وہ بھی گیٹ پر کھڑے کھڑے بور ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ارسلان اور تیمور نے اپنے ریوالور چھپا لیے تھے۔ وہ اپنی رائفلیں ایک طرف رکھ کر کھانے کو بیٹھے تو عدنان نے ان کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا پھر تیمور نے باری باری وہاں موجود ہر شخص کو ریوالور کے دستے مار کے بے ہوش کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ''چلو اب نکلیں یہاں سے۔''

''میں نے وہ اسلحہ اور منشیات کی تھیلیاں بھی اٹھا لی ہیں جو پولیس نے برآمد کی تھیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''بس اب یہاں سے نکل لیں۔''

ارسلان نے افضل اور کلک کو بلایا اور ان سے کہا۔ ''تم لوگ ابھی فوراً اپنے اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ جب تک تم سے کہا نہ جائے' واپس مت آنا۔ چوکیدار اس وقت اپنے کوارٹر میں ہے۔ اسے بھی بتا دو۔'' ارسلان نے کئی نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے اور بولا۔ ''یہ آپس میں تقسیم کرو۔''

انہیں روانہ کرنے کے بعد ہم بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں نے جاتے جاتے گھر پر الوداعی نظر ڈالی' نہ جانے پھر مجھے یہاں آنا نصیب بھی ہو یا نہیں' اس گھر میں کھیلتے ہوئے میرا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا اور اب جوانی گزر رہی تھی۔

تیمور نے گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

ارسلان نے ضرورت کا تمام سامان پہلے ہی گاڑی کی ڈگی میں رکھ لیا تھا۔

''میں اس بیرسٹر کو تو نہیں چھوڑوں گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''مجھے اس قسم کے دو غلے اور گھٹیا لوگوں سے شدید نفرت ہے جو اعتبار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اور اپنے لوگوں کو ڈبل کراس کرتے ہیں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر تیمور تھا۔ اس نے گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

''ارسلان.....!'' اس نے کہا۔ ''تم عقب میں نظر رکھو' ممکن ہے' کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں ہو' ویسے پولیس والوں سے اس مستعدی کی امید تو نہیں ہے۔''

''یار' جب ہمارے پاس اس یو ایس بی کی کاپی تھی تو پھر یوں میدان چھوڑ کر بھاگنے کی کیا بات تھی؟''

''یہ آئی ٹی کا دور ہے بھیا!'' عدنان نے کہا۔ ''وہ بیرسٹر اس یو ایس بی میں کچھ ایسی باتیں بھی مکس کر سکتا تھا جس سے وہ تمام گفتگو بے معنی ہو جاتی جو ہم نے ریکارڈ کی ہے۔''

''اس میں گنجائش ہی کب تھی؟'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ تو غیر واضح تھا۔''

''میں آپ کو اسی ریکارڈنگ کی ایڈیٹنگ کر کے اور اس میں مزید کچھ ری مکس کر کے آپ کو سناؤں گا تو آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔''

''یوں بھی جب اتنا بڑا بیرسٹر ہمارے خلاف ہو' پولیس کے بڑے افسران ہمارے دشمن ہوں تو عدالت میں یہ ثبوت ناکافی ہوتا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''پھر ہم عدالتوں کے چکر لگائیں گے یا شائستہ کو تلاش کریں گے؟''

''ہاں' تم تو مری جانے والے تھے؟'' میں نے کہا۔

''میں اسی لیے ایئرپورٹ پہنچا تھا۔ فوری طور پر کوئی فلائٹ نہ مل سکی تھی۔ دو گھنٹے بعد میری فلائٹ تھی۔ میں ٹکٹ کنفرم کرانے جا ہی رہا تھا کہ مجھے افضل کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ امی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالت خراب نہیں ہے بلکہ..... ارسلان کی آنکھوں سے آنسو بہنے

لگے۔ اسے دیکھ کر عدنان بھی رونے لگا۔

میں نے انہیں تسلی دی تو خود میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے پھر بمشکل تمام میں نے خود کو سنبھالا اور ان دونوں کو بھی خاموش کرایا۔

ہم ایک دفعہ پھر اسی بنگلے پر پہنچ گئے جہاں ارسلان مجھے گزشتہ رات لے گیا تھا۔

ہم ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ ارسلان نے کہا۔ ''میں اب مری کے لیے نکل رہا ہوں۔''

''اس وقت تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''پولیس والے لاکھ مست سہی لیکن جب ان پہ خود آنچ آتی ہے تو ایک دم الرٹ ہو جاتے ہیں۔ پولیس نے اب تک ریلوے اسٹیشن' ایئرپورٹ اور کراچی سے باہر جانے والے تمام راستے بلاک کر دیئے ہوں گے۔''

''لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''عبداللہ' سر سے بات کرواور انہیں صورتِ حال بتاؤ۔'' ارسلان نے کہا۔ ''دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؟''

''ہاں' یہی کرنا پڑے گا۔'' اس نے کہا اور جیب سے سیل فون نکال کر نمبر ملانے لگا۔

''آیئے' میں آپ کو یہ بنگلا دکھا دوں۔'' تیمور نے کہا۔

میں اور عدنان اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔

میں نے گزشتہ رات اس بنگلے کا صرف ایک کمرا یا پھر اس کا برآمدہ اور کار پورچ دیکھا تھا۔ بنگلا پرانی طرز کا تھا لیکن بہت بہترین حالت میں تھا۔ اس میں اوپر نیچے چھ بیڈ رومز تھے۔ ایک اسٹڈی روم بھی تھا جو اُس وقت کافی خالی تھا۔ وہاں قریب رکھی ہوئی کرسی اور سٹنگ ٹیبل اور خالی شیلف تھے۔

''تمہیں کمپیوٹر کا شوق ہے نا؟'' تیمور نے ہنس کر عدنان سے پوچھا۔ ''میں تمہیں یہاں بہترین قسم کا کمپیوٹر لگوا دوں گا۔''

''بھیا!'' عدنان نے پوچھا۔ ''میری پڑھائی کا کیا ہو گا؟ میں تو اب اسکول بھی نہیں جا سکتا۔''

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ''تم فکر مت کرو بیٹا!'' میں نے کہا۔ ''تم اسکول جاؤ گے اور ضرور جاؤ گے' یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

عدنان مطمئن ہو گیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے اس سے کوئی وعدہ کیا ہو اور اسے پورا نہ کیا ہو۔

ہماری کمپنی کے جی ایم نورالعارفین صاحب تھے۔ وہ انتہائی محنتی اور ایماندار تھے۔ کمپنی کا زیادہ تر کام تو وہی کرتے تھے۔ میں تو بس کلائنٹس سے میٹنگز کرنے یا پھر ایگریمنٹس پر سائن کرنے کے لیے آفس جایا کرتا تھا۔

امی اور بابا کے انتقال میں وہ بھی موجود تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی؟ وہ صورتِ حرام سب انسپکٹر بھی کچھ شرافت کے موڈ میں تھا' شاید اسے بیرسٹر صاحب نے یقین دلایا ہو گا کہ ہم سے اسے ایک کروڑ روپے کی رقم مل جائے گی۔ اس نے میری ہتھکڑی بھی کھلوا دی تھی۔

نورالعارفین صاحب نے علیحدگی میں مجھ سے پولیس کی موجودگی کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

''تم نے بیرسٹر انصاری سے بات کی؟'' عارفین صاحب نے پوچھا۔ وہ پورے اسٹاف میں واحد آدمی تھے جو مجھے اس انداز میں مخاطب کرتے تھے ورنہ میرے آفس کے کسی آدمی کی جرأت نہیں تھی کہ میرے سامنے اونچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز میں بات بھی کرے۔ ڈسپلن کے معاملے میں تو میں کوئی کمپرومائز کرتا ہی نہیں تھا۔

''وہ پاکستان میں نہیں تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال ارسلان نے دوسرے بیرسٹر کو ہائر کرلیا ہے۔''

''ویسے انصاری صاحب آج ہی واپس آئے ہیں' تم ان سے بھی بات کرلو تو بہتر ہے۔''

اسی وقت سب انسپکٹر وہاں آ گیا' نورالعارفین صاحب میرے پاس سے اٹھ گئے پھر ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

میں نے اپنا سیل فون نکالا اور نورالعارفین صاحب کا نمبر ملایا۔

وہ میری آواز سنتے ہی بولے۔ ''عمران بیٹا! تم کہاں ہو؟ پولیس والے کئی دفعہ آفس کا چکر لگا چکے ہیں۔ لوگوں کا رویہ خاصا ہتک آمیز تھا۔ میں نے بیرسٹر انصاری صاحب کو بلا لیا۔ پولیس والے تو تم پہ بہت سنگین الزامات لگا رہے ہیں۔''

''وہ سب بکواس ہے انکل.....!'' میں نے کہا۔

''تم ایسا کرو' بیرسٹر انصاری صاحب سے مل کر انہیں تمام صورتِ حال تفصیل سے بتا دو۔ وہ اس معاملے کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرلیں گے۔''

''جی انکل' میں ان سے ابھی بات کرتا ہوں۔ آپ سے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ میری عدم موجودگی میں آفس کا نظام بگڑنے نہ پائے۔ دو تین اہم میٹنگز تھیں۔ اگر میں نہ آسکوں تو وہ بھی آپ اٹینڈ کر لیجیے گا۔''

''آفس کی فکر تم مت کرو۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم اپنا خیال رکھو اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

ان سے رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے بیرسٹر انصاری صاحب کا نمبر ملا لیا۔ انہوں نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی اور پرتشویش لہجے میں بولے۔ ''عمران.....! تم لوگ کہاں ہو؟ پولیس نے تمہارے پورے گھر کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ فوراً مجھ سے ملو۔''

''بیرسٹر صاحب' اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہاں آ جائیں۔ میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔ اس وقت میرا آنا ممکن نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے' تم گاڑی بھیجو' میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس وقت ارسلان یا عدنان کا بھیجنا مناسب نہیں تھا۔ تیمور بھی پولیس کی نظروں میں تھا۔ میں نے اپنے اس مسئلے کا تذکرہ ارسلان سے کیا تو تیمور نے کہا۔ ''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' پولیس مجھے کیوں پکڑے گی؟ میں وہاں موجود مہمانوں میں سے ایک تھا۔ آپ فکر مت کریں' میں بیرسٹر صاحب کو ابھی لے کر آتا ہوں۔ آپ مجھے ان کا ایڈریس تو دیں۔''

''لیکن تیمور.....''

''اگر ہم اسی طرح ڈرتے رہے بھیا' تو پھر دشمن ہمیں پیروں تلے روند ڈالیں گے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ مجھے بیرسٹر صاحب کا ایڈریس اور سیل نمبر دے دیں۔''

اس کے اصرار پر میں نے اسے بیرسٹر عقیل انصاری کا ایڈریس اور سیل نمبر دے دیا۔

وہ گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گیا۔

.....•.....•.....•

''میں اس بخاری کی شہرت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔'' بیرسٹر انصاری صاحب نے کہا۔ ''وہ وکیل سے زیادہ بلیک میلر ہے اور اپنے کلائنٹس تک کو بلیک میل کرنے سے باز نہیں آتا۔ وہ یو ایس بی اسے نہیں دینا چاہیے تھی۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔ تیمور انہیں کچھ دیر پہلے ہی لے کر آیا تھا۔

''لیکن اس کی ایک کاپی ہمارے پاس بھی تو موجود ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ اس یو ایس بی میں ایڈیٹنگ کر کے کچھ بھی ترمیم و اضافہ کر سکتے ہے۔ اس میں آواز تو اس سب انسپکٹر اور بیرسٹر بخاری کی ہے۔ کورٹ میں جب وہ ریکارڈ شدہ آوازیں سنائی جائیں گی تو مجسٹریٹ بھی کنفیوز ہو جائے گا کہ وہ کس ریکارڈنگ کو درست سمجھے؟ بہرحال میں کچھ کرتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور اپنے بریف کیس سے وکالت نامے کا فارم نکال کر مجھ سے بولے۔ ''پہلے تم اس پر سائن تو کرو۔''

''اگر وہ یو ایس بی اس بلیک میلر بیرسٹر سے واپس لے لی جائے تو؟'' تیمور نے کہا۔

''وہ اسے اتنی آسانی سے واپس نہیں دے گا۔ وہ اپنا لاکھوں روپے کا نقصان کیوں کرے گا؟''

بیرسٹر صاحب کچھ دیر بیٹھ کر روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

''آیئے' میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' تیمور نے کہا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ارسلان کے سیل فون کی بیل بجی تو اس نے چونک کر سامنے رکھا ہوا سیل فون اٹھا لیا پھر اسکرین پر نظر ڈالتے ہی بولا۔ ''عبداللہ کی کال آ رہی ہے۔'' اس نے کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگایا اور بولا۔ ''ہیلو..... ہاں' میں ابھی تک کراچی سے نکل نہیں سکا ہوں..... تیمور نے آپ کو بتایا ہوگا کہ..... جی ہاں..... میں بائی روڈ جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اچھا چلیے' یہ بھی اچھا ہوا' میری بہن کے بارے میں..... جی' میں سمجھ گیا۔ شکریہ..... خدا حافظ!'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں اس کی یکطرفہ گفتگو سے بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''عبداللہ کہہ رہا ہے کہ اب ہمیں مری جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مشہدی خود کراچی آ رہا ہے' اب ہم اس سے یہیں بات کرلیں گے۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''شائستہ کے بارے میں وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''شائستہ بالکل خیریت سے ہے۔ آج وہ لوگ کسی وقت ٹیلی فون پر اس سے ہماری بات بھی کرا دیں گے۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے سیل فون جیب سے نکال کر اسکرین پر نام دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''ہیلو.....'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''تم لوگ سمجھتے ہو کہ تم زیادہ دیر تک ہماری نظروں سے چھپے رہو گے؟'' دوسری طرف سے کوئی بھاری آواز اور درشت لہجے میں بولا۔ وہ انگلش میں بات کر رہا تھا لیکن لب و لہجے سے ایشیائی لگ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کون بول رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا باپ....." اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں مشہدی بول رہا ہوں۔ مجھے امید ہے آئندہ تم میری آواز نہیں بھولو گے۔"

"تم اتنے ہی بہادر ہو جتنا ظاہر کرتے ہو تو پھر سامنے آ کر بات کرو۔ تم تو اتنے بزدل ہو کہ کمزور اور معصوم لڑکیوں کو اغوا کرتے ہو۔ میرے سامنے آ جاؤ تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن دبوچوں گا۔"

"تم نے تو بہت بہادری کا کام کیا ہے نا؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو اگر میری ڈولی کو ایک خراش بھی آئی تو میں تمہارے پورے شہر کو خون میں نہلا دوں گا۔"

"ٹیلی فون پر اس قسم کی بکواس اور دھمکیاں تو بچے بھی دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تم بھی سن لو اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو تمہاری بیٹی کو ایسی موت ماروں گا کہ تم سب بدمعاشی بھول جاؤ گے۔"

جواب میں مجھے مشہدی کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ "پہلے تم اپنی پولیس سے تو نمٹ لو۔ ایک بات اور سن لو بیرسٹر خالد بخاری کو بھی میں نے ہی خریدا ہے ورنہ وہ تو تم لوگوں کو صاف بچا لیتا۔"

"بھاڑ میں گیا خالد بخاری....." میں چیخ کر بولا۔ "اگر تم نے آج شائستہ سے میری بات نہ کرائی تو....."

"تمہاری بات بھی کرا دوں گا ابھی تک تو میں نے اسے بہت آرام سے رکھا ہے اور تم لوگ اپنی اس عارضی جیت پر خوشیاں مت مناؤ۔ میں ڈولی کو زیادہ دیر تم لوگوں کے قبضے میں نہیں رہنے دوں گا۔ ہاں ایک بات اور شائستہ کی زندگی چاہیے تو تم اپنے بھائی سمیت خود کو میرے حوالے کر دو۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ارسلان کو اس گفتگو سے آگاہ کیا تو وہ غصے میں کھول اٹھا۔

اسی وقت مجھے بیرونی گیٹ کھلنے اور کسی گاڑی کے اندر داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ غالباً تیمور بیرسٹر انصاری صاحب کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ خاصے زوردار انداز میں کھلا اور کوئی شخص میرے قدموں میں آ گرا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ارسلان نے بلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیا۔

اچانک تیمور کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس دوران میں ارسلان لات مار کے اوندھے منہ گرے ہوئے شخص کو سیدھا کر رہا تھا۔

میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ وہ بیرسٹر بخاری تھا۔ اس کے ہونٹوں اور سر سے خون بہہ کر اس کی ٹھوڑی اور چہرے پر جم گیا تھا۔

"یہی ہے نا وہ کمینہ؟" تیمور نے کہا۔ "اس نے ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب میں اس کے جسم ہی کو کراس کر کے ڈبل کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے لات مار کے بیرسٹر بخاری سے کہا۔ "کھڑا ہو جاؤ زخمی نہیں ہے کہ یوں مُردوں کی طرح پڑا ہوا ہے۔"

بیرسٹر بخاری آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تب مجھے احساس ہوا کہ اس کا ایک ہاتھ بھی بے جان انداز میں پہلو میں جھول رہا ہے۔ اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ "مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔"

"تجھے تو میں سسکا سسکا کر ماروں گا۔" ارسلان نے کہا۔ "بتا تو نے یہ حرکت کیوں کی؟"

"یہ سب تو پولیس کو اپنے جال میں پھنسانے کی ترکیب تھی۔" اس نے کہا۔ "تم لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی۔

میں تو خود تم سے رابطہ کر کے اپنا پلان بتانا چاہتا تھا۔"

اس مرتبہ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ ساتھ والی دیوار سے ٹکرا کر پھر فرش پر گر گیا۔ "گھٹیا آدمی..... تو ابھی تک جھوٹ بولنے سے باز نہیں آیا؟ تو یہ بتا مشہدی نے تجھے کتنی رقم دی تھی؟"

مشہدی کے نام پر تیمور نے چونک کر مجھے دیکھا۔ بیرسٹر بخاری کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن تھوک نگل کر رہ گیا۔

"ارسلان.....! اسے پانی پلاؤ۔" میں نے کہا۔

ارسلان نے ٹیبل پہ رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی بھرا اور بیرسٹر کو دے دیا۔ اس نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

میں نے تیمور کو مشہدی کے ٹیلی فون کے بارے میں بتایا لیکن اسے تفصیل نہیں بتائی۔

"اب تو تجھے زندہ چھوڑنا ممکن ہی نہیں ہے۔" تیمور نے کہا۔

"لیکن تیری جان صرف ایک صورت میں بچ سکتی ہے تو وہ یوایس بی ہمارے حوالے کر دے۔"

"وہ یوایس بی تو اس وقت میرے گھر میں ہے اس کے لیے مجھے گھر جانا پڑے گا۔" بیرسٹر نے کہا۔

"تو مجھے بتا دے کہ یوایس بی کہاں رکھی ہے؟" تیمور نے کہا۔ "میں خود اسے لے آؤں گا۔"

"وہ تم میں سے کسی کو بھی نہیں ملے گی۔"

"سیدھی طرح بتا دے ذلیل آدمی....." ارسلان نے کہا۔

"ورنہ یہ مت بھول کہ تیرے گھر میں دو جوان بیٹیاں بھی موجود ہیں۔ مجھے یوایس بی نہ ملی تو میں انہیں لے آؤں گا۔" تیمور نے کہا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" بیرسٹر جلدی سے بولا۔

"میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔" تیمور نے کہا۔ "لیکن تو نے ہٹ دھرمی دکھائی تو مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔"

"وہ یوایس بی میرے کمرے کے سیف میں موجود ہے۔" بیرسٹر نے کہا۔ "سیف کی چابی میں نے اپنی الماری کے ایک خفیہ خانے میں رکھی ہے۔"

"اب یہ بھی بتا دے کہ وہ خفیہ خانہ الماری میں کہاں ہے؟"

"الماری کی سب سے اوپری والی دراز کھولو گے تو میری فائلیں نظر آئیں گی۔ ان فائلوں کے پیچھے ایک پش بٹن لگا ہے تم وہ پش بٹن دباؤ گے تو خفیہ خانہ کھل جائے گا اور تمہیں سیف کی چابی مل جائے گی۔"

"بیرسٹر صاحب....." تیمور نے کہا۔ "ایک بات بتا دوں میں وہ خانہ خود نہیں کھولوں گا بلکہ تمہاری بڑی بیٹی سے کھلواؤں گا۔"

"نہیں....." بیرسٹر مضطرب ہو کر بولا۔ "یہ مت کرنا....."

"کیوں؟" تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میری بیٹی کو اس معاملے میں انوالو مت کرو....."

"تو پھر تمہارا بیٹا یہ کام کرے گا۔" تیمور نے کہا۔

"نہیں....." وہ پھر چیخ کر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو اب بھی اپنے گھٹیا پن سے باز نہیں آیا....." تیمور نے کہا۔ "بتا' کیا ہے اس الماری میں؟"

"وہ خانہ موت کا خانہ ہے....." بیرسٹر نے کہا۔ "کوئی جوں ہی وہ بٹن پش کرے گا' خانہ کھلتے ہی اس پوشیدہ پسٹل سے اس پہ گولیاں چلیں گی اور خانہ کھولنے والا وہیں مر جائے گا....."

تیمور نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور رسید کیا اور بولا۔ "میں نے اس سے پہلے بھی تجھ جیسے لوگ دیکھے ہیں' اب شرافت سے بتا دے کہ وہ یو ایس بی کہاں ہے ورنہ تیرے گھر کے کسی فرد کو مرنے کے لیے خانہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ کام تو میرا ماوزر بھی کر سکتا ہے۔ میں تیرے پورے خاندان کو موت کی نیند سلا دوں گا....."

"وہ..... وہ..... یو ایس بی..... ابھی میرے بریف کیس میں ہی ہے۔"

"اور جب میں تجھے لے کر آیا تھا تو تیرا بریف کیس بھی لے آیا تھا۔ تجھے تو اس وقت ہوش نہیں تھا؟"

"تت..... تم..... میرا بریف کیس لے آئے.....؟ اس میں تو....."

"نوٹوں کی گڈیاں بھی ہیں؟" تیمور نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"ہاں' وہ رقم میں نے اپنے ایک کلائنٹ سے لی تھی۔"

"ارسلان.....!" تیمور نے کہا۔ "گاڑی میں سے بیرسٹر صاحب کا بریف کیس لے آؤ۔"

بیرسٹر کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس کی زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم اس یو ایس بی کے لیے یہاں لائے تھے نا؟" وہ کچھ توقف کے بعد تھوک نگل کر بولا۔ "وہ یو ایس بی اور نوٹوں کا بریف کیس لے لو اور مجھے جانے دو۔"

"زندہ؟" تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ملزم بیرسٹر خالد بخاری' میری عدالت تمہیں سزائے موت سنا چکی ہے۔ اب تمہیں اپیل کا حق صرف اللہ سے ہے۔ اگر تمہاری زندگی باقی ہوئی تو تمہاری رحم کی اپیل قبول ہو جائے گی۔"

"نہیں..... تم لوگ..... مجھے نہیں مار سکتے..... مجھے مار کے اب تمہیں کیا ملے گا؟"

"کبھی کسی ملزم نے بھی یہ سوال کسی جج سے کیا ہے کہ مجھے پھانسی پر چڑھا کر تمہیں کیا ملے گا؟ مجھے کچھ نہیں ملے گا بلکہ تجھے سزا ملے گی۔"

"عمران بیٹا! تم....."

تیمور کے تھپڑ سے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ "عمران بیٹا!" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اب عمران بیٹا ہوگا ورنہ اس بیٹے کو تو جیل میں سڑانے کی تیاری کر رہا تھا؟"

ارسلان کمرے میں بیرسٹر کا بریف کیس لے کر داخل ہوا۔ وہ خاصا قیمتی اور دبیز بریف کیس تھا۔ عام افسران اتنے بھاری اور بڑے بریف کیس نہیں رکھتے لیکن وکیل زیادہ فائلوں اور کاغذات کی وجہ سے ایسے بریف کیس رکھتے ہیں۔

تیمور نے بریف کیس کھولا تو اس میں کچھ فائلیں اور کاغذات تھے۔ ان فائلز کے نیچے ہزار ہزار اور پانچ پانچ ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ تیمور نے وہ سارے نوٹ فرش پہ الٹ دیئے۔ ان کے نیچے چھوٹا سا ایک خانہ اور بھی تھا جس میں دو تین ڈی وی ڈیز اور وہ یو ایس بی بھی رکھی تھی جو بیرسٹر نے عدنان سے لی تھی۔

تیمور نے وہ یو ایس بی میرے حوالے کی اور ڈی وی ڈیز اور فائلیں اور نوٹ دوبارہ بریف کیس میں بھرنے

اسے ارسلان کے حوالے کر دیا پھر بیرسٹر سے بولا۔ "چلو' میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

"میں..... خود..... چلا جاؤں گا۔" بیرسٹر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تاکہ تم یہاں کا راستہ ذہن نشین کر لو۔" تیمور نے کہا۔ "میں تمہیں بے ہوشی کی حالت میں لایا تھا اور اب آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤں گا تاکہ تمہیں اس گھر کا پتا کبھی نہ مل سکے۔"

"چلو' جو تم چاہتے ہو' وہ کرو۔" بیرسٹر کے لہجے میں اب کچھ اطمینان تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ تیمور اسے زندہ چھوڑ دے گا ورنہ آنکھوں پر پٹی کیوں باندھتا؟ مجھے بھی اطمینان ہو گیا کہ اب تیمور اس کی جان نہیں لے گا۔

تیمور نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی تک لے گیا۔ اسے گاڑی میں دھکیلنے کے بعد تیمور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور جانے ہی والا تھا کہ میں نے کہا۔ "ٹھہرو تیمور' میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"آپ؟..... آپ میرے ساتھ جا کر کیا کریں گے؟" تیمور نے کہا۔ "میں تو اسے گھر کے نزدیک کسی ایسی جگہ چھوڑوں گا جہاں سے یہ با آسانی گھر تک پہنچ جائے۔"

میرا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی چوکیدار نے مین گیٹ کھول دیا۔

تیمور نے بہت تیز رفتاری سے گاڑی ریورس میں نکالی اور برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

"ارسلان.....!" میں نے تیمور کے جانے کے بعد کہا۔ "ذرا یہ یو ایس بی چلا کر سنو۔"

ارسلان نے یو ایس بی کا بٹن دبا کر اسے آن کر دیا۔ اس میں وہی گفتگو تھی جو میرے اور سب انسپکٹر کے درمیان ہوئی تھی۔

"انکل انصاری کو بتا دیں کہ یو ایس بی ہمیں واپس مل گئی ہے۔" ارسلان نے کہا۔

"اتنی جلدی مت کرو۔" میں نے کہا۔ "مجھے کوئی معقول بہانہ سوچنے دو۔ وہ تیمور کی اس حرکت کو پسند نہیں کریں گے۔" پھر میں نے ارسلان سے کہا۔ "یار' تم لوگ کیا کھانا وغیرہ نہیں کھاتے ہو؟"

"کھانا موجود ہے۔" ارسلان ہنس کر بولا۔ "تیمور واپس آ جائے تو کھائیں گے۔ ویسے آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے تو آپ کھا لیں۔"

"نہیں' میں بھی تیمور کا انتظار کروں گا۔ وہ عدنان....."

"وہ جلدی کھانے کا عادی ہے۔" ارسلان نے کہا۔ "میں نے اسے کھانا کھلا دیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے کمپیوٹر میں لگا ہوگا۔"

میں کافی پینا چاہ رہا تھا لیکن ارسلان نے کہا کہ اس سے آپ کی بھوک ختم ہو جائے گی۔ کھانے کے بعد ہی کافی پئیں گے۔

ارسلان پورے چالیس منٹ بعد لوٹا۔ میری نظریں اسی وقت سے گھڑی پر تھیں جب وہ گیا تھا۔

اس کی واپسی پر میں نے سکھ کا سانس لیا اور اس سے پوچھا۔ "راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ پولیس کی کوئی پیٹرولنگ وین تو نہیں ملی؟"

"نہیں بھیا' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے بیرسٹر کو کلفٹن کے علاقے میں چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سے اسے کوئی ٹیکسی یا رکشا مل ہی جائے گا۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ارسلان.....! کھانا کھا لو یار' مجھے بہت شدید بھوک لگی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے ہم تینوں موجودہ حالات پر غور کرتے رہے۔ ارسلان نے کہا۔ ''میرا ہے کہ صبح ہم اپنے گھر چلیں۔ اب تو یو ایس بی بھی مل چکی ہے۔''

''پہلے میں انکل انصاری سے مشورہ کروں گا۔'' میں نے کہا۔

پھر ہم لوگ سونے کے لیے اٹھ گئے۔

میں گہری نیند میں تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اندھیرے میں نمبر دیکھے بغیر سیل اٹھا کر کان سے لگالیا اور بولا۔ ''ہیلو.....''

''مجھے بے آرام کر کے تم چین کی نیند سو رہے ہو؟'' دوسری طرف سے مشہدی کی آواز آئی۔ ''تمہارے آدمی کی طرف سے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے دھمکی ملی ہے کہ ابھی فوراً شائستہ کی بات اس کے بھائیوں سے کرا مشہدی آج تک کسی کے دباؤ میں نہیں آیا لیکن اولاد کی قیمت میں یہ سب کچھ بھی سہنا پڑ رہا ہے۔ ویسے تمہاری ذہانت کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک ترین آدمیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ میری بیٹیاں میں پڑھتی ہیں۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ وہ امریکا کے کسی اسکول میں ہیں۔''

میں اس دوران میں ارسلان کے کمرے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا میں نے دروازہ کھولا تو وہ پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

''تم فالتو باتیں ہی کرتے رہو گے یا شائستہ سے میری بات بھی کراؤ گے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا

''مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔'' وہ پھر کر بولا۔ ''لو اپنی بہن سے بات کرو۔''

دوسرے ہی لمحے سیل فون پر شائستہ کی آواز سنائی دی۔ ''بھیا!.....'' وہ اتنا کہہ کر سسکنے لگی۔

میں نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔

''رومت گڑیا.....!'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''ان لوگوں نے تجھے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟''

''پہلے تو یہ لوگ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے لیکن کل سے یہ لوگ ہر طرح سے میرا خیال رہے ہیں۔''

''بس تو فکر مت کر گڑیا.....! ہم بہت جلد تجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔''

''شائستہ.....!'' ارسلان نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو بالکل پریشان مت ہو گڑیا.....! ابھی تیرے بھائی زندہ ہیں۔''

''ارسلان بھیا.....! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' شائستہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''ہاں، ہم سب ٹھیک ہیں۔''

''ابو اور امی کیسے ہیں؟'' شائستہ نے اچانک پوچھا۔

میرے دل پہ ایک گھونسہ سا لگا۔ اُس بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ امی ابو ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے ہیں

''وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔''

''میری اُن سے بات کرائیے۔''

''بس کرو۔'' دوسری طرف سے مشہدی کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں نے اپنا پورا کر دیا عمران.....! اب میری بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہماری آوازیں سن کر تیمور بھی اٹھ گیا تھا۔ وہ بھی ارسلان کے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی مشہدی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ اس نے آج شائستہ سے ہماری بات بھی کرائی ہے۔

''وہ خیریت سے تو ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہاں، وہ بالکل خیریت سے ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ پہلے تو وہ لوگ سختی کر رہے تھے لیکن کل سے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہے ہیں۔''

عبداللہ نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے آج تمہاری بات شائستہ سے نہیں کرائی تو اس کی بیٹی کے حق میں بہت برا ہوگا۔''

''مجھے عبداللہ کا سیل نمبر دو۔'' میں نے کہا۔ ''میں خود اس کا شکریہ ادا کروں گا۔''

''اس وقت تو رات بہت ہو گئی ہے بھیا!'' ارسلان نے کہا۔ ''صبح میں خود اس سے بات کر لوں گا۔''

میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا اور لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ شائستہ بہ خیریت ہے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ میں نے سوچا، اب نہانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے زخم کافی حد تک ٹھیک ہو گئے تھے۔ میں ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں پابندی سے کھا رہا تھا۔

میں نے گرم پانی سے شاور لیا تو مجھ میں گویا توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ارسلان اور تیمور نے بتایا کہ وہ لوگ ناشتا کر چکے ہیں۔ میں ڈائننگ روم میں جانے کی بجائے لاؤنج میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ میں نے خبریں دیکھنے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ اس نیوز چینل پر اشتہارات چل رہے تھے۔ مجھے ساڑھے نو بجے کے نیوز بلیٹن کا انتظار تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ پولیس ہم لوگوں کے سلسلے میں کیا کر رہی ہے؟

اچانک نیوز بلیٹن شروع ہو گیا۔

ابتدائی خبروں کے بعد نیوز کاسٹر نے اچانک کہا۔ ''ملک کے معروف بیرسٹر خالد بخاری کو نامعلوم افراد نے قتل کر کے ان کی لاش سرجانی ٹاؤن کے ایک غیر آباد علاقے میں پھینک دی۔

علاقہ مکینوں نے اس کی اطلاع پولیس کو دی۔ پولیس کے پہنچنے پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ لاش بیرسٹر خالد بخاری کی ہے۔''

اس خبر کے آتے ہی وکلاء نے حکومت کے خلاف احتجاجی نعرے لگائے۔ مرحوم بیرسٹر بخاری کراچی بار کونسل کے جوائنٹ سیکریٹری تھے۔

میں نے گھور کر تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا پھر اس نے وہاں سے جانا چاہا لیکن میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''ٹھہرو تیمور.....!'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہ حرکت کیوں کی؟''

''تو کیا میں اسے زندہ چھوڑ دیتا؟'' تیمور نے دبے لہجے میں کہا۔

''کیا یہ کافی نہیں تھا کہ ہم نے اس سے یو ایس بی حاصل کر لی تھی اور اس پہ خاصہ تشدد بھی کیا تھا؟''

''یہ کافی نہیں تھا بھیا.....!'' ارسلان نے کہا۔ ''پہلے تو وہ پیسے کے لیے ہمیں ڈبل کراس کر رہا تھا۔ اب اپنی ہتک اور شکست کا بدلہ لینے کے لیے نہ جانے کیا کرتا۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا وکیل نہیں تھا بلکہ ملک کا معروف بیرسٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔اس نے دوسال پہلے ایک سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا تھا۔"

"لیکن اس کے قتل کا شبہ تو پولیس مجھ پہ کرے گی؟" میں نے کہا۔

"پولیس شبہ کرتی رہے۔" ارسلان نے کہا۔"وہ ہمارا وکیل تھا۔ابھی تو پولیس نے ہمارے خلاف کوئی کمپلین ایف آئی آر بھی درج نہیں کی ہوگی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" تیمور نے کہا۔

"ابھی تو اس بیرسٹر کو ایس پی کی ریکارڈنگ میں ردوبدل کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔وہ کہیں سے جو رقم لایا تھا وہ بھی اسی طرح بریف کیس میں رکھی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔"شاید وہ اسی وقت گھر پہنچا ہوگا جب تم موت کا فرشتہ بن کر اس کے سر پہ نازل ہوگئے۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس بیرسٹر کو تم اتنی آسانی سے کیسے لے آئے؟" ارسلان نے تیمور سے پوچھا۔

"آسان تو کوئی کام نہیں ہوتا۔" تیمور نے ہنس کر کہا۔"میں وہاں اکیلا نہیں گیا تھا بلکہ دو لڑکوں کے ساتھ گیا تھا۔اس کے گیٹ پر ایک چوکیدار تھا جسے ہم نے بہت آسانی سے بے ہوش کر دیا۔اس کے پاس رائفل بھی تھی لیکن اس بے چارے کو اپنی رائفل سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ہمارے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے پھر دو افراد نے اس کی دونوں بیٹیوں' بیٹے اور بیوی کو گن پوائنٹ پر لیا اور میں بیرسٹر کے سر پہ جا پہنچا۔اس نے اس وقت تک صرف کوٹ ہی اتارا تھا۔میں سمجھ گیا کہ یہ ابھی ابھی کہیں سے آیا ہے۔اس کی تصدیق میں اس کی گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ لگا کر بھی کر چکا تھا' وہ گرم ہو رہا تھا۔میں نے اسے بے ہوش کیا' اسے اٹھایا اور اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔میرے ساتھیوں میں سے ایک نے اس کا بریف کیس بھی اٹھا لیا پھر ہم بہت اطمینان کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔اسکرین پر بیرسٹر انصاری صاحب کا نام تھا۔میں نے چند لمحے توقف کیا پھر سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا اور بولا۔"السلام علیکم! انکل!"

"وعلیکم السلام!" انہوں نے جواب دیا پھر بولے۔"عمران! تم نے وہ خبر سنی؟"

"کون سی خبر انکل؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"بیرسٹر بخاری کے بارے میں؟" انہوں نے کہا۔

"انکل! رات کو ہم لوگ بہت دیر تک جاگتے رہے تھے اس لیے میں ابھی ابھی سو کر اٹھا ہوں۔میں نے ابھی تک اخبار دیکھا ہے نہ ٹی وی۔کیا بیرسٹر بخاری نے ہمارے خلاف کوئی اور کیس بنا دیا؟"

"نہیں' وہ اب کسی بھی قسم کا کیس بنانے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔کل رات اسے کچھ نامعلوم افراد نے گھر سے اغوا کیا اور قتل کر کے سرجانی ٹاؤن کے علاقے میں پھینک دیا۔"

"ارے....." میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"پولیس کا خیال ہے کہ یہ حرکت اس کے کسی ایسے کلائنٹ نے کی ہے جس کا کیس ہار گیا ہوگا یا پھر ان لوگوں نے اسے قتل کیا ہوگا جن کے کسی عزیز کو اس نے سزا دلوائی ہوگی۔پولیس ابھی تحقیقات کر رہی ہے۔اس کے گھر والوں کا کہنا یہ ہے کہ اغوا کرنے والے شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور لمبے تڑنگے تھے۔ان کے چہروں پر نقاب تھے۔چوکیدار کا بیان یہ ہے کہ اس کے سر پر پشت سے کسی نے وار کیا تھا اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔اس نے تو حملہ

آور کی شکل بھی نہیں دیکھی۔پولیس نے اس کے چوکیدار اور گھریلو ملازم کو گرفتار کر لیا ہے اور ان سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

"انکل.....! یہ خبر تو اچھی نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے تو یہ اچھی ہے اخمق....." بیرسٹر صاحب ہنس کر بولے۔"اب وہ تمہارے خلاف تو کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا۔تم لوگ اب گھر چلے جاؤ۔اب پولیس سے میں نمٹ لوں گا۔"

ہم لوگ اس وقت اپنے گھر روانہ ہوگئے۔میں نے گھر کے تینوں ملازموں کو روانہ کر دیا تھا۔صرف ایک چوکیدار باقی تھا۔

وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوگیا اور بولا۔"اچھا ہوا آپ لوگ آ گیا صاب!"

"کیوں' کوئی خاص بات؟"

"پولیس والے دو دفعہ چکر لگا چکے ہیں۔وہ آپ لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔میں نے انہیں بتایا کہ صاحب لوگ شاید حیدرآباد یا سکھر گئے ہیں۔ان کے کسی عزیز کی شادی ہے۔"

"اب پولیس والے آئیں تو انہیں اندر مت گھسنے دینا۔" میں نے کہا۔

"صاب! وہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ کرتے ہو۔انہوں نے گھر میں سے کچھ اسلحہ اور ہیروئن برآمد بھی کی تھی۔وہ ابھی پھر آئیں گے۔"

"تم فکر مت کرو' میں ان سے نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں پولیس نے مزید اسلحہ اور منشیات کہیں چھپا نہ دی ہو۔ان لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔میں نے چوکیدار سے پوچھا۔"پولیس والے ہمارے بعد گھر کے اندر گئے تھے؟"

"ہاں صاب!" اس نے جواب دیا۔"وہ لوگ آپ کی تلاش میں اندر بھی گئے تھے۔"

میں نے ارسلان اور تیمور سے کہا۔"تم لوگ فوراً پورے گھر کی تلاشی لے لو' خاص طور پر اسٹور' الماریاں' کچن اور برآمدے کے نیچے دیکھ لو۔عدنان کو بھی اپنے ساتھ لگا لو۔میں بھی تلاشی لیتا ہوں۔پولیس والے بعد میں بھی تو یہاں کچھ چھپا سکتے ہیں۔"

گھر کے اندر قدم رکھتے ہی مجھے دھچکہ سا لگا تھا۔گھر کا پورا سامان بکھرا ہوا تھا' صوفوں کے گدے تک ادھڑے ہوئے تھے۔اس انبار میں کچھ بھی تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔میں نے اسی وقت انصاری صاحب کو ٹیلی فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔انہوں نے فوراً پہنچنے کا وعدہ کیا۔

وہ نزدیک ہی رہتے تھے۔اس دن بیرسٹر بخاری کے سوگ میں کورٹ بھی بند کر دی گئی تھی اس لیے وہ گھر ہی پر تھے۔وہ دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔

انہوں نے ایک نظر گھر کا جائزہ لیا پھر مجھ سے کہا۔"پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کرو اور بتاؤ کہ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں چوری کی واردات ہوئی ہے' چور گھر سے نقدی اور کئی قیمتی چیزیں لے گئے ہیں۔تم کھل کر کہنا کہ تمہیں پولیس پر شبہ ہے۔چوکیدار نے بتایا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد پولیس یہاں آئی تھی۔وہ لوگ اندر بھی گئے تھے اور کافی دیر تک اندر رہے تھے۔

میرا ٹیلی فون ملتے ہی پولیس کا وہی سب انسپکٹر اور چار سپاہی بنگلے پر پہنچ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آئی او (انویسٹی گیشن آفیسر) تم ہو؟'' انصاری صاحب نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

''جی ہاں' اس وقت تو میں ہی ہوں۔''

انہوں نے علاقے کے ایس ایس پی کا نمبر ملایا اور کہا۔ ''سر' میں بیرسٹر عقیل انصاری بول رہا ہوں۔ حکم کیا جناب' درخواست ہے۔ میرے کلائنٹ کے گھر میں چوری کی واردات ہوئی ہے۔ جی ہاں' رپورٹ تو درج کرادی ہے لیکن اس کیس کا آئی او ہماری واردات کا ذمہ دار ہے۔ جی ہاں' آپ پلیز' آئی او کو تبدیل کر دیں۔ جی ہاں' میرے پاس اس کے خلاف کافی ٹھوس ثبوت ہیں۔ تھینک یو سر۔'' انہوں نے کہا پھر سیل فون سب انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ''ایس ایس پی صاحب سے بات کرو۔''

سب انسپکٹر کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سیل فون پکڑا اور مُردہ لہجے میں بولا۔ ''میں سر' سب انسپکٹر نذیر بول رہا ہوں..... میں سر..... او کے سر۔'' اس نے کہا اور سیل فون انصاری صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''جی سر۔'' انصاری صاحب نے کہا۔ ''ڈیئر' بہت شکریہ۔''

انہوں نے سیل فون جیب میں رکھا اور بولے۔ ''سب انسپکٹر صاحب' اب آپ اس کیس کے آئی او نہیں ہیں اس لیے آپ کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ انسپکٹر ارشاد ابھی آ کر آپ سے چارج لے لیں گے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ''آپ کے خلاف تو میرے پاس اتنے ثبوت موجود ہیں کہ نہ صرف آپ کی ملازمت جائے گی بلکہ آپ کو سزا بھی ہو جائے گی۔''

ایس ایس پی نے شاید پولیس اسٹیشن بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ بیرسٹر انصاری کا بھی بہت نام تھا۔ وہ بھی بیرسٹر بخاری سے کسی طور کم نہیں تھے۔

فوراً ہی انسپکٹر ارشاد موٹر سائیکل پر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے رسمی طور پر سب انسپکٹر نذیر سے کیس کا چارج لیا اور ہم لوگوں کے بیانات لینے لگا۔

میں نے کھل کر سب انسپکٹر نذیر کو اس واردات کا ذمے دار ٹھہرایا۔

سب انسپکٹر نذیر نے کہا۔ ''میں نے کل یہاں سے دو کلو ہیروئن اور اسلحہ برآمد کیا تھا۔ میں اسے گرفتار کر کے لے جانے والا تھا کہ ان کے والد اور والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بیرسٹر بخاری صاحب نے کہا کہ تدفین تک میں ان لوگوں کو تھانے نہ لے جاؤں۔''

''بیرسٹر بخاری؟'' انسپکٹر ارشاد چونک کر بولا۔ ''وہ جن کا کل مرڈر ہوا ہے؟''

''ہاں' وہی۔'' سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''وہ ان کے وکیل تھے۔ تدفین کے بعد یہ لوگ گن پوائنٹ پر یہاں سے فرار ہو گئے۔''

''فرار ہو گئے؟'' انسپکٹر ارشاد نے حیرت سے کہا۔ ''اور تم لوگ منہ دیکھتے رہے؟''

''ان لوگوں نے ہمیں بے ہوش کر دیا تھا۔''

''اس واقعے کی رپورٹ تھانے میں تو درج ہو گی؟''

''بیرسٹر بخاری نے کہا تھا کہ رپورٹ میری موجودگی میں درج کرنا۔''

''ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔'' انسپکٹر ارشاد نے کہا۔ ''انہوں نے کہا اور تم مان گئے؟''

''انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں تھانے پہنچ رہے ہیں۔''

انسپکٹر ارشاد خاصا معقول آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے فرداً فرداً ہم سب کے بیانات لیے۔ ہم سبھی نے اسے بتایا کہ ہم اپنے دوست تیمور کے گھر گئے تھے۔ کل اس کی برتھ ڈے تھی۔ رات ہم نے وہیں گزاری تھی۔ صبح یہاں آئے تو گھر کی یہ حالت تھی۔

رسمی کارروائی کرنے کے بعد انسپکٹر ارشاد اور باقی لوگ وہاں سے چلے گئے۔

بیرسٹر انصاری نے مجھ سے کہا۔ ''اب میں بھی چلتا ہوں' پولیس دوبارہ پریشان کرے تو تم فوراً مجھے اطلاع دینا۔''

میں نے اپنے ملازموں کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ اس دور میں یہ ہی سب سے بڑی سہولت ہے کہ تقریباً ہر آدمی کے پاس سیل فون ہے۔ ان لوگوں کی واپسی میں کچھ دیر لگتی اس لیے ہم خود ہی صفائی میں جت گئے۔

میں نے چوکیدار زرگل کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں صفائی کر ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف مشہدی تھا۔

''ہاں' بہادر آدمی.....!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا پریشانی ہے؟''

''تم لوگ میری بیٹی کو کب میرے حوالے کر رہے ہو؟''

''جب تم میری بہن کو میرے حوالے کر دو گے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر یہ کام آج ہی کر لو۔'' اس نے کہا۔

''ابھی میرا بھائی یہاں موجود ہے۔ میں اس سے مشورہ کر کے تمہیں کال کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ مت سمجھنا کہ تم لوگوں نے بیرسٹر بخاری کو مار دیا تو پولیس سے بچ جاؤ گے۔''

''یار' تم اپنی بیٹی کی فکر کرو۔'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ''پولیس کے معاملات ہم پر چھوڑ دو۔''

''اس مرتبہ تم پولیس کے چنگل میں پھنسے تو تمہارا کیا حشر ہو گا' تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہیں اپنی بیٹی کی ضرورت نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہم پولیس کے چنگل میں ہوں گے تو تمہاری بیٹی تمہیں کیسے ملے گی؟'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ارسلان اور تیمور اندر کی طرف چلے گئے تھے۔

وہ لوگ کمرے سے باہر آئے تو بہت سنجیدہ اور فکرمند تھے۔

''کیا ہوا ارسلان؟'' میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے عبداللہ کو گولی مار کے ہلاک کر دیا ہے۔''

میں بری طرح چونک اٹھا۔ ''عبداللہ کو ہلاک کر دیا ہے؟''

''جی بھیا.....!'' ارسلان نے کہا۔ ''اب سب سے بڑا مسئلہ تو ڈولی کا ہو گا۔ کسی کو بھی یہ علم نہیں ہے کہ ڈولی کہاں ہے؟'' عبداللہ نے اسے کراچی بلا لیا تھا لیکن کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ اس نے ڈولی کو کہاں رکھا ہے؟''

''یہ تو اچھا خاصا پرابلم کھڑا ہو گیا۔ اب ہم مشہدی سے بات کیسے کریں گے؟''

مشہدی بھی ہم سے جھوٹ بول رہا ہے۔ شائستہ کراچی میں ہے ہی نہیں تو وہ اسے ہمارے حوالے کیسے کرے گا؟'' تیمور نے کہا۔

اچانک پھر سے میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس مرتبہ پھر مشہدی کا نمبر اسکرین پر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب کیا ہے؟"
"عمران! میری بات ٹھنڈے دل سے سننا۔" مشہدی نے خلافِ معمول نرم لہجے میں کہا۔
"بولو اب کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"تمہاری بہن نے...... ابھی...... تھوڑی دیر پہلے خودکشی کرلی ہے......"
"کیا......؟" میں چیخ کر بولا۔ "بکواس کرتے ہو تم......"
"کیا ہوا بھیا؟" ارسلان نے پوچھا۔
مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے زمین بہت تیزی سے میری طرف آ رہی ہو پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ بے ہوشی کا وقفہ زیادہ طویل نہیں تھا' مجھے دوبارہ ہوش آیا تو ارسلان کی حالت ابتر تھی۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ شاید اس نے بھی مشہدی سے بات کرلی تھی۔
"میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ارسلان نے کہا۔ "ان لوگوں نے میری بہن کی جان لے لی' میرے ماں باپ کی موت کے ذمے دار بھی یہ ہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے ہماری ہنستی بستی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔"
تیمور ہم دونوں کو سنبھال رہا تھا۔
پھر ارسلان نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ "مشہدی' ہمیں بہن کی ڈیڈ باڈی چاہیے' ابھی اور اسی وقت...... کسی پبلک مقام پر نہیں بلکہ گھر پر...... ہرگز نہیں...... مجھے اپنی بہن یہاں چاہیے...... اچھا' کتنی دیر میں......؟ ٹھیک ہے' میں انتظار کر رہا ہوں۔"
مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ارسلان کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہے۔
"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے بپھر کر پوچھا۔
"وہ کہہ رہا تھا کہ میں کسی پبلک مقام پر ڈیڈ باڈی پہنچا دیتا ہوں۔ میں نے سختی سے انکار کردیا اور اس سے کہا کہ ڈیڈ باڈی ہمیں گھر ہی پہ چاہیے۔ وہ ابھی آدھے گھنٹے میں شائستہ کو لے کر آ رہا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے آدمیوں کی معلومات ناقص ہیں؟" ارسلان نے کہا۔ "ان کا خیال تھا کہ شائستہ کراچی میں نہیں ہے لیکن وہ تو کراچی ہی میں تھی۔ مشہدی ایک دفعہ یہاں آجائے' میں اسے زندہ نہیں جانے دوں گا۔" ارسلان نے غصے سے بل کھاتے ہوئے کہا۔
"کیا غصے نے تمہارے حواس بھی چھین لیے ہیں؟" تیمور نے کہا۔ "کیا مشہدی خود یہاں آئے گا؟"
وہ خود تو کسی بھی قیمت پر یہاں نہیں آئے گا بلکہ اپنے کسی غیر اہم آدمی کو یہاں بھیجے گا۔ اگر ہم نے اسے مار بھی دیا تو مشہدی کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے کہا۔
تیمور کے سیل فون کی بیل بجی تو اس نے اسکرین پر نظر ڈال کر کال ریسیو کرلی اور بولا۔ "ہاں ندیم' بولو' کیا؟ یہ کیسے ہوا؟"
"کیا ہوا تیمور؟" ارسلان نے گھبرا کر پوچھا۔

یہ پُرتجسس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

محمد سلیم اختر

بھٹکنے سے ذرا پہلے

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

زخم کب ہرے نہ تھے درد کب سوا نہ تھا
ہاں مگر یہ بات ہے تم سے کچھ کہا نہ تھا

ایک پاکباز بیوی کے بھنورہ صفت شوہر کی پل پل بدلتی محبتوں کا خاص احوال

صابرہ سے میری شادی ارینج تھی۔ امی ابو نے یہ رشتہ طے کیا تھا اور میں نے اُن کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کردیا تھا۔ صابرہ کے خاندان والوں سے ہماری دور پار کی رشتے داری تھی۔ صابرہ اپنے نام کی طرح نہ صرف صبر کرنے والی اور مشرقی لڑکی تھی بلکہ نہایت ہی خوبصورت بھی تھی اور اب بھی ہے۔ خوبصورتی اور مردانہ وجاہت میں تو میں بھی کچھ کم نہیں ہوں' میں لاکھوں میں ایک نہ سہی مگر ہزاروں میں ایک ضرور تھا'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کئی لڑکیاں مجھے چاہتی تھیں۔ شادی سے پہلے کئی ایک کے ساتھ میرا افیئر چل رہا تھا۔ صابرہ خوبصورت تو ضرور تھی مگر میرے اور اس کے مزاج میں نمایاں فرق تھا جس کی وجہ سے میری اور اس کی نہیں بن رہی تھی۔ میں صابرہ کی خوبصورتی کا معترف تھا لیکن اس کی عادات اور اطوار پسند نہ تھے۔ میں ایک لاابالی اور کھلنڈرا' خوبصورت اور ماڈرن تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص تھا۔ میرا معاملہ ایسا ہی تھا کہ اپنی اولاد اور دوسروں کی بیویاں ہر مرد کو ہی اچھی لگتی ہیں جبکہ اس کے برعکس صابرہ کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے تھا۔ اس کے گھر کے سب لوگ نمازی تھے۔ اس کے والد اور بھائیوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ گھر کی عورتیں پردے کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ یہی حال صابرہ کا تھا' وہ پکی نمازی اور پردے کی پابند تھی جبکہ میں چاہتا تھا کہ وہ برقع وغیرہ نہ پہنے بلکہ جدید لباس میں میرے ہمراہ پارکوں اور ہوٹلوں میں چلے مگر صابرہ نہ برقع اتارنے پر تیار تھی اور نہ ہی اسے پارکوں اور ہوٹلوں میں جانے کا شوق تھا۔ بلاشبہ وہ کھانا نہایت ہی مزے دار بناتی تھی۔ نماز کی پابندی' تلاوتِ قرآنِ پاک' مذہبی کتابوں کا مطالعہ اس کے شوق تھے۔ ٹی وی دیکھنے کا اسے قطعی شوق نہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں ہی اس نے میرے امی ابو کو مستقل نمازی بنا دیا تھا مگر وہ مجھے نہیں بدل سکی تھی۔ اس کی مذہبی طبیعت میری کئی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جاتی تھی جس وجہ سے ہم میں آئے دن تلخ کلامی بھی ہو جاتی۔ امی اور ابو مجھے خوب ڈانٹتے مگر وہ زبان سے ایک لفظ شکایت کا نہ نکالتی۔ نجانے کیوں صابرہ کو تنگ کرنے میں مجھے مزہ آتا تھا۔ میں ہر بات اس کی مرضی کے خلاف ہی کرتا' وجہ یہ تھی کہ وہ ماڈرن اور بے باک نہ تھی۔ اس کی سادگی اور شرافت سے میں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور پھر سے دوسری لڑکیوں کی طرف راغب ہو گیا تھا۔

میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ معقول تنخواہ تھی۔ زوبی اسی دفتر میں ٹرانسفر ہو کر آئی تھی۔ وہ زیادہ خوبصورت تو نہ تھی مگر ڈھیروں میک اپ اور ماڈرن شوخ لباس نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تھے پھر جلد ہی ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ دفتر کے بعد ہم کبھی سینما میں فلم دیکھ رہے ہوتے' کبھی کہیں سیر کے لیے نکل جاتے تو کبھی کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانے کا پروگرام ہوتا۔ گھر میں کسی فرد کو میرے اور زوبی کے تعلق کا علم نہ تھا۔ گھر لیٹ آنے کا بہانہ یہ ہوتا کہ دفتر میں کام زیادہ تھا۔

میں زوبی کا ساتھ پا کر بہت خوش تھا' تاہم اس سے صرف دوستی کی حد تک تعلق تھا' اس کے علاوہ میرے من میں کوئی اور منصوبہ نہیں تھا۔

ایک روز میں اور زوبی ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے' اسی ہوٹل میں صابرہ کا بھائی اپنے دوستوں کے ہمراہ آ گیا اور اس نے مجھے اور زوبی کو دیکھ لیا اور پھر بات اس کے گھر سے ہوتے ہوئے میرے گھر تک آ گئی۔ امی' ابو' بہن' بھائیوں اور صابرہ کو بھی خبر ہو گئی۔ اس روز صابرہ بہت روئی تھی۔ سب گھر والوں نے میری خوب خبر لی' مجھے برا بھلا کہا' میں نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا مگر کسی نے میری ایک نہ سنی' مجبوراً مجھے صابرہ سے معافی مانگنی پڑی اور سب کے سامنے یہ عہد کرنا پڑا کہ میں آئندہ زوبی سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔

اس عہد پر قائم رہنے کے لیے میں نے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی اور ساتھ ہی کسی دوسرے شہر میں تبادلے کے لیے درخواست بھی دے دی۔ تھوڑی سی تگ و دو اور سفارش سے میرا تبادلہ راولپنڈی والے دفتر میں ہو گیا' یوں میں زوبی سے ناتا توڑ کر راولپنڈی گیا۔ میں یہاں پر اکیلا ہی رہنا چاہتا تھا مگر امی ابو نے اصرار کر کے صابرہ کو بھی میرے ہمراہ بھیج دیا' مجبوراً مجھے کرائے کا مکان لینا پڑا۔ صابرہ میرے ساتھ آ کر خوش تھی اور میں بھی اب اس کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ میں دفتر سے چھٹی کرتا اور سیدھا گھر آ جاتا۔ اب میرا کسی لڑکی کے ساتھ دوستی یا تعلق نہ تھا۔ صابرہ کو بھی اب یقین آ گیا تھا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ گیا ہے مگر یہ اس کی بھول تھی۔

دو ہفتے گزر گئے تھے' میں صبح دفتر جاتا اور شام کو لوٹ کر آتا۔ صابرہ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ ابھی تک وہ اس نئے محلہ میں کسی کے گھر نہیں گئی تھی مگر محلہ کی کئی لڑکیاں خود ہی اس سے ملنے ہمارے گھر آ جاتی تھیں۔ صابرہ بڑے خلوص اور تپاک سے انہیں خوش آمدید کہتی' ان کو چائے پلاتی' ان سے گپیں لگاتی مگر چند روز بعد اچانک ہی اس کی ساری خندہ پیشانی اور خوش مزاجی دیکھتے ہی دیکھتے ترش روئی اور تند خوئی میں بدل جاتی' وہ ان سے ایسی روکھی روکھی اور پھیکی پھیکی باتیں کرنے لگتی کہ وہ مایوس اور رنجیدہ سی ہو کر واپس چلی جاتیں۔ اب خدا ہی جانے کہ صابرہ کی ترش روئی اور تند خوئی میں کیا جاذبیت اور سحر تھا کہ وہ پھر صابرہ سے ملنے آ جاتیں۔ ان کے لیے صابرہ کی شخصیت پراسرار سی ہو گئی تھی۔ اس کی تضاد مزاجی یہی تھی کہ وہ تنہائی کی وجہ سے ان کے ساتھ مل بیٹھتی اور تفریح طبع کے لیے ان کے ساتھ گپ شپ لگاتی' یہ اس کی فطرت تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ ایک تلخ تجربے نے اسے تمام حوا زادیوں سے متنفر کر دیا تھا۔ زوبی کی اس کی ازدواجی زندگی میں لگائی ہوئی نقب وہ اب تک نہیں بھولی تھی جس نے اس کی خانگی زندگی میں زہر بھرنا چاہا تھا۔ میں بھی اس کا مجرم تھا۔ صابرہ نے محلہ والیوں کو یہ بات آبدیدہ ہو کر بتائی تھی اور ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اسی وجہ سے خوف میں مبتلا رہتی ہے کہ کہیں پھر کوئی حوا زادی اس کے گھر میں نقب نہ لگا دے۔ ان لڑکیوں نے صابرہ کو یقین

شرم

ساحر لدھیانوی نے جاں نثار اختر سے کہا: ''یار جان نثار! اب تم کو پدم شری' خطاب مل جانا چاہیے۔''

جاں نثار نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

ساحر نے جواب دیا۔ ''اب ہم سے اکیلے یہ ذلت برداشت نہیں ہوتی۔''

''ادیبوں کے لطیفے'' از کے ایل نارنگ ساقی سے انتخاب

دلایا کہ وہ اس قسم کی لڑکیاں نہیں ہیں پھر صابرہ نے ان کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کرنا شروع کی تو ان میں سے کچھ نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔

ان ہی میں ایک لڑکی جس کا نام شکیلہ تھا' اچھی شکل وصورت کی مالک تھی۔ اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا اس لیے وہ اکثر صابرہ کے پاس آ جاتی تھی۔ اسے نہ جانے کیا غم تھا کہ وہ صابرہ کے سامنے اپنی محرومیوں پر آنسو بہاتی رہتی۔ وہ محبت کی ترسی ہوئی تھی' وہ صابرہ کو بتاتی کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے جذبات کے خون سے رنگین ہے' اس کی تمام خواہشات اور آرزوئیں ہمیشہ غربت اور افلاس کے خنجر تلے گھائل ہوتی رہی ہیں۔

وہ کہتی۔ ''میں ماضی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں تو مجھے ہر طرف حسرتوں کی اڑتی ہوئی دھول میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کاش میں اس دنیا میں جنم ہی نہ لیتی' بھلا ایسی زندگی کس کام کی جس میں مایوسیوں' ناکام تمناؤں اور ادھوری امنگوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ باجی.....! جب میرے غم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو میں آپ کے پاس آ جاتی ہوں' آپ کی باتیں سن کر مجھے چین مل جاتا ہے۔''

صابرہ کو شکیلہ کی ایسی افسانوی باتوں پر بہت غصہ آتا' اسے ایسی باتیں اور ڈائیلاگ قطعی پسند نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔صابرہ نے کئی بار اسے منع کیا کہ وہ اس کے پاس نہ آیا کرے' وہ اس کو شرم دلاتی' زبردستی گھر سے باہر نکال دیتی مگر وہ کسی بات کا اثر ہی نہ لیتی' وہ اپنے گھر چلی جاتی تو تھوڑی ہی دیر بعد پھر آجاتی اور صابرہ سے کہتی۔

''باجی' آپ کے پاس آکر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی خوفناک ویرانے سے نکل کر کسی گوشۂ جنت میں آگئی ہوں۔ آپ کی ڈانٹ ڈپٹ مجھے بہت ہی پیاری اور مانوس سی لگتی ہے۔ مجھے نہ اپنے گھر سے پیار ہے اور نہ ہی اس گھر میں رہنے والوں سے' میرے گھر کے ماحول نے ہی مجھے ایسا بنایا۔''

مگر صابرہ نے اس کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اسے اتنا ہی کہا کہ نماز پڑھا کرو اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگا کرو۔

ویسے تو میں نے توبہ کرلی تھی اور عہد کیا تھا کہ صابرہ کے سوا کوئی لڑکی اب میری زندگی میں نہیں آئے گی مگر میں شکیلہ کو دیکھ کر تمام قسمیں اور وعدے بھول گیا۔ وہ تھی ہی اتنی حسین کہ اس کو پہلی نظر میں ہی دیکھ کر میرا ایمان ڈگمگا گیا تھا مگر پھر بھی میں نے اپنا آپ سنبھال لیا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ شکیلہ کی موجودگی میں اس کے سامنے نہ آؤں البتہ میں دور ہی سے اسے دیکھ کر جی بہلا لیا کرتا تھا۔

اس روز دفتر سے چھٹی تھی۔ صابرہ محلہ میں ہی کسی کے گھر میں میلاد کی محفل میں گئی ہوئی تھی۔ میں کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ شکیلہ آگئی۔

''باجی کہاں ہے''

''وہ محلہ میں کسی کے گھر میلاد میں گئی ہے۔'' میں اتنا کہہ کر جان بوجھ کر مطالعہ میں مصروف ہوگیا مگر وہ اپنی جگہ کھڑی رہی اور ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے نظر انداز کردیا تھا پھر بھی وہ کھڑی تھی۔ میں نے کتاب بند کی اور اسے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکا یک وہ آگے بڑھی اور بے خودی کے عالم میں میرے گلے لگ گئی۔

میں اس کی اس بے باکی پر گھبرا گیا اور نہایت ہی سنگدلی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا اور کہا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''یہ بدتمیزی نہیں کمال صاحب.....!'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آپ مجھے اچھے لگتے ہیں' میں آپ کو چاہنے لگی ہوں۔''

''مگر میں ایک شریف انسان ہوں' ایک بیوی کا شوہر ہوں' میں یہ نہیں کرسکتا' جاؤ اپنے گھر اور آئندہ یہاں مت آنا۔'' میں نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں آؤں گی اور روز آؤں گی' اپنی باجی کے پاس..... آپ کون ہوتے ہیں مجھے منع کرنے والے؟'' یہ کہتی ہوئی اور میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی وہ چلی گئی۔

میں خوشی سے نہال تھا کہ میں جسے حاصل کرنا چاہتا تھا' وہ تو خود ہی پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شکیلہ کوئی پاک دامن لڑکی نہیں ہوگی کیونکہ جس طرح وہ اچانک میری طرف مائل ہوئی تھی' اس سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی چالو قسم کی لڑکی ہے اور نہ جانے کتنے مردوں کی بانہوں میں سما چکی ہوگی' اسی لیے میں نے اس کے خیال کو جھٹک دیا اور پھر سے مطالعہ میں مصروف ہوگیا مگر میرا دھیان شکیلہ کی طرف ہی لگا رہا۔ وہ حسین تو بلا کی تھی اور اپنے بلاخیز حسن کو مجھ پر لٹانے کو تیار بھی تھی۔ میں ان ہی خیالوں میں غرق تھا کہ صابرہ لوٹ آئی۔ شکیلہ کا گھر ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا' چنانچہ اسے معلوم ہوگیا کہ صابرہ لوٹ آئی ہے تو وہ بھی جھٹ سے آگئی۔

''میلاد کی محفل کیسی رہی؟'' اس نے آتے ہی

صابرہ سے پوچھا۔

''بہت اچھی' روح کو چین اور سرور ملا۔'' صابرہ بولی۔ ''آئندہ ہونے والی محفل میں تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

''آئندہ کب اور کہاں ہوگی محفل؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

''آنے والی جمعرات کی شام کو جامع مسجد کی اوپر والی منزل پر ہوگی جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔'' صابرہ نے وضاحت سے بتایا۔

''ٹھیک ہے' میں بھی چلوں گی۔'' شکیلہ نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں اور میں نظریں چرا کر شکیلہ کو دیکھنے لگا۔ شکیلہ اپنے کیے پر ذرہ بھر بھی شرمندہ نہ تھی اور چوری چوری میری طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔ میں اس ڈر سے کہ کہیں صابرہ کو شک نہ ہوجائے' اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں آکر میں نے سگریٹ سلگایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد شکیلہ کوئی چیز لینے میرے کمرے میں آگئی مگر میں نے اسے نظر انداز کردیا ایسے جیسے میں اسے جانتا ہی نہیں ہوں۔ اس نے میرے کمرے سے صابرہ کی چپل اٹھائی اور میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے نگاہیں جھکالیں۔ میں چاہتا تھا' وہ فوراً میرے کمرے سے نکل جائے مگر اس نے میرے پاؤں پر ہلکی سی چٹکی لی اور سرگوشی بھرے انداز میں بولی۔

''کمال.....! تم حسن کا کوئی ایسا شاہکار نہیں ہو کہ جسے دیکھتے ہی کوئی لڑکی دل و جان سے فریفتہ ہوجائے مگر اتنے برے بھی نہیں کہ کوئی نظر انداز کردے۔ جیسے مجھے تمہارا مردانہ حسن و جمال بھا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔

جمعرات کو جب میں دفتر سے آیا تو صابرہ جامع مسجد میں ہونے والی خواتین کی محفلِ میلاد میں جانے کی تیاری کررہی تھی۔ اسے شکیلہ کا انتظار تھا کہ وہ آئے تو وہ اسے بھی ساتھ لے کر جائے مگر کافی دیر تک شکیلہ نہ آئی تو صابرہ' پڑوسن خالہ فضلاں کے ہمراہ روانہ ہوگئی۔ صابرہ کو شکیلہ پر غصہ بھی آیا کہ وہ وعدہ کرکے اس کے ساتھ نہیں گئی لیکن میں جان گیا کہ شکیلہ جان بوجھ کر نہیں آئی ہے۔ صابرہ کے جاتے ہی میں نے باہر کے دروازے کی کنڈی لگادی کہ شکیلہ نہ آجائے اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی مگر میں نہ اٹھا' جب دروازہ مسلسل پیٹا جانے لگا تو مجھے اٹھنا پڑا' جا کر دروازہ کھولا تو سامنے شکیلہ کھڑی تھی۔ اس نے بغیر کوئی بات کیے اندر قدم رکھا اور مجھے ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر کمرے میں جا پہنچی۔ میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور کمرے میں آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''شکیلہ.....! خدا کے واسطے' باز آجاؤ' میرا گھر برباد نہ کرو' آگ مت لگاؤ' میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔''

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کمال صاحب.....! میں محبت کی ترسی ہوئی لڑکی ہوں' مجھ میں محبت کی یہ آگ میرے والدین نے ہی لگائی ہے' وہی میرے مجرم ہیں' میرے بگاڑ کے ذمہ دار ہیں' میں نے کم عمری میں بارہا اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھا ہے جو لڑکیاں شادی کے بعد دیکھا کرتی ہیں۔ تیرہ برس بھی کوئی عمر ہوتی ہے مگر میں اس چھوٹی سی عمر میں ہی ذہنی طور پر بالغ ہوگئی تھی جس عمر میں مجھے گڑیوں اور ریت کے گھروندوں سے کھیلنا چاہیے تھا۔ میں اس وقت کسی مرد کی بانہوں میں سمٹ جانا چاہتی تھی تاکہ میرے آوارہ خیالات' بلکتے ہوئے جذبات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ور مشتعل احساسات کو سکون مل سکے۔ جوانی کی طرف اٹھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ میں دیوانی ہوتی جارہی ہوں۔ آپ کے یہاں آنے سے پہلے میں ہر روز دروازے کے پٹ کھول کر دہلیز میں کھڑی ہوجاتی اور ہر رہگزر کو متجسس نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔ مجھے ایک ہم سفر کی تلاش تھی جس کو سہارا بنا کر میں شادمانیوں کی منزل تک پہنچ سکتی۔ اسی جستجو میں ایک دن مجھے آپ نظر آ گئے۔ اس وقت میں اپنے گھر کی چھت پر اور آپ اپنے صحن میں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ آپ مجھے پہلی نظر میں ہی اچھے لگے تو میں نے سوچ لیا کہ میں آپ کو حاصل کر کے رہوں گی مگر آپ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرتے ہو' کہتے ہیں کہ عورت ایک ایسی آگ ہے جس میں مرد موم کی طرح پگھل جاتا ہے مگر آپ اس مفروضے کو غلط ثابت کر رہے ہو مگر میں آپ کو پگھلا کر رہوں گی کیونکہ آپ میری زندگی میں آنے والے اور میرے دل میں سمانے والے پہلے مرد ہو۔'' شکیلہ خاموش ہوگئی تھی۔

''مجھے تم سے ہمدردی ہے' بس اس کے علاوہ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکوں گا۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''کمال.....! ایسی بھی کیا سنگدلی' میں تمہیں دل سے پیار کرتی ہوں۔'' وہ میرے قریب آ کر بولی اور تکلف ایک طرف رکھتے ہوئے آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

''خدا کے لیے' اب چلی جاؤ ورنہ کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو ہم دونوں ہی بدنام ہو جائیں گے۔'' میں نے اس سے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

''فکر نہ کرو' میں تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گی' میں جا رہی ہوں مگر یاد رکھو' میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں' تم میری زندگی ہو' میرا پیار تمہیں موم کر کے ہی رہے گا۔'' اس نے جاتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور چلی گئی۔

وہ مجھے کیا موم کرتی' میں تو پہلے ہی اس کے لیے پگھلا ہوا تھا۔ میں اسے چاہتا تھا' مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میری دیوانی ہے پھر میں' صابرہ اور اس کے ساتھ کیے ہوئے وعدے اور قسمیں بھول گیا اور شکیلہ کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ وہ ہمارے گھر بھی آتی رہی اور ہم گھر سے باہر بھی ملنے اور گھومنے لگے۔ اس دوران میں اپنے گھر اور صابرہ کا بھی بھرپور خیال رکھتا کہ کہیں اسے شک نہ ہو جائے.....

اُن دنوں عید کی آمد آمد تھی۔ میں بازار سے صابرہ کے لیے سوٹ کا کپڑا لے آیا کیونکہ وہ خود ہی سلائی کر لیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے شکیلہ کے لیے بھی ایک ریڈی میڈ اور جدید ڈیزائن کا سوٹ خرید لیا۔ میں نے جب وہ سوٹ شکیلہ کو دیا تو وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

''میں یہ سوٹ عید پر پہنوں گی۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا تھا اور اس نے وہ سوٹ عید پر پہنا تو اس پر خوب جچا اور اس سوٹ نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

صابرہ کی چھٹی حس نے اپنا کام دکھایا اور اس کو شک ہو گیا کہ میں شکیلہ کو چاہنے لگا ہوں اور یہ سوٹ بھی میں نے ہی اسے خرید کر دیا ہے۔ اس بات پر میری اور صابرہ کی اچھی خاصی تو تو میں میں ہوگئی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے' تمہیں خوامخواہ غلط فہمی ہوگئی ہے مگر صابرہ نہ مانی۔

''تم اسے گھر نہ آنے دیا کرو۔'' میں نے اس الزام سے بچنے کی خاطر کہا۔

''میں اسے ہزار بار منع کر چکی ہوں مگر اس پر تو میری کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا' ڈھیٹ بن کر منہ اٹھائے پھر آ جاتی ہے اور باجی' باجی کی رٹ لگائے

رکھتی ہے۔'' صابرہ نے بے چارگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے' اب میں اسے منع کروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ اب کیسے یہاں آتی ہے؟'' میں نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم کیوں لڑکی کے منہ لگو گے' بس تم اس سے دور ہی رہا کرو۔'' صابرہ بھی اسی انداز سے بولی۔ وقتی طور پر تو صابرہ مطمئن ہوگئی لیکن اس کا شک دور نہ ہوا تھا۔ اب جب بھی شکیلہ میری موجودگی میں ہمارے گھر آتی تو صابرہ ہم دونوں سے غافل نہ ہوتی اور ہم پر کڑی نظر رکھتی تھی۔

•.....•.....•

شکیلہ کے حسنِ بلاخیز نے مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اس کے بغیر مجھے زندگی پھیکی اور بے رونق لگتی تھی اور صابرہ کا وجود مجھے بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اور شکیلہ محبت کی اس انتہا تک پہنچ گئے کہ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شکیلہ میرے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار تھی مگر میں بے بس تھا کہ صابرہ کا بھاری پتھر میری راہ میں حائل تھا لیکن میں نے ایک فیصلہ کیا اور اپنا تبادلہ راولپنڈی سے کراچی کروانے کی کوشش شروع کر دی۔ میرا ارادہ تھا کہ جس دن میری تبدیلی کراچی ہو جائے گی تو شکیلہ کو ساتھ لے کر کراچی چلا جاؤں گا۔ وہاں سے صابرہ کو طلاق بھیج کر شکیلہ سے شادی کر لوں گا۔ شکیلہ بھی میرے اس فیصلے پر رضامند تھی۔ اب انتظار تھا تو ٹرانسفر کا۔

وہ مالی سال کا آخری ماہ یعنی جون کا مہینہ تھا اس لیے میرا تبادلہ اس کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل نے جون' جولائی کے مہینوں میں تبادلوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ دفتر میں ان دنوں کام زیادہ ہوتا ہے اور دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے اس لیے میں آٹھ بجے تک ہی گھر لوٹتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے شکیلہ سے بھی ملاقات اور رابطہ نہیں ہوا تھا۔

ایک دن میں نے اسے اپنے گھر میں ہی صابرہ کے ہمراہ نماز پڑھتے دیکھا تو بہت ہی حیران ہوا کہ تاک جھانک کرنے والی لڑکی میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟ مگر پھر میں سمجھ گیا کہ وہ یہ سب کچھ صابرہ کو اعتماد میں لینے کے لیے کر رہی ہے تاکہ اسے ہم دونوں پر شک نہ ہو۔ اب تو صابرہ نے بھی مجھ سے گلہ شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا دل اب میری طرف سے صاف ہو گیا ہے مگر یہ اس کی بھول تھی' میں تو اب شکیلہ کا ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور کہا تھا۔

''آپ جس سانچے میں بھی مجھے ڈھالنا چاہتے ہیں' میں ڈھل جاؤں گی' جیسا لباس آپ چاہیں گے' ویسا ہی لباس پہنوں گی اور آپ مجھے جو کچھ بھی بنانا چاہیں گے' میں بن جاؤں گی۔'' مجھے ایسی ہی بیوی چاہیے تھی۔ صابرہ جیسی ملانی نہیں۔

ایک روز بالآخر میرا تبادلہ کراچی میں ہو گیا۔ میرے پاس ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے پندرہ دن کا ٹائم تھا' صابرہ کو تو میں نے اپنے تبادلے کی ہوا بھی نہیں لگنے دینی تھی' پہلے سوچا کہ صابرہ کو کسی بہانے سے والدین کے پاس بھیج دوں پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا کہ والدین کے پاس بھیجنے کی کوئی وجہ نہیں بن رہی تھی پھر یہی حل ذہن میں آیا کہ کراچی پہنچ کر اسے طلاق نامہ بھیج دوں گا۔ اس کے بعد جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ شکیلہ کی محبت نے میری آنکھوں اور دل و دماغ پر پردے ڈال دیئے تھے۔ میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بھی چھین لی تھیں۔

میں نے جب شکیلہ کو اپنے کراچی تبادلے کی خبر دی تو وہ خوش ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ فلاں تاریخ کی میں نے گاڑی کی سیٹیں ریزرو کرالی ہیں۔ تم اپنی تیاریاں کر لو اور صبح صبح ہی ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا۔ ہماری روانگی میں دس دن باقی تھے' ان ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دس دنوں میں ہم دونوں نے اپنی اپنی تیاری کرنی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اور رہے گا کہ اس دن مارچ کی پندرہ تاریخ تھی' میں صبح کی سیر کرنے کے بہانے گھر سے نکلا اور سیدھا اس ہوٹل پہنچا جہاں میں نے ایک کمرہ بک کرا کے اس میں اپنا کچھ سامان وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہوٹل سے سامان لیا اور ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ میں اسٹیشن کے ایک سنسان سے گوشے میں کھڑا ہو کر بڑے پرسکون انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے شکیلہ کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین تیار کھڑی تھی' اس کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے مگر شکیلہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میری بے چینی بڑھنے لگی کہ اسی وقت شکیلہ آ گئی مگر وہ خالی ہاتھ تھی' کوئی سامان وغیرہ اس کے پاس نہ تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی بے تاب ہو گیا۔

''جلدی کرو..... ٹرین تیار کھڑی ہے..... ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا ہے۔'' مگر شکیلہ پر میری بات کا اثر نہ ہوا' وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ مجھے لگا' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اتنے میں ٹرین کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔

''شکیلہ..... جلدی کرو..... گاڑی نکل جائے گی۔''

مگر جواب میں وہ مجسم معذرت بن کر بولی۔ ''معاف کیجیے گا' میں اپنا وعدہ نہیں نبھا سکتی' میں نے تمہارے ساتھ جانے کا ارادہ ہمیشہ کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ آج سے میری اور تمہاری راہیں جدا ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''ہاں' ہوش میں ہوں' میں باجی صابرہ کے سہاگ پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی.....'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''یہ سب کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں تو اپنی سب کشتیاں جلا کر آیا ہوں۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''ابھی کچھ نہیں بگڑا..... گھر لوٹ جاؤ' صابرہ باجی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ بہت عظیم ہیں۔ میں ہی گھٹیا اور کمینی ہوں۔ صابرہ باجی کو میرے اور آپ کے تعلقات کا علم تھا۔ وہ مجھے سمجھاتی رہتی تھیں مگر میں ان کی باتوں پر توجہ نہیں دیتی تھی۔

ایک روز صابرہ باجی نے مجھے بتایا کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں' تم میرے شوہر کمال سے محبت کرتی ہو' وہ بھی تمہیں چاہنے لگا ہے۔ مجھے تمہاری گھر سے باہر ہونے والی ملاقاتوں کا بھی پتہ ہے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی اور نہ ہی کمال کی راہ میں کوئی رکاوٹ بن سکتی ہوں کیونکہ وہ مرد ہے اور مرد منہ زور گھوڑا ہوتا ہے لیکن میں پھر بھی تمہیں اپنے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالنے دوں گی۔ میں اپنے جیتے جی کمال کو کسی اور کا نہیں ہونے دوں گی لیکن اگر تم باقاعدہ نمازِ پنج گانہ اور روزانہ تلاوتِ قرآنِ پاک شروع کر دو تو میں تمہیں بطور سوکن قبول کر لوں گی اور تمہاری شادی کمال سے کر دوں گی۔

میں نے صابرہ باجی کی باتیں سنیں تو اٹھ کر ان کے پاؤں پڑ گئی۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم دونوں ہی رونے لگیں۔ میرے آنسو تو خوشی کے آنسو تھے اور صابرہ باجی کے صبر کے' بس اس دن سے میں نے پانچوں وقت کی نماز پڑھنی شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی ایک پارہ کی تلاوت بھی کرنے لگی۔ صابرہ باجی نے مجھے مذہبی کتابیں بھی دیں۔ میں ان کا بھی مطالعہ کرنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کے سہانے خواب بھی دیکھنے لگی۔ تمہاری رفاقت ملنے کی امید سے میری روح خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ میں نے اپنے من کو ابدی شادمانیوں سے بھرنے کی تمنا

میں اپنے دل و دماغ کو تمام بے ہودہ خواہشات اور مکروہ خیالات سے یکسر خالی کر دیا۔ ایک تمہاری خاطر میں نے اپنی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی۔ میں نے اس زور و شور سے نماز اور تلاوت کا سلسلہ شروع کیا کہ میرے گھر والے بھی حیران رہ گئے۔ نماز و تلاوت کے لیے مجھے شروع میں بڑی دشواری پیش آئی۔ دل کے آزاد پنچھی کو پابندیوں کے قفس میں یکدم قید کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تمہارا خیال اور نفس بار بار مجھے تمام انسانی اور اخلاقی ضابطوں کو لغویات اور دین و مذہب کو فضولیات قرار دے کر پہلے کی سی بے راہ روی کی ترغیب دیتا مگر میں نے صابرہ باجی کی قربانی کی خاطر اپنے دل کی ایک نہ مانی اور اپنی نماز و تلاوت میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ یوں رفتہ رفتہ نفس کی مخالفت کم ہوتی چلی گئی اور مجھے دینی فرائض کی ادائیگی میں یک گونہ سرور آنے لگا۔ قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہوئے میری سوچوں کے زاویئے بدلتے چلے گئے۔ خدا کے احکامات سے روگردانی کرنے والوں کو دیئے جانے والے عذاب کی آیات کا ترجمہ پڑھ کر میرا دل خوف سے لرز اٹھا۔ گناہ و سزا اور مکافاتِ عمل کے تصور سے گناہ کرنے کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور کسی عورت کے حق پر ڈاکہ ڈالنا مجھے گناہِ کبیرہ محسوس ہوا۔ میں نے جب اپنے کردار پر نظر ڈالی تو مجھے لگا' میں دنیا کی گناہ گار ترین انسان ہوں' مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ گناہ اور اس کے عذاب کا خوف مجھ پر طاری ہو گیا۔ مجھے عذابِ خداوندی سے بچنے کی ایک یہی صورت نظر آئی کہ تمام بدعملیوں کی توبہ کر کے تعلیماتِ قرآنیہ کی پابند ہو جاؤں۔ اس نئے اور حقیقی اندازِ فکر نے مجھے تمہارے ساتھ فرار کا ارادہ ترک کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دغاباز' بے وفا' فریبی' مکار اور نہ جانے کیا کیا کہو گے مگر اب مجھے باجی صابرہ اور خدا کی خوشنودی کے

بہت مشکل ہے

یادوں کے دریچوں کو کھولنا
بہت آسان ہے
لیکن.....
یادوں کی ہوا میں بیٹھ کر
اپنے آنسوؤں کو روکنا
اور.....
دل کے بوجھ کو کم کرنا
بہت مشکل ہے

ارباب قربان علی ایری' بھاگ شہر

آگے تمہارے گلے شکوے اور خوشی کی کوئی پروا نہیں رہی۔ میں آج تم سے اخلاقاً ملنے آئی ہوں تاکہ تم میرا انتظار نہ کرتے رہو۔ جاؤ' واپس اپنے گھر لوٹ جاؤ' صابرہ باجی تمہاری منتظر ہوں گی۔ میں بھی اپنے گھر جا رہی ہوں' گھر والوں نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ خدا حافظ!'' شکیلہ یہ کہہ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی تھی۔

میں جو صبح کا بھولا تھا' شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا۔ میں نے صابرہ سے معافی مانگ لی اور اس کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اب ٹرانسفر اتنی جلدی تو نہیں رک سکتا تھا اس لیے دو دن بعد میں اور صابرہ کراچی جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر تھے۔ شکیلہ ہمیں الوداع کہنے کے لیے آئی تھی جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھی' وہ ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتی رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سپنا عباسی

دیر ہے اندھیر نہیں

نور جہاں نوری کا خیال

یوں ہوئی چارہ گری موسمِ گل کے ہاتھوں
مُندمل زخمِ خزاں ہو گیا دھیرے دھیرے

صبر کی مٹی سے گندھی ایک لڑکی کا سبق آموز دل گداز ماجرا

میرے بابا نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی دوسری شادی پچاس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ بابا کی پہلی بیوی کی وفات شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی ہو گئی تھی جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بابا چائے کے ایک معمولی ہوٹل پر بیرے کا کام کرتے تھے۔ ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ دوسری شادی کر سکیں۔ اپنی ساری جمع پونجی انہوں نے پہلی شادی پر خرچ کر دی تھی لیکن پچاس برس کی عمر میں انہیں احساس ہوا کہ اب وہ اکیلے نہیں رہ پائیں گے' بڑھاپے کے سہارے کے لیے انہیں کسی ساتھی کی ضرورت پڑے گی' تب انہوں نے گھروں میں جھاڑو پونچھے کا کام کرنے والی بیوہ سے شادی کر لی تھی جس کا پہلے شوہر سے دو سال کا بیٹا بھی تھا۔ اس کا نام مجاہد تھا۔ انہیں بھی گھر اور سہارے کی تلاش تھی۔

بابا کی دوسری شادی کے تقریباً ایک سال بعد میرا جنم ہوا تھا۔ میرا نام حسینہ رکھا گیا کیونکہ میں بہت خوبصورت تھی۔ جب میں سات برس کی ہوئی تو بابا

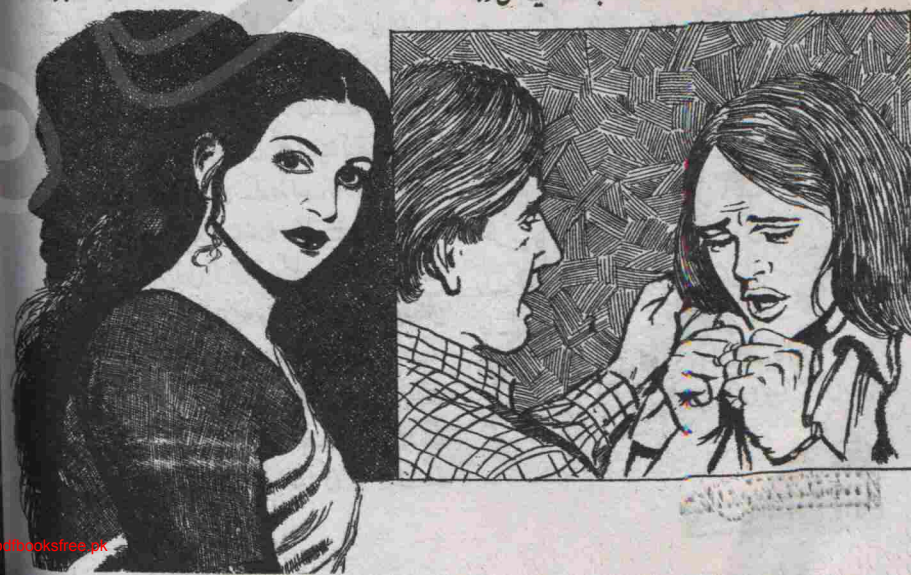

ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ وہ ایک روڈ حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اب گھر کی تمام ذمہ داری اماں پر آ گئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ کام پر چلی جاتیں اور رات گئے لوٹتیں۔ شب و روز کے اسی پھیر میں وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا اور میں سولہ برس کی جوان اور حسین لڑکی کے روپ میں بدل گئی۔ مجاہد بھائی بھی گبھرو جوان بن گیا تھا۔ اماں نے تمام عمر مشقت میں گزاری تھی۔ اب وہ ٹی بی کی مریضہ بن کر بستر سے لگ گئی تھیں۔ یوں گھر چلانے کے لیے میں نے بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب کپڑوں کی ایک فیکٹری تھی' میں وہاں کام کرتی تھی اور مجاہد بھائی اُسی ہوٹل میں بیرے کا کام کرتے تھے جہاں پہلے بابا کیا کرتے تھے' یوں ہم غریبوں کی زندگی کا سفر جاری تھا۔

ایک روز میں فیکٹری جا رہی تھی کہ ایک بڑی سی سفید کار میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا' ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اچھی شکل و صورت اور بہترین سوٹ میں ملبوس تقریباً چوبیس' پچیس برس کا نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور آگے کی طرف چل پڑی۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا' وہ راستے میں آتے جاتے مجھے دیکھتا اور مسکراتا رہتا۔ ایک دن اس نے بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میرا نام پوچھ لیا اور پھر اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا' یوں کسی اجنبی کے اظہارِ محبت سے میں گڑبڑا سی گئی اور پسینے پسینے ہو گئی۔ رات کو جب بستر پر لیٹے لیٹے میں نے اس کے بارے میں سوچا تو خود پر فخر ہونے لگا کہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ میری محبت میں دیوانہ ہے' تب میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے کا فیصلہ کر لیا اور آنکھیں موند کر اس کے خیالوں میں گم ہو گئی۔ اس طرح ہماری محبت کی کہانی کا آغاز ہو گیا' رفتہ رفتہ وہ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ اب یوں ہوتا کہ اگر کبھی اسے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں تڑپ کر رہ جاتی' میرا من اب اس کے سوا کسی شے میں نہیں لگتا تھا حالانکہ میں جانتی تھی کہ حیثیت میں وہ آسمان ہے اور میں زمین تھی۔ وہ امیر خاندان کا پڑھا لکھا نوجوان اور میں اَن پڑھ اور ایک غریب خاندان کی معمولی سی لڑکی' میرا اور اس کا کوئی میل نہیں تھا پر دل کیا کرتا..... محبت تو اندھی ہوتی ہے' اونچ نیچ اور ذات پات کہاں دیکھتی ہے۔ اس طرح ہماری محبت کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ اکثر اپنی گاڑی میں مجھے گھمانے لے جاتا۔ کبھی ہم سیر و تفریح کرتے تو کبھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے نکل جاتے۔

اس کا نام شاہد تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ فیملی میں اس کے اور اس کی ماں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کا بڑا سا کاروبار تھا۔

ایک دن شاہد مجھے اپنی ماں سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا بڑا سا گھر کسی محل سے کم نہیں تھا جو کہ عیش و عشرت کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر میں ہر طرف نوکر چاکر گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔

میں بہت گھبرا رہی تھی کہ کہیں شاہد کی ماں مجھے ٹھکرا نہ دیں، پر ایسا نہیں ہوا، وہ بہت اچھی اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہیں دولت مند ہونے کا ذرا بھی گھمنڈ نہیں تھا۔ وہ دولت سے زیادہ شرافت اور اچھی سیرت کی قائل تھیں۔ انہیں گھٹنوں کا مرض تھا اس لیے وہ چل نہیں پاتی تھیں۔ شاہد نے اپنی ماں کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں غریب ہوں۔ انہوں نے پہلی نگاہ میں ہی مجھے پسند کر لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹا، تم مجھے بہت پسند آئیں۔ اب میں شاہد کی شادی میں دیر نہیں کروں گی۔ کل ہی ہم تمہارا ہاتھ مانگنے تمہارے گھر آ رہے ہیں۔''

اُن کی بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ سب مجھے ایک حسین خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ایک بڑے گھر کی بہو بنوں گی۔

شاہد کے گھر سے رشتہ آیا تو میری والدہ اور بھائی خوشی سے پاگل ہو گئے تھے پھر چند روز بعد میں دلہن بن کر شاہد کے گھر آ گئی مگر یہاں آتے ہی مجھ پر وہ انکشاف ہوا کہ میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی' میرے سارے خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے۔ شاہد کا اصل روپ میرے سامنے آ گیا تھا۔ شادی کی پہلی ہی رات انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ سیما نامی ایک طوائف سے محبت کرتے ہیں اور مجھ سے پیار کا ڈھونگ اور شادی تو صرف اپنی ماں کا دل خوش کرنے کے لیے کی ہے جو گھٹنوں کے ساتھ دل کی بھی مریضہ تھیں۔ بقول ان کے' اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیں گے اور سیما کو اپنی دلہن بنا کر اس گھر میں لے آئیں گے۔ میں اس گھر میں اُس وقت تک ہی رہ سکتی تھی جب تک شاہد کی ماں زندہ تھیں۔

ڈاکٹروں نے شاہد سے کہا تھا کہ اپنی ماں کو ہر صورت خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ اُن کی ہر بات مانے اور اسے پورا کرے کیونکہ اُن کی سانسیں کبھی بھی رک سکتی تھیں۔ ڈاکٹروں کی یہ باتیں سن کر شاہد مشکل میں آ گئے تھے کیونکہ وہ سیما سے محبت کرتے تھے اور اس سے ہی شادی کرنا چاہتے تھے' پر ان کی ماں کسی صورت ایک طوائف کو اپنے گھر کی بہو بنانے پر تیار نہ تھیں۔ ماں کی خواہش تھی کہ شاہد کی شادی کسی اچھی اور نیک سیرت لڑکی سے ہو' خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو' دوسرا وہ جلد از جلد اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں کیونکہ انہیں خود بھی اپنی بیماری کا علم تھا۔ اپنی ماں کی طبیعت کی وجہ سے شاہد ان کی مرضی کے خلاف سیما سے شادی نہیں کر سکتے تھے اس لیے شاہد نے یہ ساری ترکیب سوچی تھی جس سے ان کی ماں بھی خوش ہو گئی تھیں اور وہ خود بھی مطمئن تھے۔

شاہد نے میرا انتخاب اس لیے کیا تھا کیونکہ میرے جیسی سادہ سی لڑکی اُن کی ماں کی پسند تھی۔ دوسرا اہم غریب تھے۔ مجھے طلاق دینے یا کسی زیادتی پر ہم غریب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہماری حیثیت اس امیر زادے کے آگے کچھ بھی نہیں تھی جو ان کے خلاف آواز اٹھاتے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ اگر اس بات کا پتہ ان کی ماں کو یا پھر کسی کو بھی ہوا تو وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو جان سے مار ڈالیں گے' بھلا میں یہ سب کسے بتاتی' اپنی بیمار ماں کو' غریب بھائی کو یا پھر شاہد کی نیک سیرت ماں کو جس کی سانسیں کبھی بھی تھم سکتی تھیں؟

میں دنیا کے سامنے شاہد کی بیوی بنی رہی' پر اندر ہی اندر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ میں اکثر وقت شاہد کی ماں کے ساتھ گزارتی' ان کی خوب خدمت کرتی' اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُن کا دل بہلاتی رہتی۔ بدلے میں وہ مجھے محبت اور ڈھیر ساری دُعائیں دیتیں اور اکثر کہتیں کہ ان سے ایسی کوئی نیکی ضرور ہوئی ہے جس کا ثمر خدا نے انہیں میرے روپ میں دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں کس اذیت میں مبتلا تھی۔

شاہد اپنی ماں کے سامنے مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے' میرے لیے طرح طرح کے تحفے لاتے' گھمانے کے نام پر باہر بھی لے جاتے لیکن کسی پارک میں چھوڑ کر خود سیما کے پاس چلے جاتے تھے۔ تنہائی میں وہ میری طرف نفرت اور حقارت کی نگاہ سے ہی دیکھتے تھے۔ بیوی ہونے کے باوجود انہوں نے مجھے

کبھی نہیں چھوا تھا۔ وہ بیڈ پر سوتے اور مجھے نیچے کارپٹ پر سونا پڑتا۔ انہوں نے مجھ سے پیار نہیں' ڈرامہ کیا تھا لیکن میں نے تو ان سے محبت کی تھی' مجھے ان کے اس رویے پر بہت تکلیف ہوتی تھی۔

دن اسی اذیت میں گزرتے رہے اور میری شادی کو سال بھر ہو گیا۔ اب شاہد کی ماں کو ہمارے بچے کی فکر ہونے لگی۔ وہ ہر بار شاہد اور مجھ سے بچے کے بارے میں سوال کرتیں' پر ہمیشہ شاہد جھوٹ بول کر ٹالتے رہتے۔

''امی.....! ہم نے سب ہی اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے' دونوں میں کوئی مسئلہ نہیں' بس یہ اوپر والے کے فیصلے ہیں' وہ جب مہربان ہو' تب بچہ بھی ہو گا۔''

میری شادی کے دو سال بعد مجھ پر ایک اور قیامت ٹوٹی جب مجھے پتہ چلا کہ مجاہد بھائی کراچی میں پولیس کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ میری اماں تو میری شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چل بسی تھیں اور بھائی یہ کہہ کر کراچی چلے گئے تھے کہ انہیں وہاں ایک اچھی فیکٹری میں کام مل گیا ہے' پر انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا' انہیں کسی فیکٹری میں کام نہیں ملا تھا بلکہ وہ ڈاکہ اور چوری کرنے والے ایک خطرناک گروہ میں شامل ہو کر اس برے دھندے میں لگ گئے تھے۔ ایک دن پولیس نے ان کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا جس میں بھائی پولیس کی گولی کا نشانہ بن گئے جبکہ گروہ کے باقی لڑکے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اس صورت حال میں اب میرا آخری سہارا بس شاہد کی ماں رہ گئی تھیں۔ میں دن رات ان کی لمبی عمر کی دُعائیں مانگتی اور ہر صورت انہیں خوش رکھنے میں لگی رہتی مگر میری یہ تمام کوششیں اس وقت رائیگاں چلی گئیں جب ایک رات وہ خاموشی سے چلی گئیں۔ انہیں نیند کی حالت میں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ یوں میری شادی کو ابھی بمشکل دو برس ہی ہوئے تھے کہ یہ میرا آخری سہارا بھی چلا گیا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی مجھے ہول آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

ماں کا سوئم ہوتے ہی شاہد' سیما سے شادی کر کے اسے گھر لے آئے۔ میں نے سیما کو پہلی بار دیکھا تھا' وہ معمولی شکل' سانولے سے رنگ کی تقریباً پینتیس برس کی ایک پختہ عورت لگ رہی تھی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کی وجہ سے شاہد اس کے لیے دیوانے تھے۔

ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے جسم سے جان سی نکل گئی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کے نہ آنے کے لیے میں اپنے رب کے آگے کتنا روئی تھی' پر میری ساری دعائیں بے کار گئیں اور آج وہی گھڑی میرے سر پر تھی۔

شاہد طلاق دینے کے ارادے سے میرے قریب آئے۔ میں ان کے پیروں پر گر گئی۔ ''خدا کے واسطے'

نصیب

وہ پختہ اینٹ کی دیوار
پچھلے سال.....
اک ذرا سے ہوا کے جھونکے سے
یوں ڈھے گئی.....
جیسے.....
کوئی خوش بخت انسان
اچانک لٹ جائے.....
اپنے نصیب سے

شفق شیکی' سیالکوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے طلاق مت دیں۔ مجھے گھر سے مت نکالیں' میرا اس دنیا میں کوئی نہیں' مجھ پر رحم کریں..... میں کہاں جاؤں گی؟'' رو رو کر میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''مجھے اپنی نوکرانی بنا لیں' میں اپنے اور آپ کے رشتے کو بھول جاؤں گی' بس یہ یاد ہوگا کہ میں گھر کی نوکرانی ہوں۔ پہلے بھی آپ نے جیسا کہا' ویسا ہی ہوا' آگے بھی آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

جب شاہد کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے سیما کے پیروں پر سر رکھ دیا اور اس سے منتیں کرنے لگی۔ ساتھ ہی دل ہی دل میں یہ دُعا بھی کر رہی تھی کہ ان دونوں کا دل میرے لیے نرم ہو جائے' ان کے دل میں میرے لیے رحم آ جائے۔

خدا نے میری دُعا قبول کر لی۔ شاہد اس بات پر راضی ہو گئے اور سیما کی مرضی پوچھنے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بھی اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' اسے چھوڑ دو' ہم اسے اپنی خادمہ بنا کر رکھیں گے۔'' میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

اگلے ہی روز وہ دونوں ہنی مون منانے سنگاپور چلے گئے۔ ایک ماہ کے بعد ان کی واپسی ہوئی پھر دھیرے دھیرے سیما گھر کے تمام نوکروں کو نکالتی چلی گئی۔ یہ سارے پرانے اور وفادار نوکر تھے جن سے شاہد کی ماں بہت محبت کرتی تھیں' یہاں تک اس نے ماسی کو بھی نکال دیا اور شاہد سے کہا تھا۔

''حسینہ..... اب گھر کو سنبھال لے گی۔'' شاہد اسے اف تک نہیں کہتے تھے' اسے دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ اب سیما نے پوری طرح مجھے گھر کی نوکرانی بنا دیا تھا۔ گھر کے تمام کام میرے ذمے تھے۔ صفائی' کپڑے دھونا' کھانا پکانا' لان کی دیکھ بھال' یہاں تک کہ باہر سے جو بھی سودا منگانا ہوتا' وہ بھی مجھے ہی لانا پڑتا۔ کام ختم کرنے کے بعد بیٹھنے اور رات کو سونے کے لیے میرے لیے کچن تھا۔ پہننے کے لیے سیما نے اپنے دو پرانے جوڑے دے رکھے تھے اور کھانے میں جو بچتا' وہ ہی میرا نصیب ہوتا۔ میں اکیلی اتنے بڑے گھر کے تمام کر کر کے بیمار پڑ جاتی' پر طلاق اور گھر سے نکالے جانے کے خوف سے مجبوراً مجھے سب برداشت کرنا پڑتا تھا۔

ایک دن سیما میرے پاس آئی اور جو کچھ اس نے کہا' اسے سن کر میں گنگ رہ گئی۔

''سنو' تم جانتی ہو' میں ایک طوائف رہ چکی ہوں اور طوائف کا دل کبھی ایک مرد سے نہیں بھرتا اس لیے شاہد کے کام پر جاتے ہی اب میرا دل بہلانے کے لیے مرد آیا کریں گے۔ اس بات کا علم شاہد کو نہیں ہونا چاہیے ورنہ نتیجے کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔''

میں سیما کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے شاہد جیسا وفادار' محبت کرنے والا اور دولت مند شوہر ملا تھا جس نے سیما جیسی طوائف سے شادی کر کے اسے عزت بھی دی تھی۔ سیما کو تو شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ شاہد نے اسے گندگی سے نکالا تھا مگر گندگی کا کیڑا گندگی کو ہی پسند کرتا ہے۔ اب مجھے یہ بات سمجھ آئی تھی کہ سیما نے گھر کے تمام نوکروں کو کیوں نکالا تھا۔ محض اس لیے کہ وہ سیما کے پاس طرح طرح کے مردوں کو آتا دیکھتے تو اس بات کی خبر شاہد کو کر دیتے اور میرا کیا تھا' میرے دیکھنے نہ دیکھنے سے سیما پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا کیونکہ شاہد میری بات پر اعتبار نہیں کرتے۔ میں ایک کمزور لڑکی تھی' بے بس' بے گھر اور لاوارث..... بھلا اسے مجھ سے کیا ڈر ہوتا' ہمیشہ دھمکی دے کر مجھے چپ ہی کرایا گیا تھا۔ پہلے شاہد نے اپنے کام کے لیے مجھے استعمال کیا' اب سیما استعمال کر رہی تھی۔

بہر حال سیما نے اپنا دھندہ دوبارہ شروع کر دیا۔ شاہد کے کام پر نکلتے ہی سیما اپنے کام سے لگ جاتی'

اس کے پاس بھانت بھانت کے مرد آتے تھے' مردوں کی یوں آمد و رفت سے گھر طوائف خانہ بن گیا تھا۔ یہ سب مجھے بہت برا لگتا تھا۔ پر میں کیا کر سکتی تھی؟ یہ راستہ تو شاہد نے خود چنا تھا۔ اپنی ماں کا کہا نہ مان کر انہوں نے ایک پیشہ ور طوائف سے رشتہ جوڑا تھا' طوائف جو ہر لمحے مرد بدلتی ہے' وہ بھلا ایک مرد پر کیا قناعت کرتی۔ اگر میں اصل بات شاہد کو بتا بھی دیتی تو بھی وہ میرا یقین نہیں کرتے' الٹا مجھے بے گھر ہونا پڑتا۔ میرے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا بھی نہیں تھا جو میری بات کی تصدیق کرتا' بس ایک چوکیدار تھا جو رات کو ڈیوٹی دے کر صبح اپنے کمرے میں سونے چلا جاتا تھا اور سیما کا کام تو صبح سے شروع ہوتا تھا' یوں وہ اپنی من مانی کرتی رہی۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

میری شادی کے بعد سے شاہد کا رویہ میرے ساتھ کبھی اچھا نہیں رہا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے کبھی بھی محبت یا نرمی نہیں دیکھی تھی۔ ان کا سلوک میرے ساتھ ہمیشہ روکھا پھیکا ہی رہا تھا مگر کچھ دنوں سے میں محسوس کرنے لگی تھی جیسے ان کے رویے میں بدلاؤ آتا جا رہا ہے۔ ان کے برتاؤ میں نرمی آتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی بھی مجھے محبت سے نہیں دیکھتے تھے' جب بھی دیکھا' نفرت اور حقارت کی نگاہ سے ہی دیکھا لیکن اب ان کی نگاہوں میں مجھے اپنے لیے محبت کی دمک نظر آتی تھی۔ وہ اکثر چور نگاہوں سے مجھے میٹھی نظروں سے دیکھتے تھے اور جب میری نظر ان کی نظر سے ٹکراتی تو وہ سٹپٹا کر نگاہیں جھکا لیتے۔ میں اس بدلاؤ کی وجہ تو نہیں جانتی تھی' پر یہ تبدیلی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

ایک رات کچن کا کام کرتے کرتے مجھے بہت دیر ہو گئی تھی کیونکہ شام کو سیما کی سہیلیاں آئی تھیں' وہ رات کا کھانا کھا کر ہی گئی تھیں۔ کھانا بنانے اور پھر کچن صاف کرنے میں مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس رات سردی بھی بہت تھی' میرے کپڑے بھی کام کرنے میں گیلے ہو چکے تھے۔ اوڑھنے کے لیے سیما نے ہلکی سی چادر دے رکھی تھی جس سے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ دوسرے دن رات کام کرنے سے میرے ہاتھوں میں جگہ جگہ زخم ہو گئے تھے' ان میں بھی بہت دُکھن ہو رہی تھی۔ میں سردی سے کانپ بھی رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کو سہلا بھی رہی تھی۔ اچانک میری نظر سامنے گئی جہاں شاہد نجانے کب سے کھڑے مجھے غور سے دیکھے جا رہے تھے پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے میرے بالکل نزدیک آ گئے اور میرے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ میری ازدواجی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ میرے اتنے نزدیک آئے تھے اور مجھے چھوا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے پر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا پھر وہ تیزی سے پلٹے اور باہر کی جانب چلے گئے۔ شاہد کے جانے کے بعد بھی جانے کب تک میرا دل یوں ہی زور زور سے دھڑکتا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا شاہد اب مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں؟ کیا اب انہیں احساس ہو رہا ہے کہ میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے؟ میرے اندر کئی سوال اٹھ رہے تھے جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ خیر' جو کچھ بھی ہو رہا تھا' مجھے بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

وہ پیر کا دن تھا۔ شاہد کو آفس گئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ سیما اپنے بیڈ روم میں ایک مرد کے ہمراہ دل بہلا رہی تھی اور میں ہمیشہ کی طرح باہر ان کی رکھوالی کا کام کر رہی تھی۔ دوسرے کاموں کے ساتھ یہ کام بھی میرے ذمے ہوتا تھا۔ سیما کے پاس دو موبائل فون تھے' جب بھی وہ اس کام میں مصروف ہوتی تو ایک فون مجھے دے دیتی تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو یا شاہد اچانک آ جائیں تو گیٹ پر ان کی گاڑی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہارن کی آواز سنتے ہی میں انہیں فون پر آگاہ کردوں اور وہ سب سنبھال لے اور اپنے ساتھ دل بہلاتے مرد کو کہیں چھپا دے۔

سیما کو کمرے میں گئے ہوئے ابھی آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ اچانک گولی کی آواز سن کر میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا' گولی کی آواز شاہد اور سیما کے بیڈروم سے آئی تھی اور وہاں سے چیخنے اور شور کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ میں اس طرف بھاگی اور ابھی کمرے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ تیزی سے دروازہ کھلا اور وہی مرد جو سیما کے ساتھ کمرے میں تھا' وہ کمرے سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے تھے جو وہ پہن نہیں سکا تھا۔ وہ باہر کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ میں تیزی سے کمرے میں گھس گئی۔ باہر کا منظر تو میں دیکھ چکی تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کر تو میں سکتے میں رہ گئی تھی۔ اگر میں نے مضبوطی سے کمرے کے دروازے کو تھام نہ لیا ہوتا تو میں چکرا کر گر پڑتی۔

سیما بیڈ پر قابلِ اعتراض حالت میں بیٹھی تھی۔ خوف سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ اس کے بالکل سامنے شاہد پستول تانے کھڑے تھے۔ شاہد کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ سیما کو غصے سے گھور رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جس گولی کی آواز مجھے سنائی دی تھی' وہ شاہد کے پستول سے نکلی تھی لیکن اس گولی نے کسی کی جان نہیں لی تھی بلکہ شاہد نے سیما اور اس کے آشنا کو خوف زدہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی جو ایک دوسرے کے ساتھ شیطانی کھیل میں مصروف تھے۔ میری نظر اس وقت بیڈ کے ساتھ والی کھڑکی پر پڑی جو کھلی ہوئی تھی' پر نجانے کیسے شاہد ان سلاخوں کو ہٹا کر اندر داخل ہوئے تھے۔

"کمینی عورت..... تیرے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا؟" شاہد نے غصے سے سیما سے کہا۔ "بدذات عورت..... تو نے میرے گھر کو طوائف خانہ بنا دیا..... تو وہ گندی نالی کا کیڑا ہے جو صاف ستھری جگہ میں جی نہیں پاتا..... تو نے یہ سوچا بھی کیسے کہ مجھے تیری عیاشیوں کا پتہ نہیں چلے گا؟ مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا جب تو ایک ایک کر کے گھر کے تمام نوکروں کو نکالتی چلی گئی....." پھر شاہد رونے لگے۔ "اپنی عیاشیوں کے لیے تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ اتنے بڑے گھر کا یہ سارا کام ایک اکیلی حسینہ کیسے کر پائے گی؟" پہلی بار ان کی زبان پر میرا نام آیا تھا۔ "اب بہت ہو چکا..... آج تیرا آخری دن ہے....." یہ کہہ کر شاہد نے ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی۔ اسی وقت مجھ میں نجانے کیسے ہمت آ گئی اور میں نے ان کے ہاتھ کا رخ دوسری جانب کر دیا اور اگلے لمحے میں شاہد کے قدموں میں گر پڑی۔

"شاہد.....! خدا کے واسطے' سیما کو چھوڑ دو۔"

"اس کو چھوڑ دوں؟" شاہد' سیما کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چیخے۔ "اس ذلیل عورت کو چھوڑ دوں جس نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا جو میری محبت کے بدلے مجھے دھوکہ دیتی رہی؟ اس کی وجہ سے میں اپنی ماں سے جھوٹ بولتا رہا' اس کی وجہ سے میں تم پر ظلم کرتا رہا اور تم کہتی ہو' اسے چھوڑ دوں؟"

شاہد کے سر پر خون سوار تھا لیکن میری منتوں کی وجہ سے شاہد نے سیما پر گولی نہیں چلائی لیکن اسے اسی وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دیا پھر وہ میرے قدموں میں گر گئے اور معافی مانگنے لگے۔ میرے لیے یہ ہی کافی تھا کہ انہیں میرا احساس ہو گیا تھا۔

بعد میں' میں نے اُن تمام پرانے نوکروں کو پھر سے رکھ لیا۔ دو سال بعد خدا نے ہمیں بیٹے اور بیٹی سے نوازا۔ شاہد مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں اب بہت خوش ہوں۔ یہ سچ ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ وہ پاک پروردگار اپنے بندوں کی تمام دُعاؤں کو سنتا ہے' بس اُن دُعاؤں کی قبولیت اپنے وقتِ مقررہ پر ہوتی ہے۔

انیلہ امام بخش

دہلیز کے پار

یاسمین صبا کا خیال

بجھ گئی شام تو پھر دیپ جلانا کیسا
سو گئی رات تو پھر اشک بہانا کیسا

اندھی محبت کے ہاتھوں لٹ جانے والی ایک حرماں نصیب کا عبرت اثر قصہ

جیل کی اس کال کوٹھری میں میرے چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا ہے مگر اس سے زیادہ اندھیرا میرے اندر ہے جہاں امید' خوشی' امنگ یا کسی بھی روشن جذبے کی ہلکی سی رمق بھی نہیں ہے' ویسے بھی مجھے اب روشنی کی چاہ بھی نہیں ہے' یہ اندھیرے ہی میرا مقدر ہیں جنہیں میں نے خود اپنے نصیب کا حصہ بنایا ہے۔

میں سینٹرل جیل کراچی میں عمر قید کی سزا کاٹنے والی ایک قیدی ہوں۔ یہ سزا مجھے اپنے شوہر کا قتل کرنے پر ملی ہے۔ جی ہاں' میں اپنے شوہر کی قاتل ہوں مگر اپنے اس عمل پر مجھے کوئی پچھتاوا یا ندامت نہیں ہے کیونکہ میں نے ایسے شیطان صفت انسان کو موت کے گھاٹ اتارا ہے جس نے مجھے اپنی جھوٹی محبت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرفریب جال میں پھنسا کر میری زندگی برباد کی تھی۔

میرا نام زینب ہے اور میری بربادی کی داستان کا آغاز اس وقت ہوا جب میں امجد کی محبت میں پاگل ہوئی۔ میں جس علاقے میں رہتی تھی' امجد وہاں دکانوں پر کنفیکشنری کا مال سپلائی کرنے آتا تھا۔ وہ کسی کمپنی میں سیلز مین تھا۔ میں روز ہی اسے اپنے گھر کی کھڑکی یا دروازے سے دیکھتی تھی۔ اس کی شخصیت مردانہ وجاہت سے مالا مال تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا تھا اور جواب میں' میں بھی مسکراتی۔ اس طرح میری اور امجد کی محبت کی شروعات ہوئی تھی پھر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں بہانہ بنا کر بازار جاتی جہاں وہ میرا منتظر ہوتا تھا اور پھر ہم کسی ریسٹورنٹ میں وقت گزارتے تھے۔ امجد کا گھر گاؤں میں تھا اور وہ شہر میں کمانے کی غرض سے آیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔ اس کے بیوی بچے گاؤں میں تھے۔ اس کی بات سن کر مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر اس حقیقت کے جاننے کے بعد بھی میری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں اب بھی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی بلکہ اب تو وہ مجھے اور بھی اچھا لگنے لگا تھا کہ اس نے اپنے متعلق کچھ نہیں چھپایا تھا اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ اب میں نے شدت سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ میرے گھر رشتہ بھیجے۔ وہ بھی رشتہ بھیجنے پر راضی تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے چھپ کر یہ شادی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے والدین اس کی دوسری شادی کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے لیکن امجد کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد وہ ماں باپ کو بتا دے گا اور معافی مانگ لے گا۔ اب اس صورتِ حال میں اس کے والدین تو میرے گھر رشتہ کے لیے آ نہیں سکتے تھے چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد امجد کے ذہن میں اپنے ایک دوست کا خیال آیا پھر اس نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کو ہمارے گھر میرے رشتے کے لیے بھیجا مگر میرے ابو نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر لڑکے کے ماں باپ آئیں تو یہ رشتہ قابلِ قبول ہوگا حالانکہ ابو کے انکار کی وجہ درست تھی مگر اس وقت مجھ پر محبت کا بھوت سوار تھا اس لیے مجھے ان کا فیصلہ کھل رہا تھا۔ ماں باپ اپنے بچوں کا بھلا چاہتے ہیں مگر نادان اولاد انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگتی ہے۔ ان حالات میں اب جائز طریقے سے شادی ہونا تو ممکن نہیں تھا لہٰذا میں نے امجد کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے پلان بنایا تھا کہ دوسرے شہر جا کر کورٹ میرج کر لیں گے اور وہیں رہائش اختیار کر لیں گے۔ جس رات امجد کے ساتھ مجھے بھاگنا تھا' اس وقت میرے ضمیر نے مجھے جھنجوڑنے کی بہت کوشش کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ یہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں؟ اپنے والدین کی عزت پیروں تلے روند رہی ہوں۔ میرے اس عمل کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میرے بھائی جو آج سر اٹھا کر چلتے ہیں' ان کا لوگوں سے نظریں ملانا محال ہو جائے گا۔ میری چھوٹی بہنوں کو کوئی بیاہنے نہیں آئے گا' کوئی ان سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوگا اور وہ اسی طرح شادی کی آس میں بوڑھی ہو جائیں گی۔ میرے کیے کی سزا میرے گھر والے بھگتیں گے' میرا نام ان کے لیے گالی بن جائے گا۔ میرے ولدین زندہ درگور ہو جائیں گے۔ میرے لیے ان کے دل سے ہمیشہ بددعائیں نکلیں گی۔ غرض میرا ضمیر مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا مگر دوسری طرف میرا پاگل دل امجد کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔ آخر ضمیر ہار گیا اور پاگل عشق جیت گیا اور میں اُس اندھیری رات میں ماں باپ کی دہلیز پار کر گئی۔ آج بھی اُس گھڑی کو کوستی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟

امجد نے لاہور میں پہلے ہی اپنے ایک دوست کی مدد سے ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ہم نے کورٹ میرج کر لی۔ میں امجد کو پا کر بے انتہا خوش تھی مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

ایک دن امجد نے مجھ سے کہا۔ ”تم تیار ہو جاؤ' ایک دوست کی طرف چلنا ہے۔“

”امجد' ٹائم دیکھا ہے' رات کے گیارہ بج رہے ہیں' تیار ہونے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا' یہ ٹائم کسی کے گھر جانے کا نہیں ہوتا۔ لوگ اس وقت سوتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں' کل چلے جائیں گے۔“ میں نے امجد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم آدھے گھنٹے میں تیار ہو جاؤ' یہیں نزدیک ہی ہے گھر۔“ مجبوراً مجھے تیار ہو کر جانا پڑا۔ جب ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا' وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ہم دونوں اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آدمی مجھے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے میں انسان نہیں' کوئی بکاؤ مال ہوں۔

”امجد' مال تو زبردست لائے ہو' اس کی تو تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔“ اس آدمی نے غلیظ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ امجد اس کی بات پر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اور میں حیرت و صدمے سے گنگ رہ گئی تھی پھر امجد مجھے اس آدمی کے حوالے کر کے چلا گیا۔ میں بہت روئی' چلائی' امجد کو اپنی محبت کے واسطے دیئے مگر اس شیطان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”صرف ایک رات کی بات ہے' صبح آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ خبیث چلا گیا۔

اس رات میری عزت' محبت کی بھینٹ چڑھ گئی' میری روح گھائل ہو گئی' سزا تو آخر مجھے ملنی تھی' میں نے اپنے والدین کی عزت کو رسوا کیا تھا پھر بھلا میری عزت کیسے محفوظ رہتی؟

اگلی صبح امجد مجھے لینے آیا اور میں اپنے کھوکھلے وجود کو لے کر گھر آ گئی پھر یہ گھناؤنا سلسلہ شروع ہو گیا' مجھے نے مجھے کمائی کا ذریعہ بنا لیا تھا' وہ زبردستی مجھ سے پیسے کمواتا' میری عزت روز پامال ہوتی اور میں اپنے گھر والوں کو یاد کر کے روتی تھی۔ اُن کے پاس واپس جا بھی سکتی تھی' کس منہ سے جاتی اور اگر چلی بھی جاتی تو کیا وہ مجھے قبول کرتے؟ میں کئی دن تک یہ سب

خراج

سنو عاطر!
جب آنسو بے وجہ بہنے لگیں
بے بسی حد سے بڑھے
تو جان لینا
کسی نے تم سے
محبتوں کا خراج مانگا ہے

محمد آصف عاطر۔ کوہاٹ

کچھ برداشت کرتی رہی اور پھر اس سے بچنے کے لیے میں نے ایک فیصلہ کر لیا' مجھے امجد سے جتنی محبت تھی' اس سے کہیں زیادہ نفرت ہو گئی تھی اسی لیے میں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اس کراہیت آمیز اور ذلت والی زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ امجد کی موت ہی مجھے اس گناہ آلود زندگی سے چھٹکارہ دلا سکتی تھی پھر ایک رات جب حسبِ معمول امجد مجھے ایک گاہک کے پاس لے جانے کے لیے تیار تھا' میں نے ایک تیز دھار خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ اس خنجر کا بندوبست میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ امجد کو مارنے کے بعد میں نے تھانے جا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ عدالت نے مجھے عمر قید کی سزا سنا دی۔

امجد کو مارنے کا مجھے کوئی افسوس یا پچھتاوا نہیں ہے۔ دکھ ہے تو یہی کہ اس کی جھوٹی محبت کے جھانسے میں آ کر میں نے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر لی۔

کلیوں جیسی معصوم بچیوں سے میری یہی گزارش ہے کہ کبھی کسی کی جھوٹی محبت میں آ کر اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کریں۔ اگر آپ ایک بار گھر سے نکل جاتی ہیں تو پھر پوری دنیا میں کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازنین رضا

تلافی ہو نہیں سکتی

الماس روحی کا خیال

اب نہ ساحل ہے نہ منظر ہے نظر کے سامنے
جس میں کشتی تھی وہ بحرِ بیکراں جاتا رہا

بھائی تو محافظ ہوتے ہیں مگر اس نے اپنی ہی بہن کا گھر اُجاڑ ڈالا تھا

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا' ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو کشمالہ نے خمیل کو گھر سے رخصت کیا تھا اور اب اسے خون سے لت پت حالت میں اسٹریچر پر لاد کر گھر لایا گیا تھا۔ رمل اور شائل' باپ کے چہرے کو دیکھتے اور پھر ماں سے لپٹ جاتے تھے۔ کشمالہ تو جیسے پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی' آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے' بس ایک ٹک خمیل کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔

''اسے صدمے سے سکتہ ہو گیا ہے۔''

''ہائے...... بے چاری نے ابھی تو رخصت کیا تھا

گھر سے۔''

''ہوش میں آؤ کشمالہ' تمہارے بچے بلک رہے ہیں' انہیں سنبھالو۔''

''ہائے...... جوان جہان بیوہ ہو گئی۔ کسے پتہ تھا کہ آج کا سورج اس کے لیے یہ صدمہ لائے گا۔'' ہمدردی کے جذبات سے بھرے جملے اسے سنائی دے رہے تھے مگر ان میں کوئی اپنا یا ماں جایا نہیں تھا جس کے کاندھے پر سر رکھ کر وہ اپنا دکھ آنسوؤں میں بہا سکے۔

•......•......•......•

''ارے' کیا بات ہے' آج آپ بہت موڈ میں ہیں؟'' کشمالہ نے خمیل کو بڑے چاؤ سے دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

''بس جب رمل اور شائل کو دیکھتا ہوں نا تو دل میں ایک ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری محبت کے پھول اتنے خوبصورت ہوں گے' میں نے سوچا بھی نہ تھا۔'' خمیل نے اپنے سوئے ہوئے بچوں پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''محبت کے پھول تو ہوتے ہی خوبصورت اور خوش رنگ ہیں اور جتنی محبت آپ نے مجھے دی' اس سے تو ایسے پھولوں سے پورا گلستان بھی بھر جائے تو کم ہے۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''یار' مجھے تو بس دو ہی پھول چاہیے تھے اپنے گلستان کو مہکانے کے لیے۔'' خمیل نے مسکراتے ہوئے دودھ کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے تو......'' کشمالہ کہتے کہتے جھجکی۔ خمیل نے اچٹتی سی نگاہ کشمالہ پر ڈالی۔ وہ کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھتے ہوئے خمیل بھی مسکرا دیا۔

•......•......•......•

خالد اور عابد اب تک اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے تھے۔ راہ چلتے ہوئے ہر نگاہ انہیں چبھتی سی محسوس ہوتی۔ اس بات کو آٹھ سال ہو چکے تھے مگر وہ بھول نہیں پائے تھے۔ کئی بار وہ شہر گئے مگر ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ان دنوں عابد کے سالے کی شادی ہونے کو تھی اور عابد کی بیوی ضد کر رہی تھی کہ شاپنگ شہر سے ہی کروں گی۔ شاپنگ کرتے کرتے مومنہ بہت تھک گئی تھی۔

''عابد' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

''اوہ' اچھا' اچھا' مجھے پتہ ہے' تمہیں بھوک بہت لگتی ہے۔'' عابد نے بیوی کو ایک ریسٹورنٹ میں بٹھایا اور خود آرڈر دینے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا مگر اس سے پہلے جو شخص پارسل اٹھا کر باہر نکلا' عابد کی نگاہ اس پر جمی کی جمی رہ گئی۔ اس نے جلدی سے آرڈر دیا اور بیوی کی طرف بھاگا۔

''مومنہ......! تم یہیں بیٹھو' میں آتا ہوں۔''

مومنہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''مگر تم کہاں جا رہے ہو؟''

''وو...... وہ...... مجھے میرا بہت پرانا دوست نظر آ گیا ہے' میں ذرا اس سے مل لوں' کہیں دور نہ نکل جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے بڑھا اور شیشے سے بنا ریسٹورنٹ کا ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔

•......•......•......•

آج خمیل اور کشمالہ کی شادی کی سالگرہ تھی۔ خمیل کیک اور گرم گرم تکے لے کر گھر پہنچا تو اس کا بیٹا رمل اسے دروازے پر ہی مل گیا۔ رمل ٹیوشن پڑھ کر گھر لوٹا تھا۔

''ابو......! شاپر میں کیا ہے' بہت تیز خوشبو آ رہی ہے؟'' اس نے شاپر کو لیتے ہوئے اس کے اندر جھانکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شش......" جمیل نے منہ پہ انگلی رکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں جواب دیا۔ "ذرا سا صبر کرو' ابھی بتاتا ہوں۔" اتنے میں پانچ سالہ شمائل نے دروازہ کھول دیا۔

خوبصورت فراک پہنے ہوئے اور قرینے سے دو پونی باندھے شمائل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے جھک کر ایک ہاتھ سے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھالیا اور رِل کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر دالان سے گزرتا ہوا کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

سفید کاٹن کے سوٹ میں پتلی' نازک سی کشمالہ لمبے بالوں کی ادھ کھلی سی چوٹی بنائے کچن میں چائے بنانے میں مصروف تھی۔ جمیل نے چپکے سے بڑھ کر اپنے دونوں بازو کشمالہ کی کمر میں حمائل کردیئے۔ کشمالہ چونک سی گئی اور پھر پشت ہی سے کھڑے کھڑے آناً فاناً جمیل نے ایک ہلکا سا بوسہ اس کے رخسار پر ثبت کردیا۔ کشمالہ خود کو چھڑانے میں مصروف تھی۔ جمیل نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

"Happy Wedding anniversary"

کشمالہ شرم سے گلابی ہوگئی اور بانہوں کا حصار ڈھیلا پڑتے ہی جمیل کی جانب رخ کرکے اس کے گلے لگ گئی۔ اس کے ہلکے گلابی make up کے touch میں اس کی گلابی رنگت نے اور خوبصورتی بھردی تھی۔

جمیل نے شانوں سے پکڑ کر اسے خود سے دور کرتے ہوئے کہا۔ "کشمالہ' تم آج بھی پہلے جیسی ہی حسین ہو۔"

"اور آپ کی شوخیاں بھی۔" کشمالہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

•......•......•

"گاڑی آہستہ چلاؤ عابد' کیا ہوا ہے؟ ... گھبراہٹ ہورہی ہے۔ کیا جلدی ہے آ... کو؟" مومنہ پریشانی سے بول رہی تھی۔

"کچھ نہیں تو چپ کر کے بیٹھ میرا سر نہ کھا۔" عا... کا غصہ دیکھ کر مومنہ نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی اور دل ہی دل میں جو کچھ بھی یاد تھا' ہراساں ہوکر سب کا ورد کرنے لگی۔ عابد بھی پسینے پسینے ہورہا... اور گھر پہنچتے ہی اپنے بستر پر اوندھا ہوکر گر گیا۔ مومنہ پریشان تھی' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ عا... کو اچانک کیا ہوگیا تھا؟

•......•......•

سالگرہ کی چھوٹی سی گھریلو تقریب ختم ہونے ... بعد جمیل اپنے بستر پر گیا تو کشمالہ اپنے ماضی کو یا... کرکے آزردہ ہوگئی۔

"جمیل' کاش...... وہ تمہیں اور تمہاری قابلیت ... جانتے۔ کاش...... وہ تمہیں لاوارث اور بے آ... ہونے کا طعنہ دے کر گھر سے نہ نکالتے...... کاش ... میری اور تمہاری محبت کی سچائی کو جا... پاتے۔" کشمالہ دھیرے دھیرے ماضی میں گم ہو... گئی۔

•......•......•

اس روز کشمالہ کے والد اپنے دوست کے بیٹے ... گھر لائے تھے جس کے والدین ایک حادثے میں انتقال کرگئے تھے۔ جمیل کے والد موچی تھے۔ دونوں میاں' بیوی خریداری کے دوران دہشت گردی کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس شہر میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا نہ کوئی ہمدرد اور نہ کوئی رشتہ دار۔ کشمالہ کے ابو کو ... ہوا تو فوراً اس کے گھر پہنچے اور یتیم بچے کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔

امی ذرا تنگ ذہن کی تھیں' اپنے بیٹوں اور ... میں بہت فرق کیا کرتی تھیں اور اسی وجہ سے جمیل ... خالد کے درمیان ڈرا ڈرا سا رہتا تھا۔ وہ اسے اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے مگر ابو کی رحم دلی کی عادت اللہ نے کشمالہ میں سمو دی تھی۔ وہ جمیل کا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔ اپنے حصے میں سے اس کو حصہ دینا' اس کی کتابوں کا خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

ابو نے جمیل کو اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ وہ 13 سال کا تھا اور کشمالہ 10 برس کی جبکہ عابد 13 اور خالد 9 سال کا تھا۔ جمیل بہت دل لگا کر پڑھتا تھا جبکہ عابد اور خالد پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ وہ تنگ کرنے کے لیے امتحان کے دنوں میں بھی جمیل سے کام لیا کرتے تھے اور اس کے باوجود بھی وہ امی کے کاموں میں مدد کردیا کرتا تھا۔

وقت اسی طرح بیتتا رہا' نہ جانے کب کشمالہ اور جمیل کے درمیان ہمدردی کے جذبے نے محبت کا رنگ پکڑلیا۔ جب وہ 21 سال کی تھی تو اس کے رشتے آنے لگے۔ امی بھی اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں مگر ابو کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے انہوں نے کشمالہ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کا سوچ رکھا تھا پھر امی اور بھائیوں کے اختلاف کے باوجود ابو نے جمیل کا اور اس کا رشتہ طے کردیا۔ اس رشتے پر کشمالہ بہت خوش تھی مگر اس کی امی اور بھائی خوش نہیں تھے۔ اس رشتے کے بعد کئی بار جمیل کو اس کی کم مائیگی کا احساس دلایا گیا مگر وہ خاموشی سے سب کچھ سہہ رہا تھا۔ ابو کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا اور ان کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

ابو اس کو حوصلہ دیا کرتے تھے۔ "تمہاری تعلیم مکمل ہونے اور اچھی ملازمت مل جانے کے بعد میں جلد تم دونوں کی شادی کردوں گا' ویسے تو میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے' آبائی زمینیں اور ان سے آنے والی آمدنی میں عابد' خالد اور کشمالہ برابر کے حصے دار ہیں اور کشمالہ کا سب کچھ تمہارا ہی ہوگا مگر میں چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوجاؤ پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" کشمالہ بھی اشاروں کنایوں میں اسے تسلیاں دیا کرتی تھی۔ جمیل ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا جس سے اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہونے لگے تھے۔

ایک رات ابو کو دل کا دورہ پڑا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا اور وہ دونوں کی محبت کو منزل تک پہنچانے سے پہلے ہی دنیا چھوڑ گئے۔ ابو کے جانے کے بعد جمیل بہت اکیلا ہوگیا تھا۔

ابو کے چہلم کے بعد جب مہمان چلے گئے تو عابد نے جمیل کو صاف صاف کہہ دیا۔ "دیکھو جمیل! تم ہماری ذات برادری کے نہیں' ایک کمی کمین کے بیٹے ہو۔ ہم اب تک اپنے والد کی وجہ سے خاموش تھے مگر اب تم اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے چلتے بنو...... اور جانے سے پہلے یہ جان لو کہ کشمالہ تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آسکتی' ویسے بھی ہمارے ماموں نے کشمالہ کا رشتہ مانگا ہے جسے ہم نے تقریباً قبول کرلیا ہے لہٰذا اب ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں......"

"مگر عابد' تم سب مجھ سے تعلق توڑ بھی لو تو تمہارے والد کے احسانات کا پاس مجھے تم سب سے ناطہ جوڑنے پر مجبور کرتا رہے گا اور پھر کشمالہ میری منگیتر ہے' تمہارے کہنے پر میں یہاں سے چلا تو

مثال

استاد: "ہم نے اپنے اعداد و شمار عربوں سے لیے، اپنی جنتری رومنوں سے لی، اور اپنا بینکاری نظام اطالویوں سے لیا۔"
زاہد: "تم کوئی اور مثال دے سکتے ہو؟"
زاہد نے کہا۔ "جی ہاں، ہم نے استری رحمان صاحب سے لی اور جہاز ومسز بیگ کے گھر سے لی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاؤں گا مگر تمہیں اپنے ابو کے فیصلے کا پاس رکھنا چاہیے اور کشمالہ کا ہاتھ میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے۔'' جمیل نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ عابد چارپائی پر بیٹھا تھا' اس کی بات سن کر غصے سے کھڑا ہو گیا۔

''بس..... بس..... زیادہ تقریر کرنے کی ضرورت نہیں' جس قدر ہو سکے' یہاں سے دفع ہونے کی تیاری کرو..... ہم نسلی لوگ ہیں۔ تم جیسے لاوارث کو بہن کیسے دے دیں؟ جان بوجھ کر اسے کیچڑ میں نہیں گرا سکتے۔''

اُس وقت کشمالہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تمام باتیں سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے عابد' مجھے ایک رات کی مہلت دے دو' میں کل ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' عابد کاندھے پر رکھی چادر کو بڑے غرور سے جھٹک کر آنگن سے ہوتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اب امی کے بولنے کی باری تھی۔

''دیکھ جمیل' چھوٹا سا پالا ہے تجھے' پر تو ہے تو غیر نا' میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کشمالہ کا رشتہ اپنے بھائی کے گھر دوں گی۔''

جمیل نے بے بسی سے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا تھا جہاں کشمالہ اتنی دیر میں ایک فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اشارے سے اسے تسلی دی۔ پریشانی جمیل کے چہرے پر عیاں تھی' وہ سر جھکا کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

رات جب سب سو گئے تو کشمالہ نے اٹھ کر ایک خط لکھا۔

''جمیل.....!

میرے اور تمہارے سنجوگ کا فیصلہ میرے ابو کا تھا اور تم بھی جانتے ہو کہ میں تمہیں شدت سے چاہتی ہوں' جیون ساتھی کے روپ میں' میں نے صرف تمہیں سوچا ہے' میں کسی اور کو وہ درجہ نہیں دے سکوں گی جو تمہارے لیے میرے دل میں ہے۔ میں تو لڑکی ہوں اور مجھے اپنے گھر اور گھر والوں کو ایک دن الوداع تو کہنا ہی ہے تو کل کے بجائے آج ہی کیوں نہ یہ قدم اٹھا لوں؟ میں کبھی ایسا نہ سوچتی مجھ پر یہ فیصلہ جبراً مسلط کیا جا رہا ہے جسے میں تسلیم نہیں کر سکتی۔ تم کل ضرور چلے جانا مگر جانے کے بعد رات واپس آنا' میں تمہیں مسجد کے پیچھے والی گلی میں ملوں گی۔ تمہیں ان تمام احسانات کا واسطہ جو میرے ابو نے تم پر کیے' میرے والد کے عہد کو نبھانا۔

تمہاری کشمالہ

خط کو تہہ کر کے کشمالہ چپکے سے جمیل کے کمرے میں گئی جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ اس نے اس کی ادھ کھلی ہتھیلی پر رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کشمالہ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

وہ رات دونوں نے اپنے اپنے کمروں میں جاگتے ہوئے گزاری۔ صبح ہوتے ہی جمیل نے خالد اور امی کا شکریہ ادا کیا۔

''خالہ جی' میں نے اب تک جو بھی وقت اس گھر میں گزارا' اس میں مجھ سے کوئی بھی بھول چوک ہوئی ہو یا میں نے آپ کا' عابد اور خالد کا دل دکھایا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' مگر جواب میں اسے بے رخی اور نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ رو رہا تھا۔ کشمالہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی بے بسی سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بھی رواں تھے۔ اسے ابو بہت یاد آ رہے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ منظر نہ دیکھنا پڑتا۔

جمیل بنا ناشتہ کیے ہی گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس صرف اٹیچی تھی جس میں اس کے چند جوڑے رکھے تھے اور اس کی تعلیمی اسناد اور کچھ پیسے جو اس نے ٹیوشن پڑھا کر جمع کیے تھے۔

وہ دن بہت تکلیف دہ تھا جو کہ کرب سے لبریز گزرا تھا۔ رات ایک بجے کا وقت تھا جب کشمالہ نے اپنے چند زیورات جو ابو نے اس کے لیے بنوا رکھے تھے اٹھائے اور چند جوڑے کپڑوں کے لیے' ایک چھوٹی سی بنائی اور کچھ نقدی جو اس کے پاس موجود تھی' لے کر گھر کی دہلیز روتے روتے پار کر گئی۔

مسجد کے پچھواڑے جمیل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں وہاں سے اسٹیشن پہنچے اور آنے والی ٹرین کے ٹکٹ لے کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایک اسٹیشن پر اتر کر سب سے پہلے مسجد پہنچے۔ مسجد میں ان کا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد کشمالہ نے اپنے تمام زیورات فروخت کر کے ایک قصبے میں چھوٹا سا گھر لے لیا اور جمیل نوکری کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ جلد ہی اس کی قابلیت کے باعث اسے شہر میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھی تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور یوں ان کی مالی مشکلات میں کمی واقع ہو گئی۔ آج وہ دو بچوں کی ماں تھی اور خوشگوار اور آسودہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب انہوں نے گھر بھی بدل لیا تھا۔ رمل ایک اچھے اسکول میں پہلی جماعت کا طالب علم تھا اور شائل بھی نرسری میں پڑھ رہی تھی۔

کشمالہ اور جمیل رات دیر تک اپنے ماضی سے خوشگوار اور رنجیدہ یادوں کی مالا بنتے بنتے ایک دوسرے کی آغوش میں نیند کی وادیوں میں چلے گئے۔

وہ اتوار کا دن تھا' اسکول کی چھٹی تھی مگر چھٹی کے روز جمیل گھریلو ضروریات کی چیزیں لینے بازار کا چکر ضرور لگاتا تھا اور ہفتہ بھر کے pending کام بھی نمٹا دیا کرتا تھا۔ اسے ناشتہ کر کے نکلے ہوئے پون گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اس کی dead body کو گھر لایا گیا تھا۔ گولی دل کے مقام پر لگی تھی جس سے وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا اور کشمالہ کو اور بچوں کو زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔

•.....•.....•.....•

عابد واپسی پر بہت تیز گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا اور یوں بدحواسی سے گاڑی چلاتے ہوئے وہ سامنے سے آنے والے تیز رفتار ٹرک کی زد سے خود کو نہ بچا سکا۔ اس کی Hi-roof بری طرح تباہ ہو گئی تھی۔ زخمی حالت میں اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو hospital کے bed پر پایا۔ اس کا بدن چور چور تھا۔ اس نے اپنے جابجا پٹیوں سے بندھے وجود پر نظر ڈالی اور حرکت کرنے کی کوشش کی مگر اسے اپنے جسم کا وزن من بھر کا محسوس ہوا' وہ حرکت کے قابل نہیں تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی اور خالد کھڑے تھے۔ بیوی بری طرح رو رہی تھی۔ پورے پانچ دن بعد عابد کو ہوش آیا تھا۔ ایک ہفتہ بعد اس کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے اپنی ٹانگوں کو حرکت دی مگر وہ انہیں ہلا نہیں سکا تو گھبرا کر خالد کو آواز دی۔

''خالد..... !خالد..... !میری ٹانگیں.....''

''بھائی..... !بھائی..... !'' عابد کی پکار سن کر خالد تڑپ گیا اور بری طرح سے رو دیا۔

اس نے پاس جا کر بھائی کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی' حوصلہ کر۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔''

''کیا.....؟ میری ٹانگیں؟'' عابد کرب و اذیت سے چیخا۔

''ہاں بھائی' ہاں.....'' خالد نے بھائی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بتانے لگا۔ ''دونوں ٹانگیں ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو گئی ہیں' پر تو پریشان نہ ہو' میں ہوں ناں' تیرا سہارا' میں تیری بیساکھی بنوں گا۔'' وہ بری طرح رو رہا تھا۔

''نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا.....'' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر فوراً کمرے میں آئے اور اسے انجکشن دے دیا جس سے وہ ہوش سے بے گانہ ہوگیا۔

رات گئے جب اسے ہوش آیا تو اسے خود سے نفرت ہونے لگی' اپنے کیے پر وہ سخت نادم تھا۔ اس نے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا تھا اور ایک بار بھی اپنی ماں جائی کا نہ سوچا' اس کے بچوں کا نہ سوچا اور برسوں سے اپنے اندر سلگتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی ہی بہن کا گھر اجاڑ دیا۔ اس کے سائیں کو جان سے مار دیا' اس کے بچوں کو یتیم اور بہن کو بیوہ کر دیا۔ اللہ کی لاٹھی اس پر کس طرح چلی تھی' اسے ایسی ہی سزا ملنی چاہیے تھی۔

''اوہ' میرے خدا! یہ مجھ سے کیا ہوگیا؟ تیرا انصاف بھلا کیسے خاموش رہتا۔ میری یہی سزا تھی' یہی سزا ہونی چاہیے تھی۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے اور اس کے سر کے نیچے رکھے تکیہ کو بھگوئے جا رہے تھے۔

خمیل تو تمام فکروں سے آزاد یہ جہانِ فانی چھوڑ کر جا چکا ہے مگر مجھے تو اپنے اس اپاہج وجود کو تاحیات گھسیٹنا ہے۔ اسی لمحے اس نے ایک اہم فیصلہ کیا اور خالد کو پکارا۔

عابد نے خالد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''خالد' آج مجھے کشمالہ بہت یاد آ رہی ہے' کیا تو اسے میرے پاس لا سکتا ہے؟''

''مگر..... مگر بھائی' وہ ہمارے لیے مر چکی ہے' ہماری ماں اس کے لگائے ہوئے داغ کو برداشت نہ کر سکی اور اس کے انتظار میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور پھر جو کالک وہ ہمارے منہ پر مل کر گئی ہے' اس کی وجہ سے ہم آج تک منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔'' عابد کو بہن کی یاد میں روتا دیکھ کر خالد حیران تھا۔ آج بھائی کا غصہ کہاں گیا' اس کی آنکھوں میں کشمالہ کے نام پر جو نفرت امڈتی تھی' وہ کہاں ہے؟ شاید بھائی دکھی ہے' اس وجہ سے بہن یاد آ رہی ہے۔ ''بھائی' اگر میں اسے ڈھونڈوں بھی تو کہاں جاؤں؟''

''میرے پاس اس کا پتہ ہے۔'' خالد نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔

''آپ کے پاس مگر آپ نے مجھے آج تک کیوں نہیں بتایا؟''

''تو ان باتوں کو چھوڑ اور میری بات غور سے سن۔''

خمیل کے انتقال کو پندرہ روز گزر گئے تھے کشمالہ عدت میں تھی۔ غموں سے چور چور چار دیواری میں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹا اور دروازے کے پاس جا کر اندر سے پوچھا۔ ''کون؟''

''مجھے کشمالہ سے ملنا ہے۔'' اسے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

کشمالہ نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں خالد ہوں۔'' خالد کا نام سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں لمحہ بھر کے لیے تیز ہوگئیں مگر پھر اس نے اپنے ذہن میں آنے والے خیال کو جھٹک دیا۔

''کون خالد؟''

''کشمالہ' میں تمہارا بھائی ہوں۔'' کشمالہ کا سر چکرانے لگا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کا بھائی کھڑا تھا۔

''خالد..... تم.....؟'' وہ روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ ''تم اب آئے ہو میرے بھائی' اتنے عرصے بعد؟'' بہن کو یوں روتا دیکھ کر خالد بھی برداشت نہ کر سکا اور اسے گلے لگا کر رونے لگا اور بہن کو چپ

لگائے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ بچے جو ماں کے پیچھے آنگن تک آ گئے تھے' ماں کو ایک اجنبی کے گلے لگ کر روتے دیکھا تو خود بھی رونے لگے۔ خالد کی نظر اُن پر پڑی تو وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دونوں کو گلے سے لگا کر رونے لگا۔

برسوں کا غبار جب آنسوؤں سے دھل گیا تو خالد نے کشمالہ کو بتایا۔ ''میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا تھا مگر بھائی کے خوف کی وجہ سے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا لیکن آج بھائی نے ہی مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ بھائی خود تمہارے پاس آتے مگر وہ ہاسپٹل میں ہیں۔'' بھائی کی حالت سن کر کشمالہ کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

''خمیل کو گئے ہوئے پندرہ دن گزر گئے ہیں' کاش' خمیل اپنی زندگی میں یہ خوشخبری سن لیتے۔'' دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے مل کر خوب روئے۔

جاتے جاتے خالد نے کشمالہ سے کہا۔ ''تم تیار رہنا' میں دو دن بعد تمہیں لینے آؤں گا۔ بھائی تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔''

کشمالہ تقدیر کے کھیل پر حیران تھی کہ خمیل کے بعد وہ کس قدر بے سہارا ہوگئی تھی اور اللہ نے بھائیوں کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا کر کے اسے اور اس کے بچوں کو بے آسرا ہونے سے بچا لیا تھا۔

دو دن بعد کشمالہ ہاسپٹل میں بھائی کے پاس تھی۔ عابد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میری بہن.....! مجھ کو معاف کر دے۔ معاف کر دے مجھے۔ مجھ سے بھول ہوگئی' میں اتنا عرصہ تم سے نفرت کرتا رہا اور میں نے اس کی سزا بھی پائی' تو مجھے معاف کر دے۔'' کشمالہ نے آگے بڑھ کر بھائی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''نہ بھائی.....! مجھے شرمندہ نہ کر' میں نے جو کچھ

تجربہ

عمر حیات کا کچھ یوں رہا حساب
آوارگی میں ہی سفر پورا کر دیا
طفلِ مکتب ہی رہا میں تو شناسائی میں
زندگی کے تجربوں نے بوڑھا کر دیا

ادریس کاوش

کیا' اپنے باپ کا عہد نبھانے اور اپنی محبت کو پانے کے لیے کیا مگر شاید میرا طریقہ غلط تھا' میں نے ہی خمیل کو ابو کے اُن تمام احسانات کا واسطہ دیا تھا جو ابو نے اُس پر کیے تھے۔ اسے مجبور کیا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے۔'' بہن کی یہ بات سن کر عابد شرمندگی کے گہرے سمندر میں گر گیا مگر بہن کے سامنے اپنے جرم کا اقرار نہ کر سکا۔

وکیل نے تمام کاغذات مکمل کر دیے تھے۔ عابد نے تمام جائیداد کے تین حصے کر دیے جس میں سے ایک حصہ کشمالہ کے نام اور ایک اپنے بھائی کے نام کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے رمل اور شمائل کے تمام تعلیمی اخراجات اپنے ذمہ لے لیے اور اپنے جرم کی تلافی اور اندر سلگتے پچھتاوے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی بہن کو بچوں کی تمام فکروں سے آزاد کر دیا مگر آج بھی وہ کٹہرے میں کھڑا ہے۔ بہن کو سفید آنچل اوڑھے دیکھتا ہے تو اُس کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خواہ وہ کچھ بھی کر لے مگر اپنے کیے کی تلافی نہیں کر سکتا۔

کشمالہ کو وہ سب کچھ حاصل ہوگیا تھا جو وہ اپنے بچوں کی آسائش کے لیے چاہتی تھی مگر رات کی تنہائیوں میں کشمالہ کے تنہا وجود کو سمیٹنے کے لیے خمیل کی تصوراتی باہیں اُس کے آس پاس رہتی ہیں اور کشمالہ اُس کی دونوں نشانیوں کو گلے لگائے روتے روتے خود کو نیند کے سپرد کر دیتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر احمد بھٹی

اللہ کی عدالت

خواجہ میر درد کا خیال

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

مظلوم کی بددعا عرش تک جاتی ہے، اس خیال کو اجاگر کرتی کہانی

وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ دھان پان سا، عمر پینسٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوگی۔ وہ کہاں سے آیا تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، یہ اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا نہ ہی اسے کسی سے کوئی سروکار تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک ریٹائرڈ ماسٹر ہے۔ کسی سرکاری اسکول میں بچوں کو تعلیم دیتا رہا ہے۔ اس نے ایک بڑی سی دکان کرائے پر لے رکھی تھی جو کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سبزی کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ لکڑی کی خالی پیٹیاں دکان کے ایک حصے میں بے ترتیب پڑی ہوتی تھیں۔ یہ دکان اس کا گھر بھی تھی۔ وہ رات کو دکان ہی میں سوتا تھا۔ سبزی کے کام میں اسے کافی تجربہ تھا۔ وہ قریبی شہروں میں سبزی کے ریٹ کے اتار چڑھاؤ کی سن گن میں رہتا تھا۔ کسی قریبی شہر میں کوئی سبزی سستی ہوتی تو وہ فوراً اس شہر کا رخ کرتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر لودھراں میں ٹماٹر دس روپے کلو ہوتا اور بہاول پور میں ٹماٹر کا ریٹ بیس روپے کلو ہوتا تو وہ فوراً لودھراں پہنچ جاتا۔ وہاں سے پانچ دس پیٹیاں خرید لاتا تھا۔ اس طرح اُسے کافی منافع حاصل ہو جاتا۔ کبھی کبھار اسے نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ تھوک میں خریدا ہوا سامان بچ جاتا یا گل سڑ جاتا تو باسی، سڑا ہوا مال کچرے کے ڈھیر کی نذر ہو جاتا۔ اکثر جب وہ دکان کی صفائی کرتا تو مجھے مدد کے لیے بلا لیتا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ہم دونوں مل کر دکان کی صفائی کرتے۔ لکڑیوں کی خالی پیٹیوں کو دکان کے ایک کونے میں ترتیب سے جما کر رکھ دیتے۔ کام ختم ہو جاتا تو وہ مجھے بیس، تیس روپے بطور اجرت دیتا اور گھر کے لیے سبزی بھی دے دیتا تھا اور ساتھ میں ڈھیروں دُعائیں بھی۔ وہ فطرتاً شریف اور ملنسار تھا۔ مجھے اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار اسے غصہ بھی آ جاتا تھا۔ میں اس کے غصے کے جواب میں غصہ نہیں کرتا بلکہ خاموش رہتا تھا۔ ایک تو وہ پردیسی تھا، دوسرے اس کی اولاد نہیں تھی کیونکہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اگر دورانِ کام مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ اول فول بکنے لگتا تھا۔ اس حالت میں وہ مجھے خبطی لگتا تھا۔ اس کی غصہ بھری باتوں کا میں برا نہیں مانتا تھا۔ میری یہ عادت اُسے پسند تھی

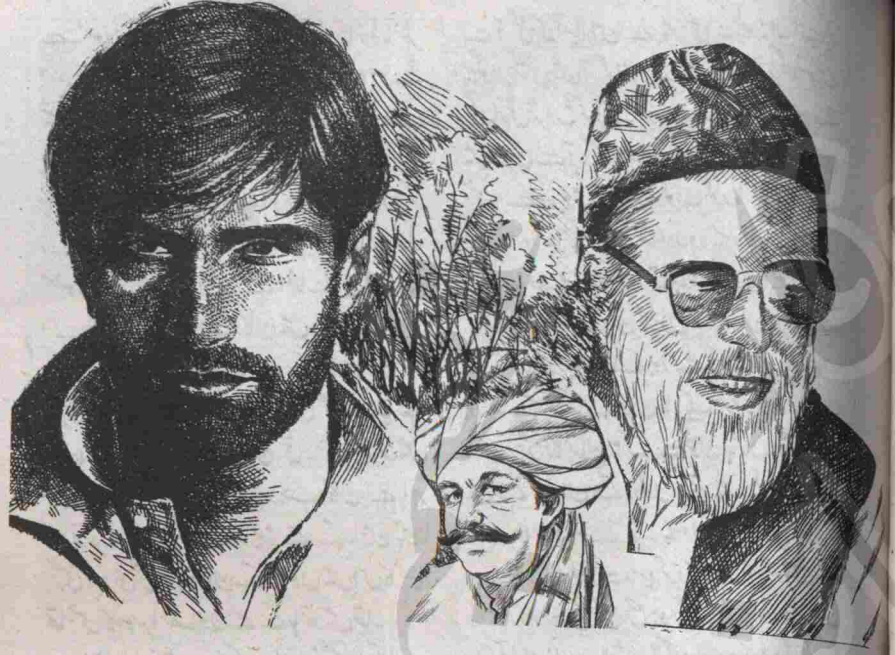

اس لیے جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ مجھ سے معذرت کرتا، چائے منگوا کر مجھے پلاتا، یوں اپنی شرمندگی کا ازالہ کرنے لگتا۔

ہماری بستی میں ایک پہلوان بھی رہتا تھا، تاہم وہ نام کا پہلوان تھا، اس میں پہلوانوں والی کوئی خوبی نہ تھی۔ بڑا سا پیٹ اور پتلی پتلی ٹانگوں والے اس نام نہاد پہلوان کو چوری چکاری کی عادت تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے بڑے بڑے پہلوانوں کو چت کیا ہے لیکن کسی نے کبھی اس کی کوئی کشتی نہیں دیکھی تھی، صرف اس کی زبانی اس کے کارنامے سنے تھے۔

پہلوان ایک ہی بات کرتا تھا۔ ”کھاؤ پیو، جان بناؤ، جان ہے تو جہان ہے۔ مرنے والوں کے لیے قبرستان ہے۔ چوری کرو، پکڑے نہ جاؤ.....“

پہلوان گورنمنٹ پریس میں ملازم تھا جہاں سے وہ مختلف اشیاء چوری کر کے لاتا اور اِدھر اُدھر اونے پونے فروخت کر دیتا تھا۔ ایک کپڑے کا تھیلا وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا جس میں چوری کی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں رکھتا تھا۔ کہیں سے خربوزہ اڑا لیا تو کسی دکان سے شلجم تو کہیں سے آلو اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیتا۔ ہاتھ کی صفائی ایسی کہ جیسے آنکھوں میں دھول جھونک دے۔ اس کا طریقۂ واردات یوں تھا کہ کسی دکان پر جا کے کہتا۔ ”بکریوں کے لیے مولی، شلجم کے پتے اٹھا لوں؟“ دکاندار اجازت دے دیتا تو وہ دکاندار کی نظر بچا کر سبزی تھیلے میں ڈال کے اوپر پتے بھر لیتا۔ دکاندار اس پر اعتبار کرتے تھے جس کا وہ ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا پھر اس چور پہلوان نے اس بوڑھے سے دوستی گانٹھ لی اور اس دوستی کی آڑ میں وہ اپنا کام دکھانے لگا۔ وہ پہلوان پتے وغیرہ لینے آتا اور پتوں کے درمیان سبزی تھیلے میں ڈال کے لے جاتا۔ ایک مثل مشہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ ریٹائرڈ ماسٹر چونکہ بوڑھا تھا' اس کی نگاہ بھی کمزور تھی' وہ موٹے شیشوں والی عینک لگاتا تھا اس لیے پہلوان کو سامان چوری کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

ایک روز میں اور بوڑھا دکان میں صفائی کر رہے تھے کہ پہلوان بمع تھیلے دکان پر آ پہنچا۔ حسبِ معمول بوڑھے نے اسے پتے اٹھانے کی اجازت دے دی۔ میں اُس وقت دکان میں دیوار کے ساتھ لکڑی کی پیٹیوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ بوڑھا سبزی سجا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک دکان کے باہر ہڑبونگ سی مچ گئی۔ شور سن کر میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا اور جب دکان سے باہر آیا تو دیکھا کہ پہلوان اور بوڑھے کے مابین چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ پہلوان کے ہاتھوں میں اس کا تھیلا تھا جس کا دوسرا حصہ بوڑھے کے ہاتھ میں تھا۔

بوڑھا ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تھیلا دکھا...... اس میں کیا ہے؟''

پہلوان کا اصرار تھا کہ اس میں گلے سڑے پتے ہیں۔ بوڑھا اس پر الزام لگا رہا تھا کہ پتوں کے نیچے آلو ہیں جو اُس نے چوری کر کے اس میں ڈالے ہیں۔ دونوں میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔ پہلوان تھیلا دکھانے کو تیار نہ تھا جبکہ بوڑھا بھی کسی جونک کی طرح تھیلے سے چمٹا ہوا تھا۔ جب پہلوان نے دیکھا کہ بوڑھا کسی صورت تھیلا چھوڑنے پر تیار نہیں تو اس نے جان چھڑانے کی خاطر بوڑھے کو ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ بوڑھے نے تھیلا پھر بھی نہیں چھوڑا۔ یہ دیکھ کر پہلوان کو غصہ آ گیا۔ وہ خود کو پہلوان سمجھتا تھا جبکہ بوڑھا کمزور اور دھان پان سا تھا۔ غصے کے عالم میں پہلوان نے بوڑھے کے منہ پر زوردار تھپڑ مارتے ہوئے اپنے تھیلے کو جھٹکا مار کر چھڑانے کی کوشش کی مگر بوڑھے میں اتنی طاقت جانے کہاں سے آ گئی کہ تھیلا اس نے پھر بھی نہ چھوڑا۔ اب تو پہلوان طیش میں آ گیا اور بوڑھے پر تابڑ توڑ گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھا اور پہلوان کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس سے وہ بوڑھے کو زدوکوب کر رہا تھا۔ گھونسے کھا کر بوڑھا چکرا گیا تھا اور وہ پہلوان کو گالیاں دے رہا تھا۔ بوڑھا کمزور تھا لہٰذا سوائے گالیوں کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان گالیوں پر پہلوان مزید غصے میں آ گیا اور تھیلا گھما کے بوڑھے کی پسلیوں پر مارا۔ بوڑھا نیچے گر گیا۔ پہلوان کا ایک گھونسہ بوڑھے کی ناک پر بھی لگا تھا اور ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں نے پہلوان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اسے لعنت ملامت کرنے لگا۔ پہلوان نے نیچے گرے ہوئے بوڑھے کو لات رسید کر دی۔ اس اثناء میں کچھ دکاندار اور راہ گیر بھی جمع ہو گئے تھے۔ بوڑھا زمین سے کھڑا ہوا اور رونا شروع کر دیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے سینہ کوبی کرتا ہوا پہلوان کو کوسنے لگا۔

''غضب خدا کا' کیا اندھیر نگری ہے' چوری' اوپر سے سینہ زوری' ایک تو اس ظالم نے میرے آلو چرائے اور مجھے پیٹ کے بھی رکھ دیا۔ چور' کتا' ذلیل...... خدا خانہ خراب کرے اس کا' حرام موت مرے......'' یہ کوسنے دیتے ہوئے بوڑھے نے اپنی قمیص کا دامن دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور آسمان کی طرف منہ کر کے پہلوان کو بددعا دینے لگا۔ ''میرے مالک! میں غریب' لاچار ہوں۔ اس ظالم نے میرے آلو چرائے ہیں' اوپر سے مجھے مارا پیٹا بھی ہے۔ میں اپنا مقدمہ تیری عدالت میں پیش کرتا ہوں۔ تو انصاف کرنے والا ہے۔ میری فریاد سن۔ میری پکار سن لے۔'' ایک دکاندار نے پہلوان سے تھیلا لے کر الٹ دیا۔ پتوں کے نیچے سے موٹے

موٹے آلو نکل کر ادھر اُدھر لڑھک گئے۔ پہلوان کی چوری سامنے آ گئی۔ وہاں موجود آدمی پہلوان کو لعنت ملامت کرنے لگے۔

ایک دکان دار بولا۔ ''پہلوان جی' بے شرمی کی حد ہو گئی' چوری کر کے بھی پارسا بن رہے ہو؟ تمہارے باپ کی ہم عمر ہو گا یہ بزرگ' اس پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہ آئی؟'' پہلوان کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ اس نے جب دیکھا کہ معاملہ گمبھیر ہو چکا ہے تو فٹ بہانہ تراشا۔

''یہ آلو تو میں فلاں دکان سے خرید کے لایا ہوں۔'' مگر اس کی یہ بات بھی جھوٹی نکلی۔ پہلوان نے جس دکان کا حوالہ دیا تھا' وہ دو دن سے بند پڑی تھی۔ دکاندار کی ماں فوت ہو گئی تھی اس لیے اس نے دکان نہیں کھولی تھی۔ وہاں موجود لوگوں نے پہلوان کو کھری کھری سنائیں تو پہلوان نے اپنا خالی تھیلا اٹھایا اور وہاں سے کھسکنے میں عافیت جانی۔ لوگوں نے بوڑھے کو حوصلہ دیا۔ ایک نے بوڑھے کی ناک سے بہنے والا خون کپڑے سے صاف کیا' دوسرے نے پانی کا گلاس پیش کیا' میں نے دکان سے کرسی نکال کر باہر رکھی' بوڑھا اُس پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میلے رومال سے وہ آنسو بھی صاف کر رہا تھا' ساتھ ہی وہ ظالم پہلوان کو کوستا جا رہا تھا پھر تمام لوگ چلے گئے تو میں اور بوڑھا دوبارہ کام میں جُت گئے۔ دورانِ کام بوڑھا ماسٹر دبی آواز میں کافی دیر تک پہلوان کو بددعائیں دیتا رہا۔ اس روز مجھے بوڑھے پر بڑا ترس آیا۔ میں نے کام مکمل کر کے اُجرت لینے سے انکار کر دیا مگر بوڑھے نے زبردستی میری سامنے والی جیب میں تیس روپے ٹھونس دیئے اور گھر کے لیے حسبِ عادت سبزی بھی دے دی۔ سبزی لے کر میں بوجھل قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں سوچتا جا رہا تھا۔ چور

شکایت

قدم قدم پر
چہرے بدل کر
تیرے شہر کے لوگوں نے
ہم کو دیا ہے
اک فریب نیا

ایاز مراد چنا' حیدر آباد

پہلوان نے بوڑھے ماسٹر پر ہاتھ اٹھا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصہ تک بوڑھا اس دکان میں کرائے دار کی حیثیت سے رہا پھر اچانک دکان خالی کر کے چلا گیا۔ وہ کہاں گیا' یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔

1960ء کے بعد میرے والد سرکاری محکمے سے ریٹائر ہو گئے اور چند سال بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی پنشن کاپی گھر میں پڑی رہی۔ ضیاؑ صاحب کے دورِ حکومت میں بیوگان کو پنشن دینے کے احکامات جاری ہوئے تو میں نے والد مرحوم کے کاغذات اکاؤنٹ آفس' لاہور بھیج دیئے۔ ہمارے ہمسائے فقیر محمد صاحب اکاؤنٹ آفس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی رہائش وحدت کالونی' لاہور میں تھی۔ فقیر محمد صاحب نیک' ملنسار اور نمازی آدمی تھے۔ اُن کی کوششوں سے میری والدۂ مرحومہ کے نام پنشن جاری ہو گئی جو چھیانوے روپے اکانوے پیسے تھی۔ چھتیس سو روپے ہمیں نقد بھی مل گئے جو کئی سال کی رکی ہوئی پنشن تھی۔ پنشن ہمیں نیشنل بینک سے ملتی تھی۔ میں والدہ کو سائیکل پر بینک لے جاتا تھا۔

ایک روز ہم دونوں ماں بیٹا پنشن لینے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بینک گئے۔ وہاں بہت رش تھا۔ میں نے والدہ کو ایک درخت کی چھاؤں میں بٹھایا اور کاپی جمع کرا دی۔ مجھے بجلی کا بل بھی جمع کرانا تھا۔ میں نے سوچا۔ 'جب تک پنشن کے لیے آواز دی جائے' تب تک میں بل جمع کرا دوں۔' اس خیال کے تحت میں بینک کے اندر چلا گیا۔ اندر بھی بجلی کے بل جمع کرانے والوں کا خاصہ رش تھا۔ اندر ایک طرف بیٹھنے کے لیے دیوار کے ساتھ صوفے رکھے تھے' میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لمبی قطار لگی ہوئی تھی' قطار کا آخری آدمی صوفے کے قریب کھڑا تھا' اس کے پیچھے میرا نمبر تھا اسی لیے میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی گردن گھما کر دیکھا تو چونک پڑا' میرے ساتھ وہی پہلوان بیٹھا تھا جس نے سبزی چوری کی تھی اور پکڑے جانے پر بوڑھے ماسٹر کو زدوکوب کیا تھا۔ پہلوان اپنے دونوں ہاتھ صوفے کے کنارے پر ٹکائے بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ وہ بھی ریٹائر ہو چکا تھا اور اپنی پنشن لینے کے لیے بینک آیا تھا۔ پہلوان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ سخت تکلیف میں تھا۔ میں نے پہلوان سے سلام دعا کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلوان جی..... خیریت سے ہیں؟''

اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''خیریت نہیں ہے' میں سخت بیمار ہوں' ایک عرصہ ہو گیا ہے علاج کراتے کراتے مگر اس مرض سے جان نہیں چھوٹ رہی۔ کوئی حکیم' ڈاکٹر نہیں چھوڑا' سب ایک ہی بکواس کر رہے ہیں کہ تلی بڑھ گئی ہے' جگر ناکارہ ہو چکا ہے' خون کی کمی ہے۔ میں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا ہے مگر سب بے کار رہا۔''

پہلوان کی باتوں میں مایوسی کی جھلک نمایاں تھی' یوں محسوس ہوتا تھا' وہ اپنی زندگی سے بے زار ہو گیا ہے۔ اس کی حالت انتہائی ابتر تھی۔ میں نے اس سے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اسے بات کرتے ہوئے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور قطار میں کھڑا ہو گیا پھر اپنے کام سے فارغ ہو کر ہم ماں بیٹا گھر آ گئے۔ پہلوان کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس چند روز کا مہمان ہے۔ اُس وقت مجھے بوڑھے سبزی فروش کی بددعائیں یاد آ گئیں۔ اس نے جھولی پھیلا کر پہلوان کو بددعا دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پہلوان کی یہ مہلک بیماری بوڑھے کی بددعا کا نتیجہ تھی۔ جس روز میں بینک سے گھر لوٹا تھا' اس کے تیسرے دن صبح میری آنکھ کھلی تو مسجد کے اسپیکر سے اعلان ہو رہا تھا۔ اعلان پہلوان کے بارے میں تھا۔ پہلوان کا نام لے کر کہا گیا (یہاں پہلوان کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔) کہ وہ بہ قضائے الٰہی وفات پا چکا ہے۔ اعلان سن کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ میری نگاہوں میں بوڑھے مظلوم ماسٹر کا چہرہ آ گیا تھا۔ بوڑھے کی بددعا نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ پہلوان کی تلی کا بڑھ جانا' جگر کا ناکارہ ہو جانا' خون کی کمی' ڈاکٹروں اور حکیموں کی دواؤں کا اثر نہ کرنا اور پیسہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود پہلوان کا صحت یاب نہ ہونا..... یہ سب کیا تھا؟ جس طرح دُعا اپنا اثر رکھتی ہے' اسی طرح بددعا بھی کام دکھاتی ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پہلوان اپنی طبعی موت مرا تھا یا اُس مظلوم بوڑھے کی بددعا کا اثر تھا جو پہلوان کو ملکِ عدم لے گئی تھی۔ بہر حال انسان کو ہر حال میں خدا سے ڈرنا چاہیے اور کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مظلوم کی بددعا بہت تیزی سے عرش تک جاتی ہے۔

کرن شبیر

سائبان کوئی نہیں

مجاب عباسی کا خیال

دردِ موسم کو رکھا دل میں چھپا کر پھر بھی
آنکھ کر دیتی ہے اظہار میں کب بولتی ہوں

اپنا گھر اجاڑنے والی ایک بدبخت کا قصہ، پچھتاوے جس کا مقدر بن گئے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا' یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" اقصیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں اور تم یہ بات بھائیوں تک پہنچادو۔" عنزہ اٹل انداز میں بولی۔

"مگر عنزہ' آخر کمیل بھائی کا کیا قصور ہے؟"

"کسی کا کوئی قصور نہیں' میں کمیل کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور بس..... مجھے اس سے طلاق چاہیے....."

"اور ایمان کا کیا ہوگا؟ اسے کس بات کی سزا دے رہی ہو؟" اقصیٰ کو اپنی بہن پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"وہ بیٹی ہے میری' اس کے لیے بھی کچھ سوچ رکھا ہے میں نے۔" عنزہ نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ اقصیٰ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

•.....•.....•

ملک عابد علی اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی بیوی مہران کے ہر دکھ سکھ کی بہترین ساتھی تھی اور قدرت نے انہیں چار خوبصورت بچوں سے نوازا تھا۔ پہلے دو بیٹے احمر اور انس پھر دو بیٹیاں عنزہ اور اقصیٰ تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دونوں بیٹے برسرِ روزگار ہو چکے تھے اور عابد صاحب ریٹائرڈ لائف کا مزہ اٹھا رہے تھے۔ بڑی بیٹی عنزہ کا رشتہ وہ اپنی بہن کے گھر کر چکے تھے جبکہ اقصیٰ کی ابھی کہیں بات نہیں چلی تھی۔

زندگی اسی طرح پرسکون انداز سے چل رہی تھی کہ ایک کار حادثے میں عابد صاحب اور ان کی بیگم چل بسے۔ ان کا چھوٹا سا گھر جیسے آندھیوں کی زد میں آ گیا۔ اب وہ چاروں بہن بھائی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ ماں باپ کے گزر جانے کے بعد اب احمر اور انس ہی اپنی بہنوں کے لیے مضبوط سائبان تھے۔ والدین کی پہلی برسی گزرتے ہی پھوپھو نے عنزہ کو رخصت کرنے کی بات کر ڈالی۔ مہرے ہر سمجھدار ماں کی طرح اپنی بیٹی کا خاصا جہیز تیار کر رکھا تھا۔ باقی کی تیاری اقصیٰ نے پھوپھو اور خالہ وغیرہ کی مدد سے کر لی تھی اور یوں ایک دن عنزہ اپنے پھوپھی زاد کمیل حسن کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔

کمیل آرمی میں میجر تھا۔ شادی کے ابتدائی برس ان دونوں نے اکٹھے گزارے۔ کمیل کی پوسٹنگ جہاں بھی ہوتی' وہ عنزہ کو ساتھ لے جاتا۔ ایک برس کے اندر ایمان کی صورت میں ان کے چھوٹے سے خاندان میں خوبصورت اضافہ بھی ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی' بیٹی کو پا کر بہت خوش تھے۔ کمیل کو تو اپنی بیٹی کے سوا کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اسی دوران پھوپھو کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی لہٰذا ان کے پاس کسی کا ہونا بے حد ضروری تھا' سو اب کمیل نے فیصلہ کر لیا کہ عنزہ اور ایمان گھر میں رہیں تاکہ اس کی ماں کا بھی دل لگا رہے اور ان کی جانب سے بے فکری بھی رہے۔

ایمان دو برس کی ہو چلی تھی۔ کمیل مہینے میں ایک دو بار گھر آتا۔ عنزہ کو نگر نگر گھومنے کی اور آزادی کی عادت پڑ چکی تھی' سو اب گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ اکثر کمیل سے یہ کہتی کہ وہ اپنے ساتھ اسے بھی لے جائے مگر وہ اس بات پر ہمیشہ خفا سا ہو جاتا۔ اکثر اس بات پر ان کی ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔

"دیکھو عنزہ! وہ تمہاری ساس ہی نہیں' پھوپھی بھی ہیں۔ تم بیماری کی حالت میں انہیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو کمیل بھائی کو برا تو لگے گا ناں' وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔" اقصیٰ اسے اکثر سمجھاتی مگر خود غرض عنزہ کو صرف اپنے بارے میں سوچنا آتا تھا۔

کچھ عرصہ قبل جب کمیل آرمی کی طرف سے بیرونِ ملک گیا تو واپسی پر اسے اچھی خاصی رقم ملی جسے وہ اپنی ماں کے نام پر جمع کروانا چاہتا تھا کیونکہ ماں

نے اسے ابو کی وفات کے بعد بڑی مشکلات جھیل کر پالا تھا مگر اس بات پر عنزہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور روٹھ کر میکے جا بیٹھی تو پھوپھو نے خود ہی کمیل کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ یہ رقم عنزہ کے نام پر جمع کروا دے' تاہم پھر بھی کمیل نے آدھی رقم اس کے اور آدھی رقم ماں کے نام پر جمع کروائی۔ اس کے بعد تو جیسے عنزہ کو پھوپھو سے ضد سی ہو گئی' وہ ہر وقت کمیل سے کہتی کہ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اسی دوران ایک عجیب سلسلہ شروع ہو گیا۔

عنزہ کے موبائل پر کسی انجان شخص کی کالز اور میسجز آنے لگے۔ گھر میں فارغ رہنے والی عنزہ کے ہاتھ ایک مشغلہ آ گیا' وہ اس کے میسجز کے جواب دیتی پھر دھیرے دھیرے دونوں میں کافی بے تکلفی سے باتیں بھی ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہ بے تکلفی اتنی بڑھی کہ بات ملاقاتوں تک جا پہنچی۔

عاشر نامی یہ لڑکا شادی شدہ نہیں تھا' وہ اچھا خاصا خوش شکل تھا۔ کمیل کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عنزہ اکثر اسے ایسے وقت گھر میں بلاتی جب پھوپھو کے سونے کا وقت ہوتا۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے شوہر سے کتنی بڑی خیانت کر رہی ہے۔

"عنزہ جان..... اب تو میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی کروں تو گھبرا جاتا ہوں۔ جب کمیل کو تمہاری پروا نہیں تو اسے چھوڑ دو' میں تم سے شادی کروں گا اور کبھی اپنی جان کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔" عاشر کی میٹھی میٹھی باتوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر بھائیوں کے گھر آ گئی تھی البتہ اس نے عاشر کو یہ ضرور کہا کہ وہ ایمان کو نہیں چھوڑ سکتی۔

"تم فکر نہ کرو جان..... پہلے ہم شادی تو کر لیں پھر اسے بھی عدالت کے ذریعے لے لیں گے۔" وہ اسے اپنی محبت کے جال میں جکڑ رہا تھا۔

•.....•.....•

"دیکھو عنزہ.....! جب تک تم وجہ نہیں بتاؤ گی کہ کیوں طلاق لینا چاہتی ہو' ہم کیسے کمیل سے کہیں؟ آخر بات کیا ہے؟ اگر اس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو بتاؤ' ہم خود اس سے نمٹ لیں گے۔" احمر بھائی اور انس اس سے پوچھ پوچھ کر ہار گئے تھے۔ وجہ تو اس نے اب تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔

"ٹھیک ہے' اقصیٰ آپ کو بتا دے گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ آخر سب کو پتا تو چلنا ہی تھا۔

اور جب اس نے اقصیٰ کو تمام معاملہ بتایا اور اقصیٰ کے ذریعے بھائیوں کو پتا چلا تو جیسے گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ انس تو اسے گھر میں رکھنے کو بھی تیار نہ تھا مگر احمر بھائی معاملہ فہم انسان تھے' انہیں اپنی عزت اور والدین کی نیک نامی جان سے بڑھ کر عزیز تھی' سو انہوں نے انس کو بڑی مشکل سے خاموش رہنے پر راضی کیا تھا۔ وہ تو عنزہ کو دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ اس دوران خاندان بھر کے معزز بزرگ بھی اپنی سی کوشش کر بیٹھے کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے اور جب تمام تر کوششیں رائیگاں گئیں تو ایک دن کمیل خود آ گیا۔

"عنزہ! خدا کے لیے' ایسا مت کرو' اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آشیاں کو اجاڑنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ امی جان کا تو رو رو کر برا حال ہے۔"

"اوہ..... تو اب بھی تمہیں اپنی ماں کی فکر یہاں کھینچ لائی ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"کیا تمہیں ایمان کا بھی خیال نہیں؟"

"عاشر نے کہا ہے' اسے ایمان کو اپنے ساتھ رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری' وہ تو تمہیں بھی زیادہ دن نہیں رکھے گا تو ایمان کا کیا سوال؟ تم بہت پچھتاؤ گی۔" کمیل نے بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ہارے ہوئے جواری کی طرح شکستہ قدموں سے واپس چلا گیا۔

پھر اس کی محبت' نفرت میں بدل گئی اور اب وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ تھا مگر شرط تھی کہ وہ رقم جو اس نے عنزہ کے نام پر جمع کروائی تھی' وہ واپس کردے کیونکہ اس پر اب صرف اور صرف اس کی بیٹی کا حق تھا نا کہ عنزہ جیسی بے وفا عورت کا.....!

''میں تم سے طلاق بھی لے لوں گی کمیل حسن' اور رقم بھی میرے پاس رہے گی' یہ میرا وعدہ رہا۔'' ایک شب فون پر اسے عنزہ نے کڑے انداز میں کہا تھا۔ اگلے ہی دن اس نے کورٹ میں خلع کا مقدمہ دائر کردیا جس میں وہ فتح یاب بھی ہوئی اور عدت کی مدت پوری ہوتے ہی احمر بھائی نے اس کا نکاح عاشر سے کردیا۔

''آج سے ہم سب تمہارے لیے مر گئے ہیں..... تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں' اب کبھی اس گھر کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھنا۔'' احمر بھائی نے اسے ان الفاظ کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔

اور اس طرح عنزہ کی نئی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ عاشر جب اسے اپنے گھر میں لے کر داخل ہوا تو ایک لمحے کو اس گھر کے کچے پکے صحن اور پرانے زمانے کے بنے قطار در قطار کمروں کو دیکھ کر اس کا جی مکدر ہوگیا۔

'میرے پاس جو رقم ہے' میں اس سے پلاٹ خرید لوں گی اور عاشر اور میں مل کر نیا گھر بنائیں گے۔' اس نے سوچا۔

گھر میں عاشر کے ماں باپ اور چار عدد بھائیوں نے اس کا استقبال کیا۔ جانتے تھے کہ موٹی آسامی ہے' سو آؤ بھگت کی گئی۔ جلد ہی وہ ان سب سے گھل مل گئی۔ عاشر تو تھا ہی اس کا دیوانہ مگر چاروں دیور بھی بھابھی' بھابھی کرتے نہ تھکتے تھے۔

ان ہی خوشیوں میں دو ماہ گزر گئے جب محبت کا خمار کچھ مدہم ہوا تو سب سے پہلے اسے ایمان کی یاد آئی۔

'نہ جانے پھوپھو اسے کس طرح رکھتی ہوں گی؟ وہ تو میرے ساتھ سونے کی عادی تھی۔' طرح طرح کی سوچیں دل بے قرار کررہی تھیں۔

''عاشر' اب ہمیں ایمان کے لیے کچھ کوشش کرنی چاہیے۔'' ایک شام اس نے کہا۔

''او ہو بھئی' کچھ پل انجوائے تو کرنے دو۔ اسے بھی لے آئیں گے' وہ کسی غیر کے نہیں' اپنے باپ کے گھر میں ہے۔'' اسی طرح کی طفل تسلیوں میں کچھ ماہ اور سرک گئے۔ اس دوران اس کے ساس سسر نے عاشر کی مدد سے کمال مہارت سے ایک بڑی رقم اس سے حاصل کرلی تھی جس سے اس گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا' نیا کچن' نیا باتھ روم اور صحن میں ماربل لگوایا گیا جبکہ کمرے بھی خوب آراستہ کرلیے گئے تھے۔

''ارے بھئی' الگ پلاٹ کیوں لینا ہے؟ یہ گھر تمہارا ہی تو ہے' آخر کو اس میں تمہارا پیسہ ہی تو لگا ہے ناں۔'' ساس پچکارا کرتیں۔

''اور کیا' ہم اپنی پیاری سی بھابھی کو اس گھر سے جانے نہیں دیں گے۔'' دیور بھی لاڈ کرتے۔ وہ تو ان چاہتوں پر نازاں سی ہوجاتی تھی اور اسے ہمیشہ یہی خیال آتا کہ اس نے دوسری شادی کرنے کا کیا خوب فیصلہ کیا تھا۔ وہ خود بھی تو تمام کشتیاں جلا کر آئی تھی' سو اس کی کوشش ہوتی کہ ہر طرح سے سب کا خیال کرے۔ اس کے دیور اس سے جتنی رقم مانگتے' وہ بلا حیل و حجت ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ اس طرح اب اس کے پاس بہت کم رقم بچی تھی' سو وہ کچھ محتاط ہوگئی تھی اور جیسے ہی اس نے یہ احتیاط برتنا شروع کی تو رویئے تیزی سے بدلنے لگے۔ عاشر بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا تھا۔ اس صورتِ حال میں اسے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

'اگر میں ماں بن جاؤں تو شاید میرا رشتہ اس گھر سے مزید مضبوط ہوجائے۔' اسے نئی سوچ نے راہ دکھائی۔ کافی عرصہ ہوگیا تھا اسے عاشر کی زندگی میں آئے مگر اب تک ایسی کسی امید کے آثار نہیں تھے۔ آخر اس نے عاشر کو رضامند کرلیا اور ایک لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا۔ اس کے کچھ ٹیسٹ ہوئے۔

''کیا اس سے پہلے آپ کی کوئی اولاد ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں' ایک بیٹی تھی۔'' عنزہ سے پہلے عاشر نے جواب دیا۔

''تھی.....؟'' ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی' وہ میرے پہلے شوہر سے ہے اور اب..... میرا مطلب ہے.....'' عنزہ جھجک کر خاموش ہوگئی۔

''اوکے' اوکے' میں سمجھ سکتی ہوں مگر کیا اس بچی کی پیدائش کے وقت ڈاکٹرز نے آپ کو نہیں بتایا کہ آپ اب کبھی ماں نہیں بن سکتیں؟''

''کیا!!!'' اس انکشاف سے جیسے آسمان اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ گھر آنے تک مسلسل روتی رہی تھی۔

''پلیز عنزہ .....! اب چپ بھی ہوجاؤ.....'' عاشر نے چڑتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ..... جب رب نے اولاد دی تو اسے ٹھوکر مار آئی' اب بھلا سوتے بہانے کی کیا ضرورت ہے؟'' ساس پر سے ماں کا خول مکمل طور پر اتر چکا تھا۔

''دیکھیں' میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں' میں نے آپ سب کے لیے کیا کچھ نہیں کیا اور آپ لوگ مجھے طعنے دے رہے ہیں؟ ذرا اس گھر کی حالت دیکھ لیں۔ یہ صلہ دے رہے ہیں آپ لوگ میری قربانیوں کا؟'' وہ رو رہی تھی۔

''ارے' سنتے ہو تم سب' اس کی زبان بھی چالو

چولہے

ہوئے گھروں کے چولہے ٹھنڈے
اب گیس ملے گی سنڈے کے سنڈے
لو ختم ہوا روز پکانے کا جھنجھٹ
اب پکاؤ صرف سنڈے کے سنڈے
خاک کھائیں سرد موسم میں انڈے
روز روز پڑتے ہیں کرانے کے ڈنڈے
کچھ تو رکھ سفید پوشی کا بھرم لُنڈے
گیس بھی ملتی ہے اب سنڈے کے سنڈے
دیکھو یارو' ہم نے چاروں طرف
کیا خوب گاڑے جمہوریت کے جھنڈے

راشد رحمانی

ہوگئی ہے' نکال باہر کرو اسے.....'' ساس صاحبہ نے جو صور پھونکا تو عاشر سمیت سب بھائی کونوں کھدروں سے نکل آئے۔

''اے عاشر بیٹا..... جب یہ اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر بھاگ آئی ہے تو بھلا تیرا کیا ساتھ دے گی؟ کل کو نیا یار بنالے گی اور نکل لے گی.....''

''بکواس بند کر..... گھٹیا عورت..... ڈائن کہیں کی.....'' عنزہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''ڈائن تو ہے.....'' ساس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا اور پھر اس کے دیور اور عاشر بھی ماں کے ساتھ مل گئے۔

''چل..... نکل..... یہاں سے دفع ہوجا.....'' عاشر' اس کا دیوانہ' اس کا محبوب شوہر' اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں......نہیں......خدا کے لیے...... مجھے مت چھوڑو......میں کہاں جاؤں گی......؟رحم کرو مجھ پر' خدا کا خوف کرو' میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ عاشر کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''چھوڑ مجھے......'' عاشر نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور اسے گلی میں دھکیل دیا۔

''میں تجھے طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔ ویسے بھی تجھے طلاقیں لینے کا بڑا شوق ہے......'' عاشر نے تین بول کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

''نہیں......تم ایسا نہیں کر سکتے...... کھولو...... دروازہ کھولو......'' وہ دیوانوں کی طرح چلا رہی تھی۔ دروازہ پیٹ رہی تھی مگر دوسری طرف مکمل سناٹا تھا۔ اس کے اردگرد محلے والوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا اور مختلف آوازیں بھی۔

''ارے' ایسی عورتوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔''

''اسے کیا فرق پڑے گا' کوئی نیا مرد پھانس لے گی۔''

الفاظ تھے کہ نشتر جو اس کی روح کو چھلنی کر رہے تھے۔ وہ روتی بلکتی وہاں سے چلی آئی۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اقصیٰ نے چولہے کی آنچ مدھم کی اور باہر کی جانب بڑھی۔

''کون......؟''

''دروازہ کھولو اقصیٰ......!'' بہن کی دردناک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''عنزہ......!'' اس نے تڑپ کر دروازہ کھولا اور شدتِ غم سے پتھر ہو گئی۔ سوجی ہوئی آنکھیں' نیلوں سے بھرا چہرہ' کٹے پھٹے ہونٹ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ آخر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ عنزہ کی خودغرضی نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ اس نے اولاد جیسی نعمت کو ٹھکرایا تھا تو قدرت نے اس سے ماں بننے کا حق واپس لے لیا تھا جس طرح کمیل نے رو کر اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگی تھی' اسی طرح عاشر کے سامنے اسے گڑگڑانا پڑا تھا اور دولت......وہی دولت جس کے بل پر اس نے گھر چھوڑا تھا اور غیر کا گھر بسایا تھا' جب وہ دولت ختم ہوئی تو سب کچھ ختم ہو گیا' وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔

اس کے کپڑے بدلوانے اور زخم صاف کرنے کے بعد تمام ماجرا سن کر اقصیٰ بھی بے طرح رو رہی تھی۔

''اب تم جاؤ عنزہ......! بھائی گھر آنے والے ہیں۔'' اقصیٰ کا جملہ سن کر وہ اچھل پڑی۔

''مم......مگر میں کہاں جاؤں گی؟''

''میں مجبور ہوں عنزہ......! تمہارے جانے کے بعد احمر بھیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جس روز میں تم سے کوئی رابطہ کروں گی' میں ان کا مرا منہ......خدانخواستہ' احمر بھیا تو خیر پھر بھی سمجھدار ہیں مگر انس کو تم اچھی طرح جانتی ہو' وہ بے حد جذباتی ہے' تمہیں اپنے بھائیوں کا واسطہ' چلی جاؤ پلیز......''

اور وہ بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔ اسے اپنی منزل کا پتہ نہیں تھا۔ منزل تو اس نے خود کھوئی تھی۔

○......●......●......○

عنزہ اپنی روداد سنا کر خاموش ہو گئی تھی مگر اس کے آنسو رواں تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے تسلی دوں یا اس پر لعن طعن کروں؟ بس اسی شش و پنج کی کیفیت میں' میں اس کے پاس سے اٹھی اور دارالامان سے باہر نکل آئی۔ مجھے عنزہ سے ہمدردی بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا' تاہم ایک چیز کا اطمینان تھا کہ وہ تاریک راہوں کی مسافر بننے کی بجائے ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں وہ اپنی سانسیں اطمینان سے پوری کر سکتی تھی۔

☒

رضیہ علمدار

ایسے بھی ہیں جہاں میں

ارتضاء وارثی کا خیال

زندگی وقف جو کر دیتے ہیں خدمت کے لیے
دہر میں زیست کی معراج بھی پاتے ہیں وہی

انسانوں کی اِس دنیا کے ایسے انسان کی کہانی جو اب ناپید ہو چکے ہیں

میرا نام جواد علی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہوں۔ میں گلستانِ جوہر میں رہتا ہوں۔ پہلے ہماری رہائش برنس روڈ پر تھی۔ کراچی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ برنس روڈ کتنا مصروف علاقہ ہے۔ یہاں اردگرد مختلف قسم کی ہول سیل مارکیٹوں کے باعث ہر وقت لوگوں کا اژدھام رہتا ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا شور گونجتا رہتا ہے اور مزیدار پکوانوں کے حوالے سے بھی یہ علاقہ مشہور ہے' تاہم پہلے یہ علاقہ اتنا گنجان نہیں تھا۔ جب میں نے انجینئرنگ میں گریجویشن کیا تو مجھے کچھ عرصے بعد ہی ایک اچھی فرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

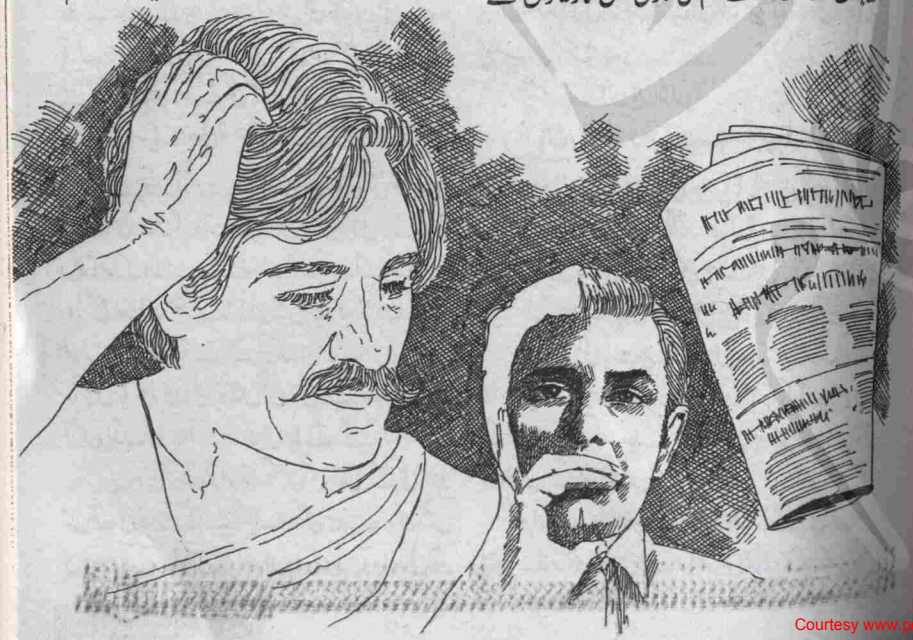

میں ملازمت مل گئی۔ میں اب برسرِ روزگار ہو گیا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے کوئی خاص ذمے داری بھی نہیں تھی۔ ایک بات ضرور تھی کہ مجھے شور شرابے سے وحشت ہوتی تھی۔ نوکری ملنے کے بعد میں روز امی سے یہی تکرار کرتا تھا کہ اب ہم کسی اچھے علاقے میں گھر لے سکتے ہیں۔ یہاں گھر سے باہر نکلو تو ہر طرف ہجوم نظر آتا ہے۔ امی کیونکہ شروع سے ہی یہاں رہائش پذیر تھیں اس لیے ان کا اس علاقے سے قلبی لگاؤ ہونا فطری بات تھی۔ بہرحال میری ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے ہامی بھر لی اور ہم لوگ گلستانِ جوہر شفٹ ہو گئے۔ یہ دو منزلہ گھر تھا جس میں پانچ کمرے نیچے اور پانچ اوپر تھے۔ کافی کشادہ گھر تھا۔ بہنیں گھر دیکھ کر بے حد خوش تھیں اور ہر وقت گھر کی سجاوٹ میں لگی رہتی تھیں۔ یہاں کیونکہ آبادی زیادہ نہیں تھی، کشادہ روڈ تھے، لگتا تھا صاف ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔ پڑوس کے دونوں پلاٹ ابھی خالی تھے۔ سامنے کی لائن میں بھی خوب صورت گھر بنے ہوئے تھے۔ نئی جگہ آہستہ آہستہ ہی پہچان بنتی ہے۔ آس پڑوس میں کوئی تھا نہیں، امی اور بہنیں بھی اکیلے پن سے بور سی ہونے لگی تھیں لیکن پھر سامنے والوں سے علیک سلیک ہوئی تو خوش ہو گئیں۔

مجھے چونکہ آفس سے گاڑی ملی ہوئی تھی تو یہاں آ کر ٹرانسپورٹ کی دقت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں روز دیکھتا تھا کہ ہمارے سامنے والے گھر سے ایک صاحب روز صبح صاف ستھرے لباس میں تیار ہو کر اسٹاپ کی طرف جاتے نظر آتے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی وغیرہ نہیں تھی اسی لیے شاید وہ اپنے آفس پبلک ٹرانسپورٹ سے ہی جاتے تھے۔

ایک دن جبکہ اتوار تھا، چھٹی تھی، میں محلے کی مسجد میں ظہر کی نماز کے لیے گیا۔ وہ بھی میرے برابر میں ہی موجود تھے۔ نماز کے بعد ان سے سلام دعا ہوئی اور ہم ساتھ ساتھ گھر کی طرف ہو لیے۔ باتوں میں پتہ چلا کہ وہ بھی سائٹ کے علاقے میں کسی کمپنی میں کام کرتے ہیں اور آفس وقت پر پہنچنے کی وجہ سے جلدی نکلتے ہیں۔ میں نے انہیں پیشکش کی کہ میرے ساتھ چلا کریں کیونکہ میں بھی سائٹ کے انڈسٹری ایریا میں ہی جاتا تھا۔ میری آفر پر وہ بہت خوش ہوئے اور میرا بہت شکریہ ادا بھی کیا۔

پھر وہ میرے ساتھ جانے لگے اور مجھے بے حد دعائیں دیتے تھے کہ میری وجہ سے ان کا خاصا وقت بچ جاتا تھا اور آرام بھی ہو گیا تھا ورنہ پہلے تو وہ آفس جاتے جاتے تھکن سے چور ہو جاتے تھے۔

ایک دن جب وہ میرے ساتھ تھے، میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ ''آپ کس پوسٹ پر ہیں؟'' پہلے تو وہ میرا منہ تکنے لگے۔ مجھے لگا کہ شاید کوئی غلط بات پوچھ لی لیکن کچھ وقفے کے بعد بولے۔

''میں ایک کمپنی میں Peon ہوں۔'' مجھے ان کے جواب پر شدید حیرت ہوئی تھی کیونکہ ان کا رہن سہن اور ظاہری حالت سے ہی لگتا تھا کہ وہ کسی اچھی پوسٹ پر فائز ہیں۔

''آپ حیران ہیں ناں؟''

''ہاں، حیرانی کی تو بات ہے۔ آپ کی ماہانہ تنخواہ میرے اندازے کے مطابق چار یا پانچ ہزار ہو گی پھر یہ گھر وغیرہ، اس سے تو لگتا ہے کہ آپ بڑی اچھی پوسٹ پر ہیں یا کوئی اور کام بھی کرتے ہیں۔''

''یہ بھی ایک کہانی ہے جس پر شاید آپ یقین نہ کریں۔'' ان کی بات پر مجھے تجسس ہوا لیکن کیونکہ ان کا اسٹاپ آ گیا تھا لہٰذا وہ کہنے لگے۔ ''اتوار کو آپ عصر کے بعد میرے گھر چائے پر تشریف لائیں۔ چائے بھی پئیں گے اور باتیں بھی ہوں گی۔''

اتوار کے روز عصر کے وقت وہ نماز کے لیے مجھے لینے آئے۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی نماز پڑھی پھر وہ

مجھے لے کر اپنے گھر کی طرف چلے۔ میں نے امی کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ پریشان نہ ہوں، مجھے دیر ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ گھر بہت صاف ستھرا تھا۔ گھر کے مکینوں کا سلیقہ ہر چیز سے جھلک رہا تھا پھر ایک پندرہ، سولہ سال کا لڑکا ٹرے لے کر داخل ہوا جس میں چائے کے ساتھ اور لوازمات بھی تھے۔ چائے پیتے ہوئے میں شدت سے منتظر تھا کہ انور صاحب اپنی کہانی شروع کریں۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے جیسے بات کا آغاز کرنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہے ہوں پھر وہ یوں گویا ہوئے۔

''میں ایک بڑی کمپنی کے سیٹھ کے پاس شروع سے ہی ملازمت کر رہا ہوں۔ پڑھا لکھا نہیں، پانچ جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ جس طرح غریب گھروں کا حال ہوتا ہے، وہی ہمارا تھا۔ والد کی تنخواہ کم تھی، والدہ بہت کھینچ تان کر گزارا کرتی تھیں۔ ایسے میں دو وقت کی روٹی مل جائے تو غنیمت تھا۔ پڑھائی کہاں ہو سکتی تھی۔ بہرحال مجھے ملازمت ملی تو گھر کے حالات کچھ بہتر ہوئے۔ میرے دوسرے بھائی بھی کہیں نہ کہیں محنت مزدوری کرتے تھے۔ والدہ کو میری شادی کا بڑا ارمان تھا۔ غریبوں کی شادیاں بھی بس کیا ہیں، کوئی لمبا چوڑا انتظام کرنا نہیں تھا۔ جمیلہ میرے ماموں کی بیٹی تھی جو میری دلہن کے روپ میں گھر آ گئی۔ وہ سگھڑ تھی، اس نے بھی گھر کے حالات دیکھے تو خاموشی سے سمجھوتہ کر لیا۔ سلائی کڑھائی میں ماہر تھی۔ اس نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا۔ وقت گزرتا رہا اور میرے دو بچے ہو گئے تو اخراجات میں اضافہ ہوا مگر گھر کی گاڑی چلتی رہی۔

میرا گھر لانڈھی میں تھا۔ وہاں سے سائٹ آنے کے لیے دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلنا پڑتا تھا، تب جا کر ٹھیک وقت پر فیکٹری پہنچتا تھا پھر اچانک شہر کراچی کو

قطعہ

جب سے تیرے خیالوں میں بھٹک جاتا ہوں
ہر آواز و آہٹ پر بھی چونک جاتا ہوں
تیرے انتظار کے نشے میں چُور ہو کے
میں جب بھی کوچہء جاناں تک جاتا ہوں

عبدالحکیم ساجد۔ منچن آباد

جانے کس کی نظر لگی کہ یہاں فسادات شروع ہو گئے۔ اچانک حالات خراب ہو جاتے اور ٹرانسپورٹ وغیرہ بند ہو جاتی۔ بڑے لوگوں کے پاس تو کاریں ہوتی ہیں، ان کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ ایک معمولی مزدور یا محنت کش کس طرح اپنی ڈیوٹی پر پہنچتا ہے۔ حالات کے پیشِ نظر میں بڑا پریشان رہنے لگا۔ میں نے شدید مجبوری کے علاوہ کبھی فضول چھٹی نہیں کی تھی۔

ہمارے صاحب جن کا نام سیٹھ عاصم غفار تھا، رحم دل آدمی تھے لیکن میں نے کبھی براہِ راست ان سے بات نہیں کی تھی۔ صرف ان کی سیکریٹری جو کام بتا دیتی تھی، وہ کر دیتا تھا۔

حالات کے اس طرح بگڑ جانے کی وجہ سے میں نے سوچا کہ اگر اب ہنگامے ہوئے تو رات کو فیکٹری ہی میں رک جایا کروں گا کیونکہ ٹرانسپورٹ بند ہو جانے کی وجہ سے میں فیکٹری نہیں پہنچ پاتا تھا۔ اب اسی طرح ہوتا، حالات کیسے بھی ہوں، میں ڈیوٹی پر حاضر رہتا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، دسمبر کا مہینہ تھا، اس روز شدید سردی تھی اور دوپہر سے ہی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ شام ہوتے ہی حالات بھی خراب ہونے لگے۔ سب لوگ جلدی جلدی گھر پہنچنا چاہتے تھے، سو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیکٹری وقت سے پہلے ہی خالی ہو گئی۔ میں حسب معمول رک گیا۔ چوکیدار نے اپنے کیبن میں انگیٹھی رکھی ہوئی تھی۔ میں وہاں بیٹھا ہاتھ سینکتا رہا۔ بارش رک چکی تھی مگر سردی بے حد تھی۔ میں اندر آفس میں آ گیا اور ایک صوفے پر لیٹ گیا اور سکڑ کر رات گزاری۔

دوسرے دن حاضری بے حد کم تھی۔ گیارہ بجے سیٹھ صاحب آئے' ان کی سیکریٹری بھی آج غیر حاضر تھی۔ میں نے ان کا بریف کیس لے جا کر آفس میں رکھا' انہیں پانی لا کر دیا۔ انہوں نے چائے مانگی تو میں نے چائے لے جا کر دے دی۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔

''انور علی.....! تم آج کس طرح آفس آئے؟''

''سر' میں تو اس رات کو یہیں رہ جاتا ہوں جب حالات خراب ہو جاتے ہیں۔'' میں نے بہت ادب سے کہا۔ انہوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہا۔ مجھے خوشی تھی کہ چلو' مالک کو اتنا تو پتہ چلا کہ میں مخلص ورکر ہوں۔ اس بات کو ایک ہفتہ ہی ہوا تھا اور مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ایک دن اکاؤنٹنٹ صاحب نے مجھے بلایا اور مجھے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔ صاحب نے اجازت دے دی ہے۔ آفس ٹائم کے بعد میں ان کی گاڑی میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے یہاں گلستانِ جوہر لائے۔ اس وقت یہاں آبادی نہیں تھی' صرف پلاٹ تھے' چند گھر بنے ہوئے تھے اور کچھ زیرِ تعمیر تھے۔ انہوں نے کہا کہ کسی کے لیے گھر بنوانا ہے تو تم کو مشورے کے لیے ساتھ لیا تھا تاکہ دو آدمیوں کی رائے شامل ہو جائے۔ میں حیران تھا کہ مجھ ناچیز کی کیا حیثیت' تاہم میں خاموش رہا تو گویا ہوئے۔

''انور علی! تمہاری قسمت پلٹ گئی ہے' خوش ہو جاؤ' سیٹھ صاحب نے تمہارے لیے یہ پلاٹ خریدا ہے جس کی کنسٹرکشن کی ذمہ داری مجھ پر ہے لیکن تم اپنی مرضی سے اس کو بنوا سکتے ہو۔'' یہ سن کر خوشی کے مارے میرے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''تمہاری محنت کا پھل مل گیا ہے۔ جب یہ گھر تیار ہو گا تو گھر کی ضرورت کی تمام اشیاء اور تمہارے بچوں کی تعلیم کا خرچ سب کمپنی کے ذمے ہو گا۔ سیٹھ صاحب تم سے بہت خوش ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مجھے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ میرے آفس کا غریب Peon میری خاطر اتنی تکلیف اٹھا رہا ہے۔''

جواد صاحب.....! یہ گھر جو آپ دیکھ رہے ہیں' میری نسلیں بھی نہ لے سکتیں۔ سیٹھ صاحب نے جو کہا تھا' اسے پورا کیا۔ گھر کی ایک ایک چیز ان کی ہی دی ہوئی ہے۔ جب یہ گھر بن گیا' تب میں نے یہ خوش خبری اپنے گھر والوں کو بتائی تھی۔ سب سجدۂ شکر بجا لائے تھے۔ میں نے سیٹھ صاحب کے پاس جا کر ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ وہ بہت مہربان انسان تھے۔ کہنے لگے کہ یہ تمہارا حق ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو، میرا نہیں۔ واقعی اللہ جب کسی پر مہربان ہوتا ہے تو قسمتیں ایسے ہی بدلتی ہیں جیسے میری۔

جواد صاحب! اللہ کا بڑا کرم ہے۔ سیٹھ صاحب اب بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن ان کے بیٹے اب سب کچھ سنبھال رہے ہیں۔ وہ بھی میری اسی طرح قدر کرتے ہیں۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں' کم ہے کہ مجھ ناچیز کو وہ دیا جس کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔'' انور صاحب اپنی روداد سنا کر خاموش ہو گئے تھے اور اُن کی کہانی سن کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دنیا اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے اور ایسے لوگ ابھی ہیں جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ احسن سلوک کرتے ہیں۔

طویل کہانی ''سچی کہانیاں'' کی ایک مقبول و معروف لکھاری کی طویل کہانی، اقساط میں

فاطمہ بلگرامی

جن کی آنکھوں میں خواب بستے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 7

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی..... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا..... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈلڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنبر بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے..... اور ایک رشتے دار رابیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اُس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ داؤد جہاں ایک طرف اس بات سے خوش ہے کہ عنبر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے، وہاں اس کے لیے یہ بات بھی حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے کہ موم نے آخر فہمیدہ سے جو اس کی بہن ہے اس کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی کیسے..... داؤد کی ملاقات رابیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رابیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

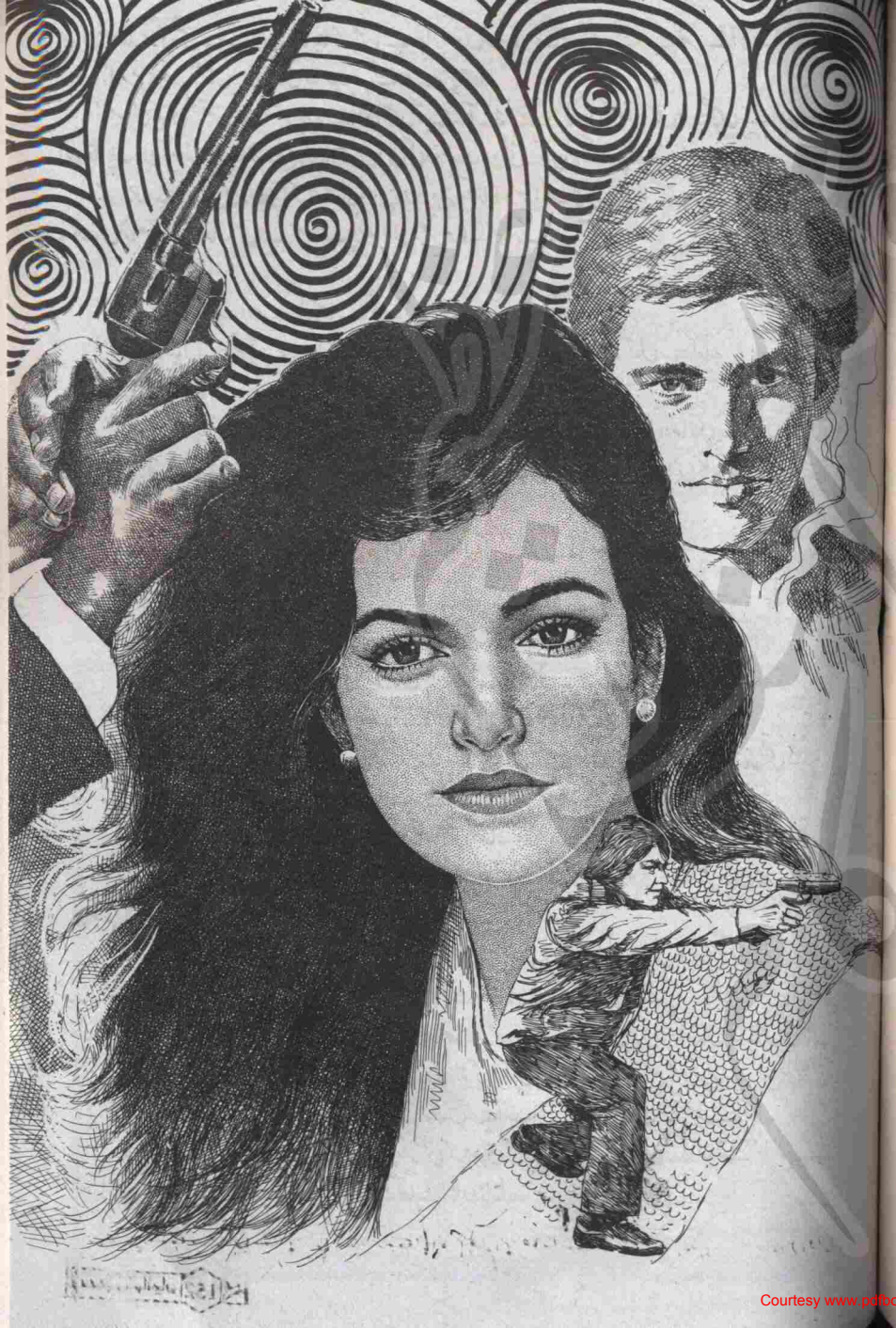

ہیروئن کا عادی بنایا گیا..... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ جیل پہنچ گیا..... اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے: **اور اب آگے پڑھیے:**

صادقہ اپنی کہانی سناتے سناتے بہکنے لگی۔ کفر بکنے لگی تھی۔ مجھ سے خاموش رہا نہ گیا اور بول پڑا۔ ''یہ کیوں بھول رہی ہو کہ عورت کا مقام بلند تر ہے عورت پیغمبروں کو پیدا کرتی ہے لیکن اس میں کوئی کمی ضرور ہے، جس کی وجہ سے وہ خود پیغمبر نہیں بن سکی۔ خیر اس بحث کو گولی مارو تم اپنی کہانی سنا رہی تھیں؟''

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میری زندگی کسمپرسی میں گزری۔ ابو کے انتقال کے بعد ایک وقت ایسا آ گیا کہ بوڑھی ماں کو بھی کئی کئی دن فاقے کرنے پڑے۔ مجبور ہو کر میں خود نوکری کے لئے نکل پڑی۔ محلے کی بہت سی لڑکیاں آس پاس کی گارمنٹ فیکٹریوں میں کام کرتیں۔ میں نے بھی اسد گارمنٹس پرائزز میں نوکری کر لی۔ صبح نو بجے جاتی شام پانچ بجے لوٹتی۔ تنخواہ معقول تھی۔ ہر ہفتے چھ سو روپے ملتے۔ زندگی کی گاڑی بہ حسن و خوبی چلنے لگی تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ میں اکیلی ہو گئی اور ایک دن۔'' وہ رک گئی اور کمرے کی سپاٹ دیوار کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہاں فلم چل رہی ہو۔ گزرے ہوئے مناظر نظر آ رہے ہوں۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ''ایک دن جب میں کارخانے پہنچی تو دیکھا میری سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہے۔ ابھی میں کچھ پوچھتی کہ برابر والی سیٹ کی رخشندہ نے کہا۔ ''تمھیں منیجر صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔'' میں ان کے کمرے کی جانب چل دی۔ بند دروازے پر دستک دیا اور اندر داخل ہو گئی۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''صادقہ! کل سے تم اسی کمرے میں بیٹھو گی۔ اب تمھیں چیکنگ کے لئے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بیٹھ کر سب کا کام دیکھا کرنا۔'' ان کی پیشکش عمدہ تھی مجھے خوشی ہوئی لیکن میں حیران بھی تھی۔ اس لیے کہ میں صرف میٹرک پاس تھی، مجھ سے پہلے جو لڑکی یہ کام کرتی تھی وہ بی اے تھی۔ اس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے عجیب سا فخر محسوس ہوا لیکن یہ فخر شام کو ذلت محسوس ہونے لگا۔ فیکٹری میں چھٹی ہو چکی تھی۔ سارے کاریگر جا چکے تھے۔ آفس اسٹاف بھی چھٹی کر چکا تھا، پوری عمارت میں صرف دو افراد تھے۔ میں اور منیجر۔ کام کچھ زیادہ تھا اس لیے منیجر نے روک لیا تھا۔ کام نمٹا ہی رہی تھی کی وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ بے چارہ بہت جلد باز تھا۔ گرم گرم ہی کھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں تر نوالہ تو تھی نہیں قلم کو چاقو کی طرح پکڑ کر اس کی آنکھوں میں گھونپ دیا۔ وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔ میں جوش و جذبات میں اتنا بڑا اقدم تو اٹھا بیٹھی تھی مگر اس کی تڑپ نے مجھے گھبرا دیا اور میں خوف سے کانپتی، لرزتی باہر نکل آئی تب تک وہ بھی کھڑا ہو چکا تھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے مغلظات بکتا ہوا دوڑا۔'' وہ اپنی کہانی سناتے سناتے رک گئی۔ کمرے میں بیٹھے ہر شخص کے چہرے پر تجسس تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر جمیلہ بولی۔ ''پھر کیا ہوا؟''

میں نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کیا اور نیچے اتر آئی۔ سیدھی اپنے گھر پہنچی اپنا سامان باندھا اور مالک مکان کو بتائے بغیر نکل پڑی کیوں کہ مجھے منیجر سے خطرہ تھا۔ وہ پولیس کے ذریعے مجھے سزا دلا سکتا تھا۔ سیدھی اسٹیشن پہنچی اور کراچی کی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ لاہور سے آتے وقت میرا ایک ہی آسرا تھا۔ میری ایک سہیلی کا آسرا۔ وہ لوگ لاہور کے تھے اور کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ اس کے گھر پہنچے کے تیسرے روز آصفہ یعنی شاداں سے ملاقات ہو گئی۔ میری طرح اس کی جسمانی ساخت بھی اتنی تبدیل ہو چکی تھی کہ میں اسے پہچان نہ سکی اور نہ یہ مجھ میں پرانی شباہت ڈھونڈ سکی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ جس بچپن کو شیخوپورہ میں چھوڑ آئے ہیں وہ اتنی دور کراچی آ چکا ہے۔ خیر میں نے پولیس کے ڈر سے اپنا نام بدل لیا تھا۔ اسے بھی اپنا نیا نام بتایا۔ یہ تو پہلے ہی دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری منعقد ہوگئی تھی۔ جب اس نے سنا کہ میں بے سہارا ہوں تو سہارا دینے کے لئے اپنے گھر لے آئی۔"

"اور تم جمیلہ۔" میں نے جمو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری کہانی مختصر ہے۔ شیخوپورہ سے ابو یہیں آ گئے۔ آئے تھے روزگار کی تلاش میں اور یہیں کے ہو رہے اتفاقاً ایک دن آصفہ سے ملاقات ہوگئی اور میں اس کی دوست بن گئی۔ لیکن تم کیسے پہنچے؟"

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ الماری والا چور دروازہ کھلا' وہ بھیانک چہرے والا سہیل داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔ اس نے ہم سب پر نظر ڈالی پھر بولا۔ "مبارک ہو۔"

کس بات کی؟"

"سولہ سال بعد ایک دوسرے کو پہچاننے کی۔"

"میرے خیال سے تم آنے سے پہلے ٹیپ ریکارڈ سن رہے تھے۔" آصفہ نے سہیل سے کہا۔

"تم نے کیسے جانا؟"

"آج کل گرینڈک کے ٹیپ ریکارڈ کا استعمال آؤٹ آف ڈیٹ ہے جبکہ تمھاری الماری کے اوپر اسپول والا ریکارڈ رکھا تھا۔ میں دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ کسی خاص مقصد کے لئے رکھا ہے۔ یقیناً اس کا مائک یہیں کہیں پوشیدہ ہوگا؟"

تمہارے دماغ کو بار بار داد دینے کا دل چاہتا ہے شاداں!" سہیل نے آصفہ سے کہا۔

"تعریف کے لئے شکریہ!"

"یہ لو۔" سہیل نے شام کا اخبار بڑھایا۔ "صبح والی خبر چھپ گئی ہے۔"

"آصفہ نے اخبار لے کر دیکھا۔ خبر کی ہیڈ لائن پر نظر پڑتے ہی چیخی۔ "ارے!"

"کیا ہوا؟" سب ایک ساتھ اخبار پر جھک آئے اور سرخی پڑتے ہی چونک پڑے۔

سہیل نے ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر سگریٹ سلگائی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔

میں نے اخبار سے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"نامہ نگار میرا دوست نہیں ہے۔ اس نے جو دیکھا وہی لکھا۔"

شگفتہ نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے آپ نے جو کہا تھا وہ سچ تھا۔ جیل میں میرے پاپا کی جگہ کوئی اور سزا بھگت رہا تھا؟"

"اخبار کی اطلاع تو یہی ہے کہ وہ کوئی اور تھا۔ اس کا پتا تب چلا جب اسے گولی لگی۔ لاش کا معائنہ کرنے کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ تمہارے بابا کی طرح گورا نہیں تھا۔ گندمی رنگت کو نکھارنے کے لئے اس نے بلیچ کریم کا استعمال کیا اور سفید بالوں پر وگ لگا رکھی تھی۔ اس کی کلائی پر ایم جی لکھا تھا جبکہ تمھارے پاپا کی کلائی پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس کی شکل ملتی جلتی ضرور تھی مگر وہ تمھارا پاپا نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔" سہیل نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ کی ساری بات صحیح ہے آپ ہی سہیل انکل ہیں۔" جمیلہ نے کہا۔

"لیکن میں آپ کی اس بکواس پر یقین نہیں کر سکتی کہ میری ممی پاپا کا قتل عثمانی انکل نے کیا تھا۔" آصفہ نے کہا۔ "ان کا قاتل غفار تھا جسے ہم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"وجہ!" سہیل نے پوچھا۔

"انھیں میری ممی پاپا سے کیا دشمنی تھی۔ وہ تو ان کے سب سے قریبی دوست تھے۔"

"میں تمھارے ہر سوال کا جواب دینے کے تیار ہوں مگر تمھیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"اس راز سے پردہ اٹھانے سے پہلے میں التجا کرتا ہوں کہ تم اول تا آخر خاموش رہو کیوں کہ کئی بار ایسا بھی ہوگا کہ تم جوش و جذبات میں بھر اٹھو گی۔ حیرت ہی نہیں غصے میں بھی....."

"میں آپ کی الجھی الجھی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔" آمنہ نے سہیل کی بات کاٹی۔

"تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میری ادھوری بات پر تم بھڑکو گی نہیں بلکہ آخر تک سننے کی کوشش کرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" آصفہ نے کہا۔

رابیل کی کہانی لمبی ہوتی جا رہی تھی اور مجھے گھر بھی جانا تھا پھر بیرا بھی بار بار ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر سے ہم ٹیبل پر قبضہ کیے بیٹھے تھے اس لیے میں نے کہا کہ "رابیل تمہاری کہانی دلچسپ بھی ہے اور پر تجسس بھی مگر میں کیا کروں کہ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے اس لیے آج یہیں تک' پھر کسی دن میں باقی حصہ بھی سن لوں گا۔"

"کوئی بات نہیں میں آج پہلی بار اتنی تفصیل سے یہ روداد ستم سنا رہا تھا کہ آپ جیسا سامع مجھے پہلی بار ملا تھا ورنہ تو لوگ صرف میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" رابیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں تمھیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں پھر میں واپس اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

"نہیں ایسی بھی جلدی نہیں ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا "وہ میری بس آ رہی ہے میں چلا جاؤں گا۔"

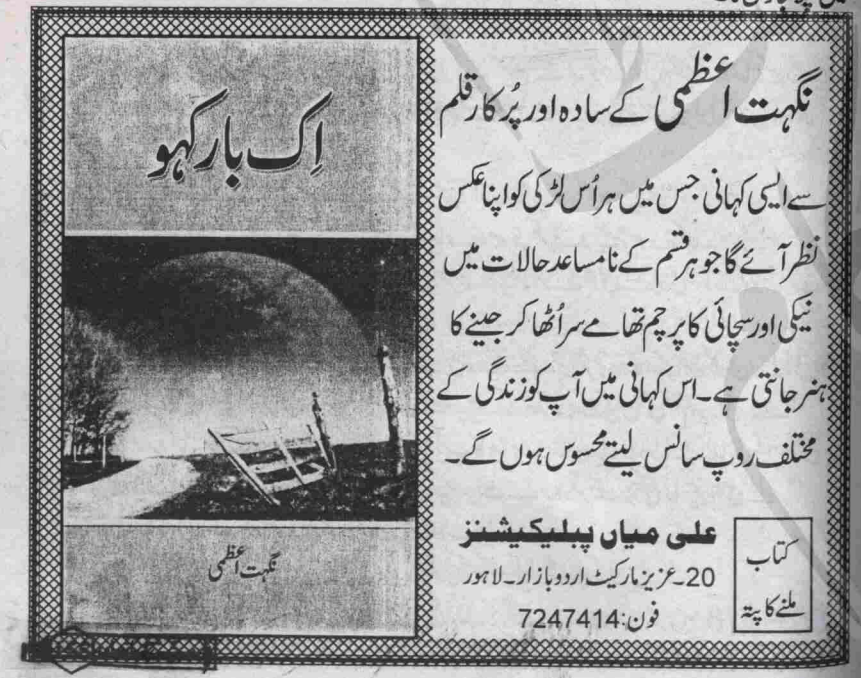

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔ دروازہ پار کرتے ہی میرے ذہن میں پھر وہی رات والی بات گونجنے لگی کہ ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے موم میری شادی فہمیدہ سے کرانے پر تلی ہیں۔ ایک بھائی سے بہن کی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ ناممکن بات ہے یا پھر..... اس سے آگے میں کچھ سوچتا کہ فہمیدہ نے مجھے دیکھ لیا اور چیخی ''ارے جناب آپ تھے کہاں؟ میں کب سے آپ کی منتظر بیٹھی ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے خالہ جانی کے یہاں جانا ہے۔''

''ارے پاگل لڑکی ابھی تو وہ اندر داخل بھی نہیں ہوا ہے اور تم نے شور مچانا شروع کر دیا۔'' موم نے اسے ڈانٹا۔

''کوئی بات نہیں، چلو میں تیار ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بس دو منٹ میں کپڑے چینج کر کے آتی ہوں۔'' کہتی ہوئی فہمیدہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''بیٹا چائے بناؤں؟ پیو گے؟'' موم نے پوچھا۔

''جی نہیں، میں چائے بہت کم پیتا ہوں۔'' ابھی میں نے جواب دیا تھا کہ فہمیدہ آ گئی اس نے موم کی طرف دیکھ کر پوچھا:

''کیا بات ہے، آپ نہیں جائیں گی؟''

''مجھے کون سے کپڑے بدلنے ہیں جو پہن رکھا ہے یہی بہت ہے۔''

گویا موم بھی جانا چاہ رہی تھیں اس لیے میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایسی کیا بات ہے جو یہ بھی اتنی جلدی دوبارہ جانا چاہ رہی ہیں۔ مگر یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دونوں باہر نکل رہی تھیں اس لیے میں بھی ان کے ساتھ باہر آ گیا اور ان کو لے کر ڈیفنس جانے والی شاہراہ پر چل پڑا۔

خالہ جانی کے یہاں پہنچا تو عنبر مجھے دوبارہ دیکھ کر خوش ہو اٹھی۔ ''واہ آج تو قسمت کا ستارا عروج پر ہے۔ جناب کی تشریف آوری دوبارہ غریب خانے پر..... زہے نصیب۔''

''ہم کیوں آئے ہیں یہ سنو گی دو اور بھی خوش ہو جاؤ گی۔'' موم نے کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا مجھے لگا جیسے فہمیدہ نے بتا دیا ہے کہ عنبر میرے بارے میں پسندیدگی کا جذبہ رکھتی ہے۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل خوش ہوا تھا کہ موم نے اپنا ارادہ تبدیل کر کہ عنبر کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔

موم کی آواز سن کر خالہ جانی اپنے کمرے سے نکل آئیں ''ارے آپ، وہ بھی اکیلے؟''

''اکیلے کہاں، میرا بیٹا بھی تو ساتھ ہے۔'' موم نے پیار سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عنبر گلاس میں شربت لے آئی تھی۔ موم کو تھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے بولی ''آپ کو تو شربت کی حاجت نہیں ہوگی۔ منہ تو ویسے ہی میٹھا ہو رہا ہوگا۔''

اس کی بات پر سب مسکرا دئے۔ لاؤنج ہی میں سب بیٹھ گئے تھے۔ عنبر شربت کا ایک اور گلاس لے آئی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولی ''نظروں سے پینے کے بعد حاجت یوں بھی ختم ہو جاتی ہے۔''

میں مسکرا کر رہ گیا۔ خالہ جانی نے موم سے کہا ''آپا آپ کا بیٹا ہندوستان جانا چاہ رہا ہے۔ باجی کی خواہش پر مشکور نے ان کے لیے وہاں جانے کا انتظام کر دیا۔ کہیں یہ حسرت لے کر وہ قبر تک نہ پہنچ جائیں اسی لیے۔''

''اچھا چلو یہ بھی اس ملک کو دیکھ لے گا۔'' موم نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہاں سے آتے ہی اس کے لیے کوئی لڑکی دیکھ کر شادی کرا دیں۔''

''میں اسی سلسلے میں تو آئی ہوں، تمہارا خیال صحیح ہے کہ داؤد کے پیروں میں بیڑی ڈال ہی دینی

چاہیے۔ ویسے جانے کا کیا پروگرام ہے؟'' موم نے پوچھا۔

''مشکور جانے وہی سب انتظام کر رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی اپنے بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنا چاہ رہی ہے، وہ بھی ساتھ جائے گی۔ ویزا کے لیے اس نے کسی سے کہا ہے۔ ویزا ملتے ہی یہ لوگ چل دیں گے۔''

ابھی باتیں جاری تھیں کہ عنبر نے آواز دی ''امی یک شد نہ دو شد چہار شد رابیل بھائی اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی اس کی بات یا انداز پر نہیں اس بات پر کہ اس کی مکمل کہانی سننا یقینی ہے۔ تبھی دروازہ کھلا اور رابیل اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بھاری بدن کی لڑکی بھی تھی۔ اس کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا مگر وہ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے مخاطب ہوئی ''داؤد صاحب آپ خاندان بھر میں اس وقت آپ ہی کے تذکرے ہیں۔''

میں مسکرا کر رہ گیا۔ رابیل نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا ''ارے بھائی داؤد یہاں کیا بیٹھے ہو۔ آؤ اوپر ٹیرس پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ بقیہ کہانی سنانا چاہتا ہے۔ یوں تو اس کی کہانی دلچسپ تھی مگر ابھی بہت باقی بھی تھی اس لیے میں اس کے ساتھ ٹیرس پر کھلی ہوا میں آ گیا۔ وہاں بید کی کئی کرسیاں بچھی تھیں۔ شاید وہاں گھر والے بیٹھتے ہوں گے۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

وہ بولا ''تو میں نے کہاں تک واقعہ سنایا تھا؟''

''سہیل اور آصفہ میں بحث ہو رہی تھی کہ وہ سہیل کی باتوں کے درمیان غصہ نہیں کرے گی۔'' میں نے یاد دلایا۔

''تو آ گئے سنئے۔'' رابیل نے کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا پھر بولا ''میں بتا رہا تھا کہ سہیل ہمیں پرانی باتیں یاد دلا رہا تھا اس نے جلی ہوئی اور ٹیڑھی میڑھی انگلیوں میں پھنسے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔ ''شاداں تم آصف علی کی بیٹی نہیں ہو مگر تمہاری ماں کا نام شادو ہی ہے۔''

''نہیں!'' بھیانک غراہٹ کے ساتھ آصفہ چیخی۔ اس نے کرائے کا بھرپور وار کرنے کے لئے ہاتھ اٹھا لیا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

''نہیں، میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی اس نے میری ماں پر الزام لگایا ہے۔ میری ماں کو آوارہ کہا ہے۔'' آصفہ چیخے جا رہی تھی۔

''پہلا جملہ سنتے ہی تم اپنا وعدہ بھول گئی ہو شاداں۔'' سہیل کے جھلسے ہوئے چہرے پر عجیب سا تناؤ تھا۔ ''میں نے کہا تھا کہ ادھوری بات سنتے ہی جذبات پر قابو رکھو گی جملہ مکمل ہونے دو گی۔''

''وعدے کا یہ مطلب نہیں جو منہ میں آئے بکے جاؤ۔'' آصفہ دہاڑی۔

سہیل نے اپنے بھیانک چہرے کو گھما کر ایک کے بعد ایک سب کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی پھر بولا۔

''میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔''

''کیسا ثبوت؟'' آصفہ نے دانت پیس کر کہا۔

''جو کہا ہے اس کا ثبوت۔'' سہیل مسکرا کر بولا۔

''یعنی!'' آصفہ کی آواز کانپ گئی۔ ''تم ایسا ثبوت پیش کر سکتے ہو جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ میں.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور چہرہ بھی روہانسی ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں!'' سہیل نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا اسی لمحے جھپٹنے کے انداز میں آصفہ نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اس لفافے سے تین فوٹو نکل کر بکھر گئے۔ دوا لٹے گرے تھے ایک سیدھا سیدھے فوٹو میں شادو تھی اور عثمانی تھا۔ عثمان کا داہنا بازو شادو کی کمر میں لپٹا ہوا تھا اور شادو کا سر اس کے کندھے سے ٹکا تھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اپنی ماں کو اتنی آسانی سے وہ اس لیے پہچان گئی تھی کہ اس کے پاس ماں کی جوانی کا ایک فوٹو تھا۔ عثمانی کی تصویر کو شگفتہ نے پہچانا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر آصفہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔

میں نے بقیہ تصویروں کو بھی الٹ دیا۔ ایک دوسری تصویر میں شادو عثمانی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ تیسری تصویر بھی محبت کی نشانی تھی۔

آصفہ نے سر تھام لیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سہیل کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹی! میں نے اب تک یہ نہیں کہا کہ تمھاری ماں بدکردار تھی اور تم ان کی ناجائز اولاد ہو۔ شادو بھابی میری بہن کی طرح تھیں۔ میں ان پر الزام لگانے سے پہلے خود مر جاؤں گا۔''

''تو...... تو کیا میرے ابو آصف علی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا؟'' آصفہ بولی۔

''آصف بھیا نے شادو بھابی سے اس وقت شادی کی تھی جب عثمانی لاہور میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی شادی تو تب ہوئی تھی جب تم شادو بھابی کے پیٹ میں تھیں اور......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ سہیل نے بتایا تھا کہ ادھر والا دروازہ بند رہتا ہے لیکن دستک اسی دروازے پر ہوئی تھی۔

''لگتا ہے وہ آ گیا۔'' کہتے ہوئے سہیل اٹھ گیا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ اندر آنے والے کو دیکھ کر ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اندر آنے والا میرا دوست کمال تھا۔ وہی کمال جس کی مدد سے میں نے آصفہ، جمیلہ اور صادقہ کو گرفتار کیا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''کمال عرف کمالے!'' سہیل نے کہا۔ یہ ہیں تمھارے وہ دوست جن کی تمھیں تلاش تھی۔ اپنے بچپن کے ان دوستوں سے ملو۔ یہ آصفہ عرف شاداں ہے۔ یہ صادقہ عرف حوراں ہے۔ یہ شگفتہ عرف شگو ہے یہ جمیلہ عرف جمو ہے اور یہ رابیل عرف رابو ہے۔''

کمال مجھ سے لپٹ گیا۔ ''دوست ہم اتنے قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے کتنی حیرت کی بات ہے۔''

''رابیل، خدا کے لئے خاموش رہو۔'' آصفہ نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''ہاں انکل آپ بتا رہے تھے میرے پاپا آصف علی کی شادی ہوئی تھی۔''

''شادی کے ایک سال بعد ہی تمھاری امی اور ابو کے درمیان ایک نظر نہ آنے والی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ دراصل تمھارے ابو میں کچھ کمی تھی۔ اس کی تصدیق لاہور کے ایک ڈاکٹر نے بھی کی تھی۔ کمی تمھارے ابو میں تھی اور تمھاری دادی کا الزام تمھاری امی پر تھا۔ وہ شادو بھابی کو طلاق دلوانے پر تل گئی تھیں۔ آصف بھیا عقل مند تھے۔ جو بھی آئے گی اسے یہ کمی کھلے گی۔ ہو سکتا ہے وہ اس راز کو طشت از بام کر دے۔ پھر وہ بھابی کو دل و جان سے چاہتے بھی تھے۔ بھابی بھی انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ صرف تنگ تھیں۔ اگر تمھاری دادی کے الزامات کی

بوچھار نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی اف بھی نہ کرتیں۔ تمھاری دادی کی وجہ سے دونوں مجبور ہو گئے۔ آصف بھیا نے بھابی کو مجبوراً طلاق دے دی۔ اسی دوران میں عثمانی شیخو پورہ آ گیا۔ وہ نیا تھانے دار بن کر آیا تھا۔ اس کی دوستی مجھ سے ہو گئی۔'' سہیل کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ''شاید تمھیں یاد نہ ہو۔ میں وہاں شراب بیچنے کا دھندا کرتا تھا۔ اس وقت پابندی بھی نہیں تھی مگر پولیس والے بھتا لیتے تھے۔ عثمانی نے آتے ہی مجھ سے ملاقات کی تھی اور کہا تھا کہ اب کھل کر دھندا کرو اگر چاہو تو جوئے کا اڈہ بھی لگا سکتے ہو۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو آمدنی بڑھ گئی۔ آصف بھیا میرے برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ انھیں میرا دھندا پسند نہیں تھا لیکن......'' سہیل انکل پھر رک گئے۔

''پھر کیا ہوا انکل؟'' آصفہ نے پوچھا۔

''لیکن ہم بچپن کے دوست تھے اس لئے ملتے رہے۔ میں نے ہی ان کی ملاقات عثمانی سے کرائی تھی۔ عثمانی باتیں کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے کچھ ہی دنوں میں انھیں اپنا معتقد بنا لیا۔ وہ ان کے گھر بھی جانے لگا۔ آصف بھیا نے اسے دوست سمجھ کے بتایا کہ میں نے غلطی سے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ تم حلالہ کر دو۔ وہ راضی ہو گیا اور گھر آ کر خاموشی سے بیوی کو طلاق دے دی۔ ان کا منصوبہ تھا کہ اس طرح حلالہ ہو جائے گا اور ان کی دلی مراد بھی پوری ہو جائے گی۔ عثمانی کو اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ ہر روز رات میں ان کے گھر آ جاتا۔ لوگ سمجھتے کہ وہ اکیلا ہے اس لیے تھانے کے بجائے ان کے گھر میں سوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک سال چھ ماہ گزر گئے مگر وہ طلاق دینے پر راضی نہ تھا۔ اس کی وجہ تمھاری پیدائش تھی۔ اس کے ماں باپ نے اس دوران میں اس کی شادی کرا دی تھی پھر بھی وہ اپنی بیوی کو لانے گھر نہیں جا رہا تھا۔ آخر میں نے ہی درمیان میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا۔ عثمانی کو طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ عثمانی چاہتا تھا کہ تمھیں بھی لے جائے مگر میں نے دھمکی دی کہ اگر تم نے زیادہ شور شرابا کیا تو میں ایس پی صاحب سے شکایت کروں گا۔ ان دنوں ایس پی کے ریڈر سے میری دوستی تھی اسی لئے وہ دباؤ میں آ گیا اور خاموش بیٹھ گیا میرے ہی زور دینے پر وہ اپنی بیوی کو لے آیا۔ اس کے گریز سے بیوی کے دل میں شک کی گرہ بڑھ گئی تھی وہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے لگی تھی۔'' سہیل نے رک کر گہری سانس لی۔

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ کمال بھی پوری دلچسپی سے کہانی سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''بیٹی شاداں، تمھاری امی کردار کی کتنی پختہ تھیں اس کا ثبوت یہ خط ہے۔'' انھوں نے جیب سے نکال کر خط بڑھایا۔

''آصفہ نے تیزی سے خط جھپٹ لیا۔ خط پر میں بھی جھک گیا۔ لکھا تھا۔ ''عثمانی صاحب! شادی شدہ عورت تب تک ادھوری رہتی ہے جب تک وہ ماں نہ بنے۔ ہر عورت کے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ماں بنے، تخلیق کے کرب ناک مراحل سے گزرے۔ اسی لیے میں نے اپنے شوہر کی بات مان لی تھی۔ جو آپ نے چاہا آپ کو مل گیا جو میں نے چاہا مجھے مل گیا۔ اب میری ایک ہی التجا ہے کہ ان باتوں کو بھول جائیے۔ مجھے بھلا دیجیے۔ اور شگفتہ کی پرورش پر دھیان دیجیے۔ ورنہ سب کی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی۔ یوں بھی آپ میرے کوئی نہیں ہیں۔ آپ سے شاداں کا رشتہ ہے مجھ سے نہیں۔ فقط شادو۔''

خط باری باری سب نے پڑھا۔ سب کے چہرے پر عجیب سا تناؤ چھا گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی کو سہیل نے توڑا۔ ''اس خط کی روشنی میں سوچو شادو بھابی کا کردار بے داغ تھا۔ وہ اولاد کی محبت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں عثمانی کے قریب گئی تھیں اور صحیح راستے پر بڑھی تھیں انھوں نے جو کچھ کیا شرع کے مطابق کیا۔ گناہ نہیں کیا۔"

"لیکن انکل میرے پاپا نے شادو آنٹی اور آصف انکل کا قتل کیوں کیا؟" شگفتہ بھی خاموش نہ رہ سکی۔

"اس کا جواب یہ خط ہے۔" سہیل انکل نے دوسرا خط بڑھایا۔ ہم سب اس خط پر جھک گئے۔ لکھا تھا۔

"عثمانی صاحب! اپنے خط میں آپ نے مجھے جی بھر کے گالیاں دی ہیں۔ گھٹیا درجے کی زبان استعمال کی ہے۔ مجھے اور میرے فرشتہ جیسے شوہر کو قتل کر دینے کی دھمکی بھی دی ہے کہ میں اب گناہ کے راستے پر چلوں' آپ کن لیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ گناہ نہیں تھا۔ طلاق کے بعد عورت کسی بھی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن بغیر نکاح کے کسی کے پاس جانا گناہ عظیم ہے اور میں اسے گوارہ نہیں کر سکتی' اگر آپ نے زیادہ زور زبردستی کی پولیس والا حربہ استعمال کیا تو یاد رکھیے میں خودکشی کر لوں گی اور مرنے سے پہلے ایس پی صاحب کے نام ڈاک کے ذریعے خط بھیج دوں گی کہ آپ کے ظلم سے تنگ آ کر میں نے خودکشی کر لی ہے۔"

خط پڑھ کر میں نے کہا۔ "ان خطوط سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ آنٹی کا کردار بے داغ تھا مگر انھوں نے قتل کیوں کیا اس کا راز تو ہنوز مخفی ہے؟" شگفتہ بولی۔

"آگے کی کہانی خود ثبوت پیش کرے گی۔ عثمانی نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے۔"

"کب اور کیسے؟"

جواب دینے سے پہلے سہیل انکل نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور گلا صاف کرنے کے لئے کھنکارے۔ تبھی جمیلہ نے کہا۔ "انکل یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب عثمانی انکل نے آصفہ کو پہچان لیا تھا تو پھر اس کی زندگی سے کھیلنے کی تیاری کیوں کرنے لگے۔ انھیں جب معلوم ہو چکا تھا کہ آصفہ کی شادی رابیل سے ہو چکی ہے تو پھر انھوں نے شگفتہ کے ساتھ شادی کیوں کرانی چاہی۔ کیا اس طرح دونوں کی زندگی برباد نہ ہو جاتی۔ کیا دونوں کا نکاح فسخ نہ ہو جاتا۔"

"نکاح فسخ نہیں ہوتا۔" سہیل انکل بولے۔

"دو بہنیں ایک ہی شخص کے نکاح میں کیسے رہ سکتی ہیں؟"

"وہ بہنیں نہیں ہیں۔ شگفتہ عثمانی کی بیٹی نہیں ہے۔" سہیل انکل نے گہری سانس لی۔ "وہ میری بیٹی ہے۔"

"آپ کی بیٹی ہوں؟" شگفتہ اچھل پڑی۔

صرف وہ ہی نہیں ہم سب بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ عقل حیران تھی کہ ایسے ایسے رازوں سے پردہ اٹھ رہا ہے جو دماغ کی چولیں ہلائے دے رہے ہیں۔

سہیل انکل نے جیب سے ایک دوسرا لفافہ نکالا۔ اس میں سے کچھ کاغذات نکال کر دیتے ہوئے بولے۔ "یہ ہے وہ ثبوت شیخوپورہ کے اسپتال کا بنا ہوا برتھ سرٹیفکیٹ۔" وہ سرٹیفکیٹ باری باری سے ہم سب نے دیکھا۔

میری اور عثمانی کی بیوی کو ایک ہی دن اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ میرے ہاں تم نے جنم لیا۔ تمھیں جنم دیتے وقت تمھاری ماں مر گئی اور عثمانی کی بیوی کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ تمھاری ماں کے مر جانے سے تمھاری پرورش میرے لئے مسئلہ بن گئی تھی۔ ادھر عثمانی اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا۔ وہ تو پہلے ہی کمزور تھی اگر اسے یہ خبر مل جاتی کہ اسے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا ہے تو وہ بھی مر جاتی۔ آصف بھیا کے سمجھانے پر میں نے تمھیں لے جا کر عثمانی کی بے ہوش بیوی کے پہلو میں سلا دیا۔ ڈاکٹروں نے اعتراض کیا تو ہم نے لکھ کر اسپتال میں دے دیا۔ برتھ سر

کے ساتھ وہ ایگریمنٹ بھی ہے۔"

ہم سب نے ایگریمنٹ بھی پڑھا۔ سب کچھ صاف لکھا تھا۔

"لیکن اب بھی یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ میری ممی پاپا کا قتل عثمانی انکل نے کیا۔"

"جس طرح میں نے یہ ثبوت اکٹھا کیا ہے اسی طرح وہ ثبوت بھی ہے۔" سہیل انکل مسکرائے۔ "کیوں کہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اپنی ہستی کو بچانے کے لئے مجھے ان ثبوت کو حاصل کرنا ہی تھا۔"

"آپ کی ہستی خطرے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! کیوں عثمانی ترقی کرتے کرتے لکھ پتی بن گیا تو میں بھی جرم کے راستے پر بڑھتے بڑھتے ہیروئن کنگ بن گیا۔ میں ہی شیر خان ہوں۔ شیر خان' کنگ آف انڈر ورلڈ۔"

ہم سب اچھل پڑے اور سہیل انکل کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ چہرے خوف سے سیاہ پڑ گئے تھے۔

رابیل ابھی اور کچھ بتاتا کہ عنبر نے آ کر کہا۔

"چلیے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ کھا پی لیں تو باتوں میں مزہ بھی آئے گا۔"

ہم نہ چاہتے ہوئے بھی نیچے آ گئے۔ خالو جان اور تحسین خالہ جانی کے ساتھ رضیہ خالہ بھی بیٹھی تھیں۔ موم کے چہرے پر مشفق مسکراہٹ تھی۔ وہ محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ رابیل نے کہا۔ "خالہ جان ایسے تو نہ دیکھیں' بے چارے کو نظر لگ جائے گی۔"

"بیٹا! ماں کی نظر بچوں کے لیے اکسیر ہوتی ہے۔ میرا بیٹا اتنے عرصہ بعد آیا ہے۔ میں اس کا ہر لمحہ اپنی آنکھوں میں قید کر لینا چاہتی ہوں۔" موم کا لہجہ مٹھاس میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ارے بڑی خالہ کبھی ہم جیسے قسمت کے ماروں پر بھی نظر ڈال لیا کریں۔" عنبر ہنستے ہوئے بولی۔

"ارے بیٹا یہی تو دنیا ہے۔ بیٹا اور وہ بھی اتنی دور سے آیا ہو اور مہمان بھی ہو تو اس کے آرام آسائش کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔" موم نے کہا۔

"اے رابیل تم تو بیچ میں مت بولو۔" رضیہ خالہ بولیں۔

"کیوں' ان کے بولنے پر پابندی ہے کیا؟" عنبر نے رضیہ خالہ کو چھیڑا۔

"آ گئیں ہمایتی' تمھیں دخل دینے کے لیے کس نے دعوت دی ہے۔" رضیہ خالہ نے جل کر جواب دیا۔

"ارے خالہ میں نہیں بولوں گی تو پھر بھابی بولیں گی اور وہ جب بولیں گی تو آپ کو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔" عنبر نے منہ دبا کر کہا تو رابیل کی بیوی بھی ہنسنے لگی۔

"اے عنبر کی بچی میرے منہ مت لگیو۔" رضیہ خالہ چیخیں۔

"کہاں ہے؟" عنبر بولی۔

"کون؟" رضیہ خالہ نے پوچھا۔

"میری بچی!" عنبر نے کہا۔

"کون بچی؟"

"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ عنبر کی بچی' کہاں ہے وہ؟ میں بھی تو اسے دیکھوں کیسی ہے وہ۔"

"بے شرم کہیں کی۔" خالہ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس میں بے شرمی کی بات کیا ہے' میں بھی تو دیکھوں میری بچی ہے کہاں' ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی اور بچی بھی آ گئی۔ اسی لیے تو میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اسی کو کہتے ہیں دیدے کا پانی مر جانا۔ ذرا بھی حیا شرم نہیں ہے۔ کس بے شرمی سے میری بچی میری بچی کہے جا رہی ہے۔ یہ کنواریوں کے چھن ہیں؟ ابھی چل تو رہی ہو۔ دیکھ لینا کیسی ادب آداب والی سرزمین پر رہے ہیں۔ جہاں کنواری لڑکیاں سر نہیں اٹھاتیں۔'' رضیہ خالہ کا ریکارڈ بجنے لگا۔ بات لمبی نہ ہو جائے اس لیے موم نے جلدی سے کہا:

''چھوڑیئے بھی آپا آپ بھی کس کی باتوں میں آ گئیں۔ یہ تو آپ کو چھیڑتی ہی رہے گی۔'' پھر میری طرف کر بولیں تم تو کھاؤ' اور اے عنبر تیرے ڈیڈ کہاں ہیں۔ ان کو بھی تو بلاؤ۔''

''خالہ وہ جائے نہ جائے' مشکور سے میں کہنے والا ہوں کہ وہ میرا ویزا بھی لگوا دے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''باپ رے باپ' آپ بھی جائیں گے؟ تب تو میں نہیں جانے والی۔ آپ ہر ہر قدم پر ٹوکیں گے' یہ کرو نہ کرو۔''

''یہ تو ہو گا۔'' رابیل ہنس کر بولا۔

تبھی خالو جو کافی دیر پہلے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔ ''داؤد میاں تیاری کر لو کل ہی مشکور پنڈی جا رہا ہے۔''

''مجھے تیاری کیا کرنی ہے۔ سب کچھ ریڈی ہے۔ میں برٹش نیشنل ہوں اس لیے مجھے ویزا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ائرپورٹ پر اترتے ہی ویزا کی مہر لگ جائے گی۔''

''میں بھی جا رہا ہوں۔ رات میں اپنا پاسپورٹ دے جاؤں گا۔ مشکور سے کہیے گا وہ اس پر بھی ویزا لے لے۔''

''تم اکیلے جاؤ گے یا بیوی بھی جائے گی۔''

''نہیں میں اکیلا جاؤں گا۔''

''یہ اچھا بھی رہے گا کیوں کہ داؤد اکیلا آپا کو اور مشکور کی بیوی کو سنبھال نہیں پائے گا۔ تم ساتھ رہو گے آرام رہے گا۔''

''یہی سوچ کر تو میں نے پروگرام بنا لیا ہے۔'' رابیل نے جواب دیا۔

''باتوں کے ساتھ کھاتے بھی جاؤ۔'' تحسین خالہ نے ٹوکا تو میں نے چمچے کی رفتار بڑھا دی۔ پاکستانی کھانے مجھے اچھے لگتے تھے اس لیے کچھ زیادہ ہی کھا لیا پھر ہم اٹھ کر رضیہ خالہ کے کمرے میں آ گئے جہاں پہلے سے ہی سب جمع تھے یعنی فہمیدہ' عنبر اور رابیل۔ عنبر بار بار رضیہ خالہ کو چھیڑ رہی تھی اور وہ جز بز تھیں۔ ہنسی ٹھٹھول میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور شام گھر آئی۔

''داؤد اب گھر بھی چلنا ہیں۔ تمہارے ڈیڈی آ گئے ہوں گے۔'' موم نے کہا تو محفل برخاست ہوئی۔ ہم لوٹ آئے۔

آگے کا احوال جاننے کے لیے
آئندہ ماہ شمارہ جولائی میں چھٹی قسط ملاحظہ فرمائیں

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

حنیف سحر

گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال

صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زمانہ طوائف کہتا ہے، چوتھا حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھو' ہم دونوں کے حلق میں کلیجہ آ گیا اس وقت تو میں نے یہی محسوس کیا تھا بعد میں جانا کہ اس وقت میں تھی جس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی، فیصل تو ان لوگوں سے ایسے ملا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی' وہ فیصل کے واقف کار تھے۔ میں دور کھڑی تھی' وہ ان سے مل کر آیا اور بولا۔ ''چلو.....''

''کون تھے؟'' میں نے پوچھا

'ملنے والے تھے' اس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا

'تم نے کیا کہا انھوں پوچھا تو ہوگا؟'

'ہاں پوچھا تھا میں نے کہہ دیا میری بہن ہے اس کے میکے چھوڑنے جا رہا ہوں' اس نے پھر اطمینان سے جواب دیا

'انھیں شک نہیں ہوا؟' میں نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک دم سے پھر کانپ گئی، کیونکہ وہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ 'فیصل.. وہ تو.. ہمارا پیچھا کر رہے ہیں' میں گھگھیائی

'تم ڈرو مت وہ کچھ نہیں کرنے والے' فیصل نے ایک بار پھر اسی اطمینان سے کہا۔

'تو پھر وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں، آخر بات کیا ہے تم مجھے بتا کیوں نہیں رہے...؟'

'کہہ تو دیا وہ کچھ نہیں کہیں گے' وہ اس بار جھنجلا گیا

'اچھا!' میں اب پوری طرح ڈر گئی تھی، تھوڑی دیر بعد جب ہم ایک اور موڑ مڑنے لگے تو وہ دونوں ہمارے ایک دم سامنے آ کے کھڑے ہو گئے اور میں رکتے رکتے جیسے لڑکھڑا سی گئی۔

'ادھر نہیں اُدھر...' ان میں سے ایک بولا جو کافی لحیم شحیم اور تنومند تھا۔

میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں 'یار' کہا تو تھا کہ کل لے آؤں گا، لگتا ہے تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا' فیصل قدرے غصیلے لہجے میں بولا

'نہیں' آج اور ابھی ہمارا موڈ بن گیا ہے کیوں بھئی شیدے!' اس لحیم شحیم نے اپنے ساتھی سے تائید چاہی..

'نہیں' آج نہیں... میں کہہ تو رہا ہوں کہ کل لے آؤں گا' فیصل کی جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی...

'سوچ لے فیصل تو نے ہماری بات نہ مانی تو یہاں سے جا نہیں سکتا۔ اسی نے کہا جواب تک بولنے والا تھا دوسرا تو جیسے یوں تھا کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں تھی،

میری سمجھ میں یہ بات بہر حال آ گئی تھی کہ فیصل کے ان لوگوں سے کچھ ایسے مراسم تھے کہ وہ اس کی ان حرکتوں سے واقف تھے جس کی وجہ سے انھوں نے فیصل سے اتنا گھٹیا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا اور میں یہ جان کر خوف سے کانپ رہی تھی کہ خدا میرے گناہ کی مجھے کس قدر بھیانک سزا دینے والا تھا.. یہ جو میں نے اپنے شوہر غفار کی امانت میں خیانت کی تھی' اس کی سزا اتنی جلدی اور اتنی خوفناک اور لرزہ خیز ہو گی ایسا میں نے سوچا بھی نہ تھا حالانکہ جن حالات و واقعات پر میں نے یہ شہر چھوڑتے ہوئے غور کیا تھا وہ بھی کم اذیت رساں نہ تھے میری ماں، میری چھوٹی بہن مدیحہ اور میرا بے قصور باپ یہ سب رشتے اس طوفان کی زد میں آ کر سوکھے پتوں کی طرح بکھرنے والے تھے جو میں اپنے پیچھے چھوڑ کے جا رہی تھی.. مگر اس وقت جس منظر میں کھڑی ہوئی تھی یہ تو پل کے پل میری روح تک کو جھنجھوڑنے کے درپے تھا... لمحے بھر کو میں نے خود کو اور اس سمے کو بھی کوسا جس کے بہاؤ میں اس وقت خود کو روک نہ سکی جب فیصل کے اندر کے شیطان نے مجھے آج اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا اور اب میں بے بسی سے کسی کٹی پتنگ کی طرح اپنے مقدر اور مستقبل دونوں سے لاعلم تھی کہ جانے اب کس قیامت سے میں گزرنے والی ہوں.. میرے گھر والے تو بہ

کب ان عذابوں کا سامنا کریں گے جو میری وجہ ان پر نازل ہونے والے تھے لیکن میں نے تو گھر قدم نکالتے ہی اپنی بربادی کو اپنے سامنے کھڑے پایا تھا.. اور اس وقت اپنے گناہ کے احساس کے بوجھ تلے دبی ہوئی ایک میری جیسی گناہ گار عورت کے علاوہ اور کیا سوچ سکتی تھی کہ زمین پھٹے اور اس کی آغوش میں سما جاؤں مجھے کھڑے کھڑے موت آ جائے مگر میں کوئی باعصمت، باکردار اور پاکیزہ سی نہ تھی جو اپنے پنوں کی تلاش میں نکلی اور راستے میں شیطان صفت انسان نما درندے نے اس کی عزت میلی کرنا چاہی تو قدرت نے جوش میں اور کسی زندہ زمین میں جا اتری۔ خدا نے اس کی بے داغ اور شفاف پانیوں کی طرح نتھری ہوئی منزہ محبت اور جوانی کو دنیا کے ایک غلیظ ہوس پرست انسان کی بدنیتی سے آلودہ ہونے سے بچا لیا تھا.. میں تو جس تھی جو سر تا پیر تک ایک ہوس کے غلام کی ہوس کی دل میں بہ خوشی و رضا اترتی چلی گئی تھی... عورت کے لیے یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کی کوئی معافی ہے نہ توبہ... اس گناہ کی صرف سزا ہے اور میں سزا کے دہانے پر کھڑی اپنے نصیب کے فیصلے کی منتظر تھی... فیصل ان وحشیوں سے میری لیے اپنی جان پر کھیلنے کی نہیں بلکہ آج کے بجائے مجھے کل ان درندوں کے حوالے کرنے کی مہلت مانگ رہا تھا.. یہ موقع جس ہوشمندی اور ہوشیاری یا مکاری سے مجھے اس وقت ان لوگوں سے بچانے کا تھا فیصل وہ ہی کچھ کر رہا تھا اور وہ جن کے جسم میں شیطان نے پوری طرح ہلچل مچائی ہوئی تھی' وہ بھلا کل تک کا صبر اور انتظار کیسے کرتے اس لیے فیصل کے منتے ترلے سب بیکار جا رہے تھے اور وہ مسلسل اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے... نہایت اذیت اور لاچاری سے میرے آنسو نکل آئے اور مجھے غفار کا خیال آیا جو میرا شوہر' میرا نگہبان تھا' وہ ہی تھا جس کی میں غیرت تھی اور اپنی غیرت کے لیے مرد فیصل کی طرح منت سماجت نہیں کرتے بلکہ جانوں پر کھیل جایا کرتے ہیں.. یقیناً غفار بھی ایسا ہی کرتا وہ اپنی عزت کے دشمنوں سے کمزور بھی ہوتا تب بھی اس وقت تک لڑتا جب تک اس کے تن میں ایک آخری سانس باقی رہتا اور لٹیروں کو میرے آنچل تک پہنچنے نہ دیتا۔ مگر فیصل نے ایسا کچھ نہ کیا کیونکہ وہ میری عزت کا خود بھی ایک طرح سے لٹیرا ہی تھا اس جہنم میں جھونکنے والا وہ ہی تو تھا ورنہ اس رات اس نے وہ شب خون نہ مارا ہوتا تو آج میں یوں بیگانوں کی نگری میں لٹنے کو نہ لائی گئی ہوتی، عورت کی یہ بھول ایسی لرزہ خیز ہے کہ وہ اس کے بعد ساری دنیا کو گواہ بنا کر بھی یہ اقرار کرے کہ اب وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرے گی تب بھی اسے معاف کر کے پھر سے پاک دامن عورتوں کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا اور میں اب اس صف سے اس طرح نکال دی گئی تھی کہ میری حیثیت ایک طوائف جیسی بلکہ اس سے بھی بدتر تھی آج سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ طوائف بھی سماج میں اس سے زیادہ محفوظ ہے جیسی غیر محفوظ اس رات میں تھی۔

کافی تو تکار کے بعد آخر کار فیصل کی ہار ہوئی اور وہ انسانوں کے بھیس میں عزتوں کے لٹیرے جیت گئے... فیصل نے مجھ سے جب ان کی نیتوں کا احوال بیان کیا تو میں سارے وجود سے کانپ کے رہ گئی۔ میں نے فیصل سے کہا کہ انھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کوئی ایسی ویسی عورت ہوں ان کی ہمت کیسے ہوئی ایک شریف عورت کے بارے میں اس طرح کی بات سوچنے کی... تب ان میں سے ایک بولا۔ ''یہ خود ہمارے ساتھ ایسے بہت سے پروگراموں میں شریک ہو چکا ہے تو ہم سب جانتے ہیں' انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ میرے ساتھ فیصل کے ناجائز تعلقات ہیں، ان سے فیصل کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی انھوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ پر ایک اور دل ہلا دینے والا انکشاف کیا فیصل مجھے جہاں لے جا رہا ہے' یہ میرا سودا کر کے بھاگ آئے گا اور یہاں واپس آ کر اس کا منصوبہ یہ ہے کہ یہ میرے بارے میں اپنے اور میرے خاندان میں یہ کہے گا میں اپنے ایک آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوں میرا سارا مال ہڑپ کرنے کے علاوہ اس سنگدل اور شقی القلب انسان کا یہ پلان کافی پہلے سے بنایا ہوا تھا وہ خود کو بے قصور ثابت کر کے دوبارہ سے خاندان والوں کی نظروں میں سرخرو ہونے کا پورا ڈراما تیار کر چکا تھا تا کہ اپنا مستقبل محفوظ بنا سکے اس نے یہ بھی سوچا ہوا تھا کہ اگر میرے ابا یا شوہر نے اسے دوبئی نہ بلایا تو وہ ان پیسوں سے باآسانی خود دوبئی چلا جائے گا جو مجھ سے لوٹ کر اور مجھے بیچ کر اسے حاصل ہونے والے تھے۔ یہ سب میرے ساتھ وہ شخص کرنے والا تھا جسے میرے باپ اور میرے شوہر نے میری عزت اور جان کا محافظ بنا کے میرے گھر میں ٹھہرایا تھا۔

فیصل کی اس بے پناہ کمینگی کا راز کھلنے کے بعد میں جیسے کھڑے کھڑے ایک زندہ لاش میں ڈھل گئی میری روح میرے جسم میں ہوتے ہوئے بھی مجھے یوں لگا جیسے خاموشی سے ٹھنڈی قبر میں جا سوئی ہے۔ میرے لہو کی بوند بوند آناً فاناً فیصل کے خون کی پیاسی ہو گئی اور میرا بس نہ چلتا تھا کہ میں اس وقت فیصل کے جسم کا ایک ایک حصہ اپنے ہاتھوں سے کاٹ کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں ان لوگوں نے یہ سب کچھ مجھے اس لیے بتایا کہ اس وقت وہ مجھے فیصل سے چھین کر خود ہڑپ کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں فیصل انھیں دھوکا دے کر سارے مزے اکیلے ہی لوٹ لینے کی نیت کر چکا تھا جب کہ وہ کئی لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے وقت فیصل کو اب سے پہلے مفت میں بنا کسی کوشش اور شمولیت کے حصے دار بنا چکے تھے اور آج جب اس کی باری ہے تو فیصل انھیں دھوکا دے کر اکیلے ہی سب ہتھیا لینا چاہتا ہے... وہ جھوٹ بول رہے تھے یا سچ میں دونوں ہی صورتوں میں سچ چوراہے پر بے آبرو ہو چکی تھی اب میرے پاس نہ بھاگنے کا راستا تھا نہ واپسی کا۔

میں نے یہ سب سن کر ان سے کہا کہ میں ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں مگر مجھے فیصل کے خون سے ہاتھ رنگنے کا موقع دیا جائے... وہ شاید میری یہ بات نہ مانتے کہ قتل وغیرہ جیسا فعل خود ان کے حق میں نہ تھا مگر ابھی وہ دونوں کوئی ایسا فیصلہ کرتے کہ فیصل کے بارے میں میری بات مانیں یا نہ مانیں کہ بہت اچانک فیصل وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور رات کے اس پہر ان حالات میں ان دونوں نے فیصل کے پیچھے جانے اور اسے پکڑنے کے بجائے مجھے قابو کرنے پر زیادہ توجہ دی یوں اس رات میں ان دونوں حرام خوروں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی تھی۔

نشے میں دھت وہ دونوں خبیث جب صبح تھک ہار کے سو گئے تو میں نے اپنے سارے بکھرے وجود کی قوتوں کو جمع کیا اور اس ویران پڑے مکان میں جو ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں آس پاس آبادی نہ ہونے کے برابر تھی... میں نے کسی طرح وہ ہتھیار ڈھونڈ نکالا جس سے ان دونوں کو ذبح کرنا میرا مقصد تھا حالانکہ میں ان ناقابل بیان حالات میں فیصل کی وجہ سے پہنچی تھی اور وہ رذیل ان کتوں کی غلیظ خواہشات کی وجہ سے بچ کر بھاگ نکلا تھا۔ میں نے ان دونوں کو زندگی کی قید سے آزاد کرا دیا تھا اور یہ سب میں نے اتنی تیزی سے اور ایسی مہارت سے کیا تھا کہ آج سوچتی ہوں تو اپنی اس جرات پر حیران ہوتی ہوں کہ یہ اتنا بڑا کام میں نے اکیلے کیسے کر لیا تھا۔

سائرس کی نظر اسی وقت نصرت کی طرف بے اختیاری میں اٹھ گئی تو اس نے دیکھا کہ نصرت کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ اس وقت مارے اچنبھے کے' کچھ

کہنے ہی والا تھا کہ سائرس نے اسے اشارے سے چپ رہنے کو کہا سائرس کو اندازہ تھا کہ اس وقت جس رو میں بلقیس بہہ رہی تھی' اس میں وہ ایسا ہر سچ بول دینے پر خود کو آمادہ پاتی تھی جو اس نے کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں بولا تھا۔

بلقیس جیسے سانس لینے کو رکی تھی مگر وہ اب تک اسی منظر میں قید تھی اور اس طرح بڑے بڑے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جیسے ابھی ابھی اس نے ان دونوں شیطانوں کا خون کیا ہو۔

'میں نے ایک کی چھاتی میں وہ زمین میں گاڑنے والا نوکیلا سبل اتارا وہ چیخا تو مجھے لگا کہ دوسرا اس کے شور سے اٹھ کے بیٹھ جائے گا لہٰذا فوری طور پر وہ پہلے والے کے سینے میں گڑا ہوا سبل تیزی سے نکالا اور اس کے برابر میں آڑا ترچھا لیٹا ہوا دوسرا خبیث بھی اب اسی کی طرح چیخ رہا تھا اب میں ایک دفعہ پہلے کے سینے میں اتارتی اور دوسری بار دوسرے کے سینے کو کھود ڈالتی تھی سرخ سرخ لہو کے فوارے چھوٹے اور یہ ساری جگہ جسے کمرا ہی کہنا چاہیے تھا ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے بقرعید پہ جانوروں کو کاٹنے سے پیدا ہوتا ہے میں اپنے ان دونوں مجرموں کے حوالے سے صرف ان کے نام جان سکی تھی جو کم گو تھا' وہ شیدا تھا مگر شیطانیت میں دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہ تھا.. اس لمبی زبان والے کا نام شمشیر تھا...

جب دونوں تڑپ تڑپ کے ٹھنڈے ہو گئے تو میں ایسے ڈکرا ڈکرا کے روئی کہ اگر میں کوئی باکرہ باعصمت لڑکی ہوتی تو میری آہ و فریاد سن کر آسمان گر پڑتا مگر میں ایک گناہ گار عورت تھی جس کی آہ و بکاہ کے زمین تو زمین آسمان کے پاس بھی کوئی معنی نہ تھے... پتا نہیں کب تک روتی رہی اور کوئی کب تک رو سکتا ہے اس لیے چپ ہونا ہی تھا سو ہو گئی تھی، پھر ہوش و حواس بحال ہوئے تو سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا کروں' کہاں جاؤں' سب سے زیادہ جو جذبہ جوش مار رہا تھا' وہ جوش انتقام کا جذبہ تھا میں فیصل کو بھی اس انجام تک پہنچانا چاہتی تھی اور شاید اس کے بعد کسی بھی طرح خود کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتی، کہتے ہیں انتقام ایسا جذبہ ہے جو اتنا نقصان اسے نہیں پہنچاتا جس سے انتقام لیا جانا ہوتا ہے اس سے زیادہ یہ خود کو تباہ کر دیتا ہے میں بھی اس وقت خود کو موت کے حوالے کر دیتی تو آج یوں ٹکے ٹکے کے لوگوں کی آرزوؤں کی بھینٹ نہ چڑھ رہی ہوتی' آج تو مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں اور کیوں آئی ہوں ...کوئی زمانہ تھا جب صرف ڈیرے دار اور خاندانی طوائفیں ہوتی تھیں مگر آج زمانہ بڑے عجیب داؤ پیچ سے بدل رہا ہے آج جو اصیل رنڈیاں ہیں وہ شرافت کی عیش و طرب کی زندگی خوب چین سے گذار رہی ہیں انھیں اب بچپن سے ہی طوائف بننے کے بھید بھاؤ نہیں سکھائے جاتے بلکہ انھیں ابتدا ہی سے اچھے سے اچھے تعلیمی اداروں میں نام نہاد شرفاء کے بچوں کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے پھر جلد ہی یہ لڑکیاں کسی سیاست داں کسی مل کے مالک کسی زمیندار کے بیٹے کو قابو کر لیتی ہیں، کسی بڑے افسر کے گھر کو نشانہ بناتی ہیں، کچھ ایسی بھی خوش نصیب ہیں جن پر بڑے گھروں کے لونڈوں کے دل ریجھ جاتے ہیں اور یوں زمانہ ایسی قیامت کی چال چل رہا ہے کہ طوائفیں شریف گھروں میں جا کے بیٹھ رہی ہیں سمجھو اب عزت والوں کی ناموس کی حفاظت بازاروعورتیں کر رہی ہیں اور ان کی کمی کو شریف گھروں کی مجھ جیسی عورتیں کوٹھوں کو آباد کر کے پورا کر رہی ہیں اب بھلے ہی میں اصیل نہیں ہوں میرا کوئی رنڈی والا شجرہ نسب نہیں ہے مگر خریدار اور تماش بین کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ طوائف خاندانی ہے یا کسی شریف زادی کو سماج نے اپنے چھل کپٹ سے طوائف بنا دیا ہے سو دنیا بڑی سرعت سے بدل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی ہے۔

اب مجھے اپنے بارے میں فیصلہ کرنا تھا اور میں اپنی معصوم بہن کو بھی اس حرام زادے فیصل کے ہاتھوں میں پہنچنے سے بچانا چاہتی تھی۔ اس وقت فیصل سے انتقام لینے سے بھی زیادہ مجھے یہ چیز اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی کہ اگر فیصل اپنے مکروہ ارادوں میں کامیاب ہوگیا تو میری معصوم بہن مجھ سے بھی زیادہ بری طرح برباد ہوجائے گی، لیکن بے بسی ایسی کہ میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر گھر واپس جاتی ہوں شاید بہن تو بچ جاتی مگر عذابوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوتا کہ اس کا انت کیا اور کیسے ہوتا نہ میں جانتی تھی نہ کوئی اور مجھے بتا سکتا تھا کہ اس ساری کہانی کا انجام کتنا دلخراش ہوگا البتہ ایک بات میں اچھی طرح جانتی تھی کہ خواہ کیسا ہی قدم اٹھالوں اس سارے قصے کا انجام ہے بہر حال دردناک چاہے وہ جیسے بھی ہو... اس وقت شاید میں نے اتنا نہیں سوچا تھا اس وقت تو بس دو ہی باتیں میرے ذہن میرے دل میں ہلچل مچا رہی تھیں کہ میں اپنی بہن کو کیسے بچاؤں اور فیصل کو کیسے ٹھکانے لگاؤں جو ان سب حالات کا ذمہ دار تھا۔ سوچتے سوچتے تھک گئی مگر کچھ بھی فیصلہ نہ کرسکی کیونکہ مجھے اپنے ابا اور شوہر کا ڈر بھی لگا ہوا تھا خدانخواستہ میرے کسی بھی غلط قدم سے میرے باپ نے کوئی ایسا قدم اٹھالیا جس سے میری ماں کی زندگی میں اندھیرا ہو جائے تو...؟ اس لیے خوف سے ڈرتی کانپتی رہی مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی، میرا ساز و سامان میرے پاس تھا، اس میں سے کپڑے نکال کر میں نے خود کو ایسا کرلیا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ میں ایک ایسی قاتل عورت ہوں جو کچھ سے پہلے دو دو قتل کرکے نکلی ہوں، میرے پیروں میں لرزش تھی جسے میں ہر طرح کے جتن کرکے نارمل رکھنے اور دکھنے کے قابل بنا رہی تھی، رات میں تو اس علاقے میں لوگ دیکھنے سے بھی نظر نہیں آتے تھے مگر اب کافی لوگ آتے جاتے دکھ رہے تھے، یہ دن کا وقت تھا.. میں لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی جیسے تیسے وہاں سے نکلی اور پھر بازاروں، مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی اس علاقے کے سائیں بابا کے مزار کے احاطے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں ہر تھوڑی دیر بعد جانے کتنی ہی باتیں یاد کرکر کے رونے لگتی تھی.. مزاروں پر کوئی کتنا بھی روئے، وہاں کوئی کسی سے نہیں پوچھتا کہ کیوں بین کرتے ہو؟ کیا لٹ گیا ہے تمہارا کیونکہ وہاں سب ٹوٹے پھوٹے خواہشوں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگ ہی آتے ہیں اور سب کو کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ کوئی دعا مانگتا ہے کوئی معافی مانگتا ہے کوئی پناہ مانگتا ہے اور یوں سمجھو کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا مانگوں انسان ایسا بے دست و پا ہو جائے تو یوں جانو اس کیفیت کو صرف وہ ہی محسوس کرسکتا ہے جو اس سے گزرا ہو ایسا انسان جس پر ایسا وقت نہ آیا ہو کبھی... اسے تو یہ سب کچھ ایک میلو ڈراما سے زیادہ نہیں لگتا۔

شام تک میں اسی درگاہ میں بیٹھی رہی شام کے بعد وہاں رش بڑھنے لگا اور میں اس بھیڑ سے کچھ اور خوف زدہ ہوگئی اس وقت میرے دل میں یہ خیال بڑی شدت سے آیا کہ کاش میں اپنی ماں سے مل سکتی کاش میں اپنی بہن کو ایک بار اور دیکھ سکتی درگاہ پر اتنے لوگ آتے ہیں ان کی دلی مرادیں پوری ہوتی ہی ہوں گی تب ہی تو آتے ہیں لوگ اور ان کی بھیڑ بڑھتی ہی جاتی ہے، میں بھی شادی سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ کئی بار آچکی تھی مگر اب مجھے یاد نہیں تھا کہ میں نے ان زمانوں میں کون سی دعائیں مانگی تھیں لڑکیوں کی شادی نہ ہوئی ہو تو ان کے پاس شاید اس سے زیادہ اہم کوئی دعا نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لیے ایک اچھا شوہر

اور اچھا گھر مانگیں میں نے اگر ایسی کوئی دعا مانگی تھی تو میں سمجھتی ہوں وہ ضرور پوری بھی ہوئی تھی جیسا گھر اور جو کچھ مجھے ملا تھا' وہ میری ماں کے بقول بڑی قسمت والی لڑکیوں کو ملتا ہے مگر میری ماں نہیں جانتی تھی کہ وہ ساری خوشحالی اور اکیلے کی آزادی اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل کرنے کے لیے کتنی ہی لڑکیاں ساری زندگی خواہش کرتی ہیں، جدوجہد کرتی ہیں کتنے ہی آگ کے دریا انھیں اپنی اس آرزو کی تکمیل میں پار کرنے پڑتے ہیں تب بھی سب کنارے نہیں لگتیں' کتنی ہی عورتیں اس منزل کو پانے کی تمنا میں بوڑھی ہوجاتی ہیں اور کئی ایسی بھی ہوتی ہیں جوان گھروں سے بھی نکال باہر کی جاتی ہیں جوان کے لیے کسی بھی طرح دوزخ سے کم نہیں ہوتے۔

ساس نندوں کے نہ ختم ہونے والے جھگڑے اور پھر دیورانیوں، جٹھانیوں کے جلاپے.. ایک گھر پانے کے لیے ایک لڑکی کتنے پل صراط پار کرتی ہے یہ مجھ جیسی خوش قسمت لڑکی بھلا کیسے جان سکتی ہے جس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ سب کچھ پالیا جسے حاصل کرنے میں ایک عورت کی پوری زندگی گذر جاتی ہے تب بھی یہ وثوق سے کہنا مشکل ہے وہ اپنی بہترین عمر میں اپنی خواہشوں کی تکمیل ہوتے ہوئے دیکھ سکے گی یا نہیں زیادہ تر عورتوں کو اپنے مکمل گھر اس وقت ملتے ہیں جب وہ بوڑھی ہو جاتی ہیں اور جسم و جاں میں جوانی' رعنائی' وہ بانکپن موجود ہی نہیں ہوتا جس کا نشہ کوئی بھی انسان ساری عمر نہیں بھولتا مگر...

میری اس زندگی کو آپ کیا کہیں گے جس کی ابتدا ہی ایسی تھی کہ کوئی بھی عورت اس پہ رشک کرسکتی ہے مجھے وہ سب کچھ ملا اور ایک ذرا سی غلطی سے وہ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا اور میں بے آسرا بے نام و نشان اس طرح کھڑی ہوں جیسے اس اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں رہا.. کیا تقدیر اسی کو کہتے ہیں کہ مجھے سب کچھ ملا پھر بھی مجھ سے چھین لیا گیا اور کسی کو کچھ بھی نہیں ملتا اور وہ ساری زندگی اس کی بس جستجو ہی کرتا رہتا ہے اپنی اس بربادی پر میں ایک بار پھر بے طرح رو پڑی اور صاحب مزار کی طرف دیکھ کر دل سے صرف اتنا بولی کہ..... 'بابا جی' میں جانتی ہوں کہ مجھے میرا کھویا سکھ چین اور وہ سب کچھ جو میری ذرا سی بھول کے وجہ سے میرے مقدر سے دور ہوگیا ہے وہ سب نہ میں مانگتی ہوں اور نہ آپ مجھے لوٹا ہی سکو گے مگر اس وقت اگر میری ماں بہن مجھے مل جائیں تو یہ بھی میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ ہوگا۔'' دل سے گڑگڑا کے التجا کی حالانکہ کہیں دماغ کے کسی گوشے میں یہ شک سرسرایا تھا کہ میری ماں بہن یہاں سے بہت دور ہیں اور میں ابھی تو ان سے مل کر آئی ہوں' وہ کیوں اتنی جلدی اور بلاوجہ مجھ سے ملنے آئیں گی یعنی بے یقینی کا عفریت بھی میرے وجود میں پوری طاقت سے رینگ رہا تھا.. لیکن... میری آنکھیں جیسے پلک جھپکنا بھول گئیں حیرت اور انجانی خوشی سے میری قوتِ گویائی سلب ہوگئی میری ماں اور میری بہن مدیحہ میرے سامنے سے گزر رہی تھیں اور میں انھیں آواز دینا چاہتی تھی بلکہ دے رہی تھی مگر مجھے لگا کہ وہ میری آواز سن نہیں پا رہیں... پھر میں سب کچھ بھول کر کسی زخمی پرندے کی طرح ان کی طرف لپکی... لوگوں کو لگا کہ میں کوئی پاگل ہوں یا مجھے طویل عرصے بعد کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے لہٰذا کافی لوگ میری طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے مجھے اس ہمدردی میں راستہ دینا شروع کردیا کہ میں جہاں تک پہنچنا چاہتی ہوں' وہاں تک پہنچ جاؤں اور میں دیوانہ وار بھرتی ہوئی بالآخر اماں تک پہنچ گئی اماں تو مجھے دیکھ کر حیران ہی ہوتی رہیں مگر میں ان سے لپٹ کر اس انداز میں بلک بلک کے روئی کہ اماں کے پہلے تو اوسان جاتے رہے وہ سمجھ ہی نہیں پائیں کہ آخر مجھے ہوا کیا ہے مجھ پہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا افتاد پڑی ہے میں اس طرح کیوں رو رہی ہوں..
مجھے بے تحاشہ روتے دیکھ کر مدیحہ بھی آپا آپا کہہ کر پھوٹ پڑی اور اماں غریب کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ رہا کہ وہ بھی مجھے چپ کراتی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی روتی جاتی تھی...

سائرس نے دیکھا کہ ایک عورت جو کچھ دیر پہلے صرف ایک طوائف تھی اور اس کے ناز و ادا سب بکاؤ لگتے تھے وہ کسی بھی پہلو سے عورت کے اس طے شدہ معیار پر پوری نہ اترتی تھی جو سماج نے ایک باوقار عورت کے لیے مقرر کر دیے ہیں سائرس کے سامنے بلقیس ایک ایسی ہی عورت کی شکل میں نہ صرف موجود تھی بلکہ وہ اس لمحے میں پوری طرح وہ ہی عورت معلوم ہوتی تھی جو معاشرے میں ماں تھی، بہن تھی اور بیٹی تھی۔ بلقیس پر کیا گذری اور زمانے نے اس کے ساتھ کیا کیا وہ کیسے تباہ و برباد ہوئی اس سے بہت الگ اس وقت وہ سراسر ایک ایسی عورت کی تصویر بنی غم واندوہ میں ڈوبی آنسو بہا رہی تھی جس کے آنسو اتنے قیمتی ہیں کہ دنیا کے جانے کتنے ہی مردان آنسوؤں کی سچائی پر ایمان لا کر اپنی جانون پر کھیل جائیں بلکہ ہر روز کھیلتے ہیں مگر بلقیس کچھ اس طرح اجڑا ہوا مزار تھی کہ کوئی اس غریب کی لاش پر دیا تک جلانے کو آمادہ نہ ہو... کیسے ہو جاتا ہے انسان اس قدر بے قیمت اور بے حیثیت کیسے اس کی جانچ پڑتال ان اصولوں پر کی جانے لگتی ہے جو سماج کے اپنے تراشے ہوئے ہیں... کیسے؟؟؟ بہت دیر تک ماحول سوگوار سا رہا کہانیاں کیسی دلدوز ہوتی ہیں جب بھی ان کا منہ کھلتا ہے وہ کسی ایسی تیزابی لہر کی طرح بہہ نکلتی ہیں کہ سارے وجود میں انگارے سے دہکنے لگتے ہیں اس وقت ہم سب بلقیس کے ماضی اور اس میں پر گذری ہوئی بپتا کو ایک کہانی کی طرح سن کر اپنے آپ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہم بلقیس جیسی عورت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں شاید فی الحال ہمارے پاس اس کا جواب نہیں ہے، بلقیس کے ساتھ ایک خادمہ بھی تھی جس کے ساتھ بلقیس کو واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچنا تھا بلقیس نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہے اس کا نام زرینہ ہے... وہ غریب بلقیس کی کہانی غالباً پہلی بار سن رہی تھی اور سچ مچ بلقیس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ جب بلقیس چپ ہو گئی وہ اس کے بعد بھی روتی رہی خود بلقیس کو اسے چپ کرانا پڑا...

"آج جانے کون سی گھڑی تھی کہ صبح سے اماں کی بہت یاد آ رہی تھی..." بلقیس نے پھر اپنی داستان الم کہنا شروع کی "دل نہیں چاہتا تھا آج آنے کو مگر یہ سوچ کر چلی آئی کہ میری یہ آپا دلشاد جانے میرے رکنے کو کیا معنی دے اور میری طرف سے بدگمان ہو بلا وجہ... ابھی کل ہی زرینہ سے کہہ رہی تھی کہ اب بلقیس کا کام میں دل نہیں لگتا.. ایسے کیسے چلے گا کئی دن سے کوئی بڑی کمائی نہیں ہوئی جو اسی طرح کے پھن رہے تو پھر ہمارے دروازے پر چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو سونگھنے کو کتے بھی نہیں آئیں گے۔ ابھی بلقیس کے پاس بہت وقت ہے مگر طوائف کیسی ہی بانکی سجیلی کیوں نہ ہو اس کے مردہ پڑتے رویوں سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی وہ تو ایک ایسا پھول ہوتی ہے جو تب تک شوقین فن کے گلے کا ہار ہوتا ہے جب تک تر و تازہ رہتا ہے ادھر اس کی خوشبو گئی ادھر وہ گلے سے اتار کر کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیا جاتا ہے۔ اچھا ہے جتنی جلدی بلقیس کی سمجھ میں یہ بات آ جائے، آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے پوچھ رہی تھی۔" بلقیس ایک شادی شدہ عورت اور طوائف میں کیا فرق ہے تو جانتی ہے کیا؟"

میں بولی۔ "آپا! اگر میں خاندانی طوائف ہوتی تو یہ فرق کبھی نہ جان پاتی مگر میں ایک شریف عزت دار گھرانے میں پلی بڑھی ہوں، مجھ سے بہتر اس بات کو

اور کون جان سکتا ہے ایک گھر میں رہنے والی عورتیں ہم سے بہت زیادہ قابلِ احترام اور نصیبوں والی ہیں، انہیں اپنا جسم اپنی مرضی کے بغیر بیچنا نہیں پڑتا بلکہ انہیں تو اپنا جسم بیچنا ہی نہیں پڑتا، اُن کا جسم مندر ہے، انسان کا گھر ہے اور ہم صرف ایک دکان ہیں گوشت کی دکان... یہاں گاہک کو اپنی مرضی کا سامان نہ ملے تو وہ جھٹ دوسری دکان پہ چلا جاتا اور ہمارا اس پہ کوئی زور بھی نہیں چلتا بڑا فرق ہے آپا... ہمارا اور انکا کیا جوڑ ہمیں تو کبھی یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ ہم ان کی برابری کر سکتے ہیں۔"

یوں سمجھیے آپا نے میری اس کھوئی ہوئی متاع کا ذکر چھیڑ دیا تھا جسے میں کھو چکی تھی اور جس کے کھو جانے کا مجھے دنیا میں سب سے زیادہ غم تھا کھو دینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اب اس پر کیچڑ پھینکوں صرف اس لیے کہ وہ اب میرے پاس نہیں رہی تھی یہ تو سراسر کم ظرفی کی بات ہوتی۔

میری تقریر کو آپا جیسے منہ کھولے سنتی رہی پھر بولی۔ "یہ سب بخار جو تو نے نکالا یہ میں نہیں جانتی میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ گھر میں رہنے والی عورت اور طوائف میں بس اتنا فرق ہے کہ گھر میں بیٹھی ہوئی عورت جوانی کی بہار کے خزاں میں بدل جانے کے بعد بھی گھر میں رہ سکتی ہے اس کی ساری عمر کی تپسیا کا اسے یہ صلہ ملتا ہے کہ اسے بڑھاپے میں بھی روٹی ملتی رہتی ہے جب کہ طوائف کو بڑھاپے کے لیے بڑے سامان کرنے پڑتے ہیں نہیں تو سڑکوں پر بھیک مانگنا اس کا مقدر ہے۔ گئے وقتوں میں آنکھوں کا پانی بڑا سچا تھا آس پاس کی اور جان پہچان کی کسبیاں بھی گزرے ہوئے وقت کی طوائف کو ساری عمر کے لیے اپنے ہاں مہمان بنا کے رکھ لیا کرتی تھیں مگر اب زمانہ بڑی بے قدری سے بدلا ہے اب اگر جوانی میں بڑھاپے کا سامان جمع نہ کرو تو بڑی گت بنتی ہے۔"

میں آپا کی بات سمجھ گئی تھی ان کا اشارہ میری اس عدم دلچسپی کی طرف تھا جو میں آئے دن جی اچھا نہ ہونے کا عذر کیا کرتی ہوں، سو میں آ تو گئی مگر جی میرا آج بھی اچھا نہ تھا دھندہ ہوتا بھی تو گاہک شکائتی ہوتا ناراض ہو کر جاتا کہ اوپر والے نے آپ لوگوں کو بھیج دیا۔ اماں کی بڑے زوروں سے یاد آ رہی تھی کس سے ان کا ذکر بلا سبب کرتی، آپ آئے تو سبب بن گیا بس یوں ہی پرانے سب زخموں کے منہ کھل گئے جنھیں بڑی مشکل سے سیا تھا میں نے چلیں کوئی بات نہیں، تھوڑی دیر کو ہی سہی، پرانی بلقیس زندہ تو ہو ہی گئی ورنہ میں تو اب یہ بھی بھولتی جا رہی تھی کہ میں کوئی ٹھیٹھ جات پات کی طوائف نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" سائرس نے ہولے سے اسے یاد دلایا کہ ابھی اس کی دردانگیز کہانی میں بہت کچھ کہہ دینا باقی ہے۔

"بابا جی نے میری سن لی تھی۔ آج تو سوچتی ہوں تو اپنی بدقسمتی پر آہ بھرتی ہوں کہ مجھ کم نصیب اور کم ظرف نے کم مانگا ماں سے ملنے کی آرزو کی تھی جو ایسے پوری ہوئی کہ آسمان ان کی مٹھی میں تھا میری ہی جھولی تنگ تھی میں ہی مانگنے کی طرح مانگ نہ سکی، دنیا دار کبھی بھی اللہ کے بھیدوں کو نہیں پہچان سکتے جانے کوئی ایسا بھی نسخہ ان کے گیان میں تھا کہ وہ جو مجھ پہ گذری اسے ایک خواب کی طرح دنیا اور خود میرے ذہن سے مٹا ڈالتے مگر وہ ہوا نہیں اب اس کا ملال کیا کروں... کروں بھی تو اس سے حاصل کیا ہے؟ جانے کب تک روئی، نہیں معلوم جب ہمت جواب دے گئی اور میں چپ ہو گئی۔ لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی کتنے ہی لوگ ہمدردی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے جانے دنیا میں کوئی میری طرح لٹا نہ تھا یا انھوں نے ایسا دکھ کبھی دیکھا نہ تھا۔ میں اماں اور مدیحہ کو پکڑ کے جلدی سے ایک کونے میں لے گئی اور صرف اتنا کہتی چلی گئی'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اماں اپنی مدیحہ کو فیصل سے بچانا اماں فیصل تو اپنے گھر میں مت گھسنے دینا اسے مدیحہ سے مت ملنے دینا۔"

"تو کچھ بتا تو سہی بیٹا' کیا ہوا ہے؟ تو تھی کہاں اور فیصل کہاں گیا؟ وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں ہے؟ تم دونوں کہاں چلے گئے تھے؟ فیصل نے تیرے ساتھ کیا کیا؟"

"آپا' ہم آپ کے گھر گئے تھے مگر وہاں تالا پڑا تھا... کسی کو نہیں معلوم تھا آپ کہاں ہیں.. آپ کہاں تھیں آپا...؟' مدیحہ نے پوچھا تو میں نے اسے ایسی شدت سے اپنے کلیجے سے بھینچ لیا کے وہ یوں بلک پڑی جیسے جو کچھ مجھ پہ گذری اس کی تکلیف اسے ہوئی تھی.. یہ دیکھ کر اماں سے رہا نہ گیا اور انھوں نے مجھے زور سے مدیحہ سے الگ کیا اور بڑی سختی سے بولیں۔

"تو بتاتی کیوں نہیں بلقیس' کیا ہوا ہے آخر؟ کچھ تو بتا میری بچی' بات کیا ہے؟ نہیں تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا؟"

"اماں! کل پوری رات نہیں سوئیں آپا بار بار کہتی تھیں میری بلقیس کسی مصیبت میں ہے، میں انھیں یقین دلاتی تھی کہ یہ ان کا وہم ہے مگر انھیں کسی پل یقین نہیں آتا تھا ہم صبح سے آپ کے گھر کے چکر کاٹ رہے ہیں آپ کے پڑوسیوں کے ہاں تھے آپ کا انتظار کرتے تھے جب شام ہوگئی تو ہم مایوسی سے جانے لگے تب ہی اماں کو جانے کیا خیال آیا اور ہم یہاں بابا کی طرف چلے آئے اور آپ یہاں...!"

"اماں! مجھ سے ایک وعدہ کرو' تم فیصل کو ہمارے گھر بھی کبھی نہ آنے دوگی اور مدیحہ سے اسے کبھی نہ ملنے دوگی؟ جب اماں نے مجھ سے یہ وعدہ کرلیا تو میں نے اپنی ماں کی بے پناہ پریشان اور دکھی آنکھوں میں دیکھا ماؤں کو کس طرح اور کیسے پتا چل جاتا ہے اپنی بیٹیوں کا دکھ... کاش ماں تم مجھے اس وقت بچانے بھی آسکتیں تو آج میں یوں لٹی پٹی نہ کھڑی ہوتی... میں نے ماں کو بہت سمجھایا کہ وہ مجھ سے میری بپتا نہ پوچھیں مگر دنیا کی کوئی بھی ماں ان حالات میں ملی ہوئی بیٹی سے اس پہ کیا گزری ہے' یہ بات نہ پوچھے یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل آیا ہو ماں کے بہت اصرار پر میں نے جو کچھ میں بتا سکتی تھی' بتا دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں اب یہاں سے جا رہی ہوں کہاں یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں...

میری ماں کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہ بچی ہو... ماں کو چپ دیکھ کر میں اور بھی اپنی نظروں میں گر گئی کہ میں نے یہ سب غلط کیا لہٰذا میں نے کہنا شروع کیا... "ماں! اگر مجھے مدیحہ کا خیال نہ ہوتا تو میں تم سے ملنے کی نہ تمنا کرتی نہ یہاں ٹھہرتی میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤں گی اور پھر تمہیں کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی ماں تم ان باتوں کا ذکر ساری عمر ابا سے نہ کرنا ورنہ وہ پردیس میں بہت پریشان ہوں گے جانے ان کے دل پہ کیا گزرے گی' تم بس مدیحہ کو اس رذیل سے بچا لینا... ماں اب میں چلتی ہوں..." یہ کہہ کر میں چلنے لگی تھی تو ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"کہاں جائے گی؟" انھوں نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں مگر مجھے روکنا مت ماں! میرا جانا ہی ہمارے خاندان کے لیے ٹھیک ہے۔ میں تو برباد ہوگئی اور جو تم سے ملے بغیر چلی گئی ہوتی تو جانے کچھ بھی باقی نہ بچتا ابھی تو صرف میں لٹی ہوں، میں برباد ہوئی ہوں' تم چپ رہ کر ابا کو اور مدیحہ دونوں کو بچا سکتی ہو... میرے پاس اب کیا باقی بچا ہے' میں یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ میں نے دو قتل کیے ہیں۔ میں اگر یہاں رک گئی تو وہ حرام زادہ فیصل نہ صرف ہمیں بلیک میل کرے گا بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ قتل میں نے ہی کیے ہیں وہ ہمیں کبھی چین سے جینے نہ دے گا اور کچھ

پتا نہیں ابھی اس کے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں .. میں یہاں رہی تو بہت مشکل ہو جائے گی میں یہاں نہ رہی تو تم اس پر ہمیشہ دباؤ بڑھاتی رہنا بلکہ پولیس میں رپورٹ کرا دینا کہ اسی کمینے نے مجھے سامان سمیت اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔ ہر زاویے سے دیکھ لو ماں میرا جانا ہی بہتر ہے ورنہ ہم اپنے ساتھ اپنے سارے خاندان کو بھی خطرے میں ڈال دیں گے...

میری ماں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے دل پہ پتھر رکھ لیا مجھے جانے دیا ہم تینوں ماں بیٹیاں ایک بار پھر خوب روئے' یوں ایک ہی خاندان کی تین عورتوں نے اپنے ہونٹوں اور اپنے دل پہ مہر لگا کے چپ کا یہ زہر پی لیا اماں اور مدیحہ نے بہت چاہا تھا کہ وہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئیں مگر میں نے انھیں ایسا کرنے سے بھی روک دیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی انھیں میرے ساتھ دیکھ لے اور یوں یہ بات بن جائے کہ میں آخری بار اپنی ماں بہنوں کے ساتھ ہی دیکھی گئی تھی۔ اپنی بربادی کا غم بہت حد تک کم ہو گیا تھا کہ بابا جی نے میری دعا سن کے مجھے میری ماں بہن دونوں سے ملوا دیا تھا... اور اب میری بہن اس شیطان فیصل کی دستبرد سے محفوظ ہو گئی تھی۔ یہاں کراچی میں' میں جانتی تو میں کسی کو نہیں تھی' جانے کس خیال سے اسٹیشن پہنچ کر یہاں کا ٹکٹ لے لیا اور ٹرین میں سوار ہو گئی..... ایک اکیلی عورت اتنی بری دنیا میں کتنی دیر حفاظت سے رہ سکتی ہے' اس بات کا اندازہ آپ کو ہو تو پتا نہیں مگر مجھے اس بات کا اندازہ صرف تین گھنٹوں میں ہو گیا۔ میں ایک اسٹیشن پر اتر کر کچھ کھانے کو خرید رہی تھی کہ ایک بڑی دلکش آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔

"آپ اکیلی ہیں؟"

(باقی آئندہ)

معتبر کر دے!

بس تجھ سے یہ نہیں کہتی کہ معتبر کر دے
میرے خدا میرے نالوں میں کچھ اثر کر دے

تیرے اشارہ، کُن فیکون پہ ہے یقیں مجھ کو
غمِ حیات کی راتوں میں بھی سحر کر دے

میری دعاؤں کو ہو گر قبولیت کا شرف
تیرا کرم ہو کہ اِس ماں کو سرخرو کر دے

میں سربسجود رہوں کاش صحنِ کعبہ میں
نصیب کوئے مدینہ میرا سفر کر دے

الٰہی وقتِ نزع پہ ہوں مشکلیں آساں
بصد سکون میرا آخری سفر کر دے

عندلیب سلمٰی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگہت عائشہ

اک آرزوئے طفلانہ

گل حمید کا خیال

بڑھتا چلا جاتا ہے دُکھ کم نہیں ہوتا
دل پھر بھی شریکِ صفِ ماتم نہیں ہوتا

ایک خواہشِ بچکانہ کے ہاتھوں زندگی گنوانے والے نادان شخص کا المیہ احوال

ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں لہک لہک کر گیت گا رہی تھیں۔

خوشی خوشی کردو وداع
تمہاری بیٹی راج کرے گی
محلوں کا راجہ ملا

مہندی کی محفل اپنے عروج پر تھی اور میں شادی کے اس گیت کے الفاظ پر غور کر رہی تھی جس میں ایک معصوم لڑکی ہزاروں امنگیں دل میں سجائے حسین مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھی۔ گیت گاتی شوخ لڑکیوں کی نیک خواہشات گیت کے بولوں میں سمائی ہوئی تھیں۔ شہنیلا جو مایوں کی دلہن تھی اور سر سے پیر تک پیلے رنگ میں نہائی ہوئی تھی' گیت کے ان بولوں سے اُس کے معصوم نرم لبوں پر دھیمی مسکان امڈ آتی اور چہرے پر لگے اُبٹن کی پیلاہٹ میں بھی اس کے گال گلابی ہو جاتے تھے۔ میرے دل سے بھی..... ''تمہاری بیٹی راج کرے گی'' پر دُعا ہی نکلی تھی۔

وہ خوب دھوم دھڑکے دار مہندی تھی۔ دلہن والوں کی طرح دلہا والوں کی پارٹی بھی ٹکر کی تھی۔ خوب گیتوں کے مقابلے ہوئے' خوب ڈھولک پر تھاپ پڑی اور پھر بعد میں تو محفل اور زبردست ہوگئی جب ڈانس کے مقابلے شروع ہوئے۔ اس گہما گہمی میں سب ہی خوشی سے بے حال ہو کر ناچے تھے۔ اس مہندی کا مدت تک چرچا رہا تھا۔

شہنیلا میری دوست بیلا کی بڑی بہن تھی اور یہ اُن کے گھر کی پہلی خوشی تھی جو بڑے ارمانوں بھری تھی۔ وہ تین بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی شہنیلا پھر عدیل اور پھر بیلا۔ محبت بھرا مختصر متوسط گھرانہ' بیلا سولہ سال کی تھی اور میرے ساتھ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ عدیل غالباً سترہ کا اور شہنیلا اٹھارہ کی ہوگی۔

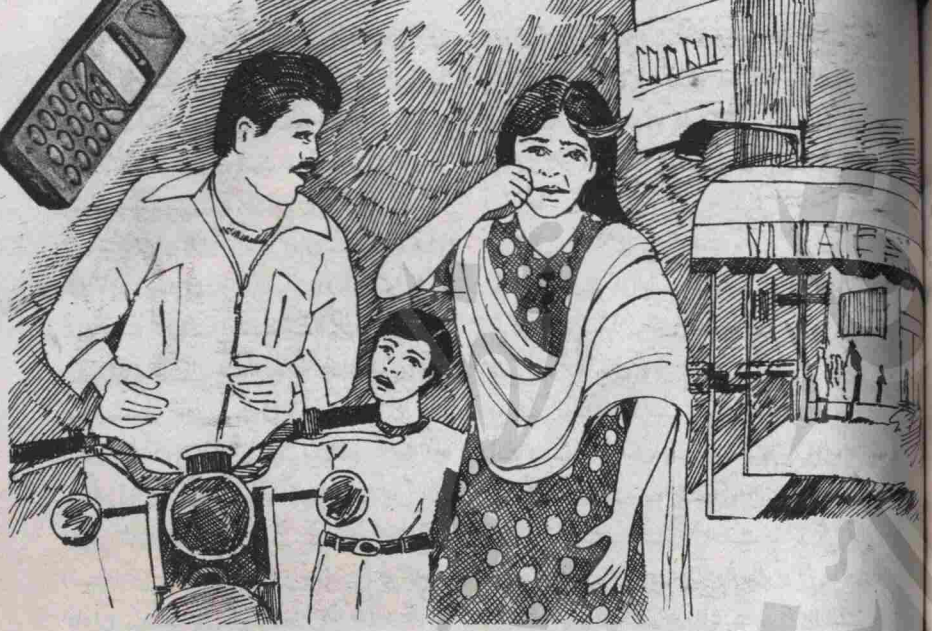

تینوں اوپر تلے کے بہن بھائی تھے۔ والدین بھی بے حد سادہ طبیعت اور نفیس مزاج والے تھے۔

شہنیلا کی امی کو بیٹی کی شادی کے لیے کوئی تردد نہ کرنا پڑا تھا۔ شہنیلا ابھی B.A. فائنل میں ہی تھی کہ کسی جاننے والوں کے توسط سے ایک اچھے مناسب لڑکے کا رشتہ آ گیا اور بات شہنیلا کے امتحان ہونے تک ٹھہرا دی گئی۔ دو ماہ بعد امتحانات ہو گئے تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ سارا گھرانہ بے حد خوش تھا۔ میری دوست بیلا کے پاس سوائے آپی کی باتوں کے' پہلے بھی کوئی موضوع نہ تھا اور اب تو مکمل طور پر مرکزِ گفتگو ہی شہنیلا تھی۔ ہم سہیلیاں بھی روز بڑی دلچسپی سے شادی کی تیاریوں کی داستان سنا کرتیں۔ ہر معاملے میں بے حد اہتمام کیا جا رہا تھا۔ بیلا کو میری پسند پر بہت اعتماد تھا' چنانچہ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی۔ شادی کی تقریبات میں پہننے والے جوڑوں کی ڈیزائننگ اور کلرز کے انتخاب میں اس کی مدد کروں' یوں اپنی دوست کے توسط سے میں بھی اُن کے گھر کی خوشیوں اور شادی کی تیاریوں میں دل سے شریک ہو گئی تھی۔

شادی کی تقریب نہایت خوبصورت اور یادگار تھی جو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹ گئی تھی۔ دلہا ماشاء اللہ' بہت پیارا اور کم عمر تھا' بہ مشکل بائیس سال کا ہوگا۔ شادی کے بعد بھی ہماری دوستوں کا گروپ روز بیلا سے شہنیلا اور اُس کے دلہا کی تعریفیں اور باتیں سنتا جن سے ہمیں یہ اطمینان ہوتا کہ دلہا' دلہن دونوں بے حد خوش ہیں اور آپس میں بے حد محبت اور چاؤ سے رہ رہے ہیں۔ بیلا اپنے بہنوئی کمال بھائی کے گن گاتی نہ تھکتی تھی۔ کمال بھائی بہت خوش مزاج ہیں' شہنیلا سے بہت محبت کرتے ہیں' بہت شوق سے سیر و تفریح بھی کراتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

بیلا کے بہنوئی کمال احمد کے والدین نہیں تھے۔ وہ اپنے شادی شدہ بڑے بھائی کے ساتھ ہی قیام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پذیر تھا۔ بڑے بھائی کی بھی مختصر فیملی تھی۔ میاں بیوی اور دو پیارے پیارے بچے۔ شہنیلا اپنی تقدیر پہ نازاں تھی کہ نہ صرف شوہر چاہنے والا ملا بلکہ اُس کے جیٹھ جیٹھانی بھی اُس کا بے حد خیال رکھنے والے تھے اور بچے تو اُس سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے تھے' یوں یہ چاہتوں بھرا گھرانہ خوشیوں کے سنگ زندگی کی شاہراہ پر رواں دواں تھا۔ اسی دوران میں شہنیلا ہر دوسرے' تیسرے روز اپنے میکے کا چکر لگا لیتی تھی۔

دن پر لگا کر اڑ گئے اور پھر شہنیلا اور کمال ایک چاند سے بیٹے شاہ رُخ کے ممی پپا بن گئے۔ شہنیلا کے میکے والے بھی بہت نہال تھے۔ ایک ننھا کھلونا اُن کے گھر کی بھی رونق بن گیا تھا جس کی اپنے گھر آمد کا وہ بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔ دوسری طرف اب بیلا بھی ہر وقت ہم سہیلیوں کو شاہ رُخ کی معصوم اداؤں کے قصے سناتی تھی۔ شاہ رُخ تو گویا گھر بھر کی جان تھا۔ چھوٹی سی سلطنت میں اُس کی حیثیت ایک ولی عہد شہزادے کی سی تھی۔

یہ سچ بیانی اُن دنوں کی ہے جب پاکستان میں موبائل فون نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ بہت زیادہ مہنگا ہونے کے باعث آج کی طرح اسے afford کرنا ممکن نہیں تھا۔ شومئی قسمت کہ بیلا کے بہنوئی کمال احمد کو موبائل رکھنے کا شوق ہوا اور اس قدر عروج پر پہنچا کہ اُس نے ایک دوست سے کچھ ادھار لے کر اور کمیٹی ڈال کر جیسے تیسے رقم کا بندوبست کیا اور ایک موبائل فون خرید کر ہی دم لیا' بس یوں سمجھیں کہ شاہ رُخ اور شہنیلا کے بعد کمال احمد کی جان وہ موبائل ہی تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ موبائل تو اس کے پاس آ چکا تھا مگر اس کی اتنی نمائش نہ ہو پائی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب موبائل ہر ایک کے ہاتھ میں نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ایک status سمبل خیال کیا جا رہا تھا۔ موبائل فون جس کے ہاتھ میں ہوتا تھا' وہ خود کو اوروں سے ذرا الگ اور برتر محسوس کرتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ کمال احمد کو ابھی موبائل کا مالک بنے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا یعنی اُن کے عزیزوں میں سے ایک شادی کی تقریب کا بلاوا آ گیا تھا۔

اُس روز شہنیلا کی طبیعت کچھ مضمحل سی تھی' چنانچہ وہ تقریب میں جانے سے گریزاں تھی مگر کمال احمد کا کہنا تھا کہ شادی میں ضرور جائیں گے۔ یہی تو موقع ہے موبائل کی شو مارنے کا' سو شہنیلا کو اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ اُس روز وہ رات نو بجے شادی میں جانے کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ کمال نے اپنا شادی والا سوٹ پہنا تھا اور اس نے ہنستے ہوئے شہنیلا سے یہ کہا بھی تھا کہ..... ''تھری پیس سوٹ پہنا ہو اور پھر موبائل ہاتھ میں ہو تو شان ہی الگ ہو جاتی ہے۔'' شہنیلا اپنے میاں کے اُس بچکانہ پن پر ہنس پڑی تھی۔ اتفاق سے اُسی روز شہنیلا کی جیٹھانی کے میکے میں بھی کوئی تقریب تھی' چنانچہ وہ لوگ ان لوگوں کے نکلنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے اور اب یہ لوگ گھر بند کر کے باہر نکلے تھے کہ یکا یک کمال احمد نے کہا تھا۔

''شہنیلا' تم نے موبائل اور گھر کے مین گیٹ کی چابیاں اپنے بیگ میں رکھ لی ہیں نا؟''

''نہیں' میں سمجھی تھی' آپ نے ٹیبل سے چابیاں اور موبائل اٹھا لیا ہو گا۔'' شہنیلا کا جواب سن کر تو کمال احمد بجھ سا گیا تھا۔

''چابی کی تو خیر ہے' بھائی بھابھی ہم سے پہلے آ جائیں گے تو گیٹ کا لاک کھول ہی لیں گے مگر موبائل..... وہ تو میں ضرور لے کر جاؤں گا۔''

شہنیلا جیسے کچھ الجھ سی گئی تھی۔ ''اب رہ گیا ہے تو چھوڑ دیں' ایسا بھی کیا کہ.....''

''نہیں بھئی' میں اتنا بن ٹھن کر جا رہا ہوں'

موبائل ساتھ نہ ہو تو مزا نہیں آئے گا۔ تم میرا یہ کوٹ پکڑو' میں ابھی دیوار سے کود کر اندر جاتا ہوں۔''

شہنیلا اپنے میاں کو روکتی رہ گئی تھی مگر وہ تو بڑی پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا تھا۔ کمال احمد شادی سے پہلے کئی بار ایسا اُس وقت کر چکا تھا جب اُس کے گھر والے کہیں گئے ہوئے ہوتے اور اس کی آمد ہو جاتی۔ گیٹ کی چابی اُس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ یونہی دیوار پر چڑھ کر اندر سیڑھیوں پر جانے والے پائپ پر پاؤں رکھتا اور ایک زقند میں سیڑھیوں پر کود جاتا۔ اُس روز بھی وہ بڑے جوش میں بلا کسی تامل کے اندر کود گیا تھا۔

شہنیلا اور شاہ رخ گھر کے باہر کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے مگر یہ انتظار تو طول پکڑ گیا تھا اور جب کافی دیر ہو گئی تھی تو شہنیلا اور شاہ رخ نے اسے باہر سے آوازیں دینا شروع کی تھیں مگر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ شہنیلا بدحواس سی ہو گئی تھی' اُس نے فوراً ہی محلے کے ایک لڑکے کو دیوار پر چڑھ کر اندر جانے کو کہا تھا جب لڑکا دیوار پر چڑھا تھا تو اُسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا تھا۔ یہ بات سن کر تو شہنیلا شدید پریشان ہو گئی تھی اور اُس کو چکر آنے لگے تھے۔ اتنی دیر میں محلے کے چند اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے اور پھر کسی نہ کسی طرح گیٹ کا تالہ توڑ کر اندر جا کے دیکھا گیا تھا تو کمال احمد سیڑھیوں پر ساکت پڑا تھا اور اندر کودنے کے لیے جس پائپ پر وہ ہمیشہ پیر رکھتا تھا' وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی' سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔

کمال احمد کو اُس بے ہوشی والی کیفیت میں جلدی سے ہسپتال لے جایا گیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایک ایمبولینس کمال احمد کی ڈیڈ باڈی لے کر آ گئی تھی۔ شہنیلا کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ کمال احمد کے بھائی اور بھابھی اور گھر والے بھی پہنچ چکے تھے۔ شہنیلا کے میکے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ گھر میں ایک کہرام برپا تھا۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ جب کمال احمد نے دیوار کے دوسری طرف اترتے ہوئے ہمیشہ کی طرح پائپ پر پاؤں رکھے تھے تو اچانک ہی پائپ ٹوٹ گیا تھا اور کمال احمد سیڑھیوں پر سر کے بل اس طرح گرا تھا کہ اس کے سر اور دماغ میں شدید اندرونی چوٹ آئی تھی جس کے باعث وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا تھا۔ شہنیلا کی تو دنیا اجڑ گئی تھی' اُس کا چاہنے والا' دلداری کرنے والا شوہر یوں اپنی جان لمحوں میں کھو کے اُس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ شاہ رُخ کے معصوم چہرے پر یتیمی کے دُکھ نے اپنا گھر کر لیا تھا۔ وہ اپنے پاپا کی جان تھا اور وہ اُس کی جان تھے لیکن اب وہ اُس سے یکلخت بچھڑ گئے تھے۔

شہنیلا دو سالہ شاہ رُخ کو لے کر دوبارہ میکے کی دہلیز پر واپس آ گئی تھی۔ بہاروں نے اسے اپنی ایک جھلک دکھا کر منہ جو موڑ لیا تھا۔ شہنیلا اور کمال احمد نے شاہ رخ سے متعلق مل کر جو خواب بُنے تھے' وہ سب تار تار ہو گئے تھے۔

کمال احمد کی موت کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شہنیلا کے والدین نے اُس کی شادی دور کے ایک کزن ندیم سے کر دی تھی جس کی شرط یہ تھی کہ شاہ رخ اپنے نانا نانی کے پاس ہی رہے گا اور پھر کچھ عرصے بعد شہنیلا اپنے دوسرے شوہر ندیم کے ہمراہ دبئی چلی گئی تھی۔ شاہ رُخ نے دو سال کی ننھی سی عمر میں باپ کا صدمہ اٹھایا تھا اور پھر تقریباً ساڑھے تین سال کی عمر میں اُسے ماں سے بھی جیتے جی جدا ہونا پڑا تھا۔ قدرت کے بھید قدرت ہی جانے! لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ بیوی اور بیٹے سے بے تحاشہ محبت کرنے والا کمال احمد اُن سے بچھڑا بھی تو بس اک آرزوئے طفلانہ..... موبائل کی چاہ میں!!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عظمیٰ اختر

ساحرہ تھی وہ

حزیں صدیقی کا خیال

عجب خوب آگہی کے مرحلے ہیں
ہم اپنے سامنے حیراں کھڑے ہیں

بدروح کے عشق میں پاگل ہونے والے ایک نوجوان کا قصہء حیرت

رات گئے جب میں لائبریری سے فارغ ہوا تو آج پھر اس گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے میری نظر اس حسین لڑکی پر پڑی۔ رات کی تاریکی میں دور سے آتی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کا بت بنا وجود مجھے اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اس خوب صورت لڑکی پر گزشتہ تین دنوں کی طرح ایک نظر ڈال کر اپنی راہ لی۔ میں گزشتہ تین برس سے اس لائبریری میں بطور لائبریرین اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میری ڈیوٹی صبح نو بجے سے رات نو بجے تک تھی۔ رات گئے گھر لوٹ کر تھکن سے چور حالت میں ماسوائے کھانا کھانے اور سو جانے کے کوئی تیسرا خیال میرے ذہن میں جگہ نہ پاتا تھا لیکن نہ جانے کیوں پچھلے تین دنوں سے رات کو لیٹتے وقت میرے ذہن میں وہی تنہا کھڑی حسین لڑکی کا خیال کود پڑتا اور میں نیند کی وادیوں میں گم ہونے سے پہلے اسی کے خیال میں گم رہتا۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں کئی سوال ابھرتے کہ تن تنہا اس اندھیرے اور سناٹے میں ایک لڑکی کا یوں کھڑا ہونا کیا معنی رکھتا ہے جبکہ وہ جگہ کوئی بس اسٹاپ بھی نہیں اور کسی تنہا لڑکی کے کھڑے ہونے کے لیے مناسب بھی نہیں کیونکہ ذرا فاصلے پر پان کا کیبن تھا جو ویران جگہ پر واحد دکان تھی جہاں اکثر اس وقت چار پانچ آدمی موجود ہوتے لیکن وہ لڑکی وہاں کھڑی ہوتی تھی۔ کس وقت آتی ہے اور جاتی کس وقت ہے اور آخر اس طرح کھڑے ہونے کے کیا معنی ہیں' یہ سوالات ذہن میں گردش کرتے رہتے۔ ہاں' ایک بات ضرور تھی کہ جب بھی میں لائبریری کے مین گیٹ سے باہر نکلتا' وہ میری ہی جانب دیکھ رہی ہوتی۔ میں اس کی نظروں کی تپش محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے میرے بس اسٹاپ تک پہنچنے تک اس کی

نظریں میرا تعاقب کرتی ہیں لیکن میں نے آج تک کبھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ایک نظر سے دوسری نظر ڈالی تھی۔ میں پہلے دن تو اس مغالطے میں تھا کہ شاید کسی کا انتظار کر رہی ہے اور اس کا ساتھی پان کے کیبن تک گیا ہوگا اور وہ وہاں موجود رش کی وجہ سے کیبن تک نہیں گئی ہوگی لیکن دوسرے دن پھر اسی طرح اسے وہاں کھڑے دیکھ کر میں تھوڑا ٹھٹکا لیکن دوسری نظر بہرحال نہ ڈالی حالانکہ دل میں تو تھا کہ اس حسین لڑکی کو بغور دیکھوں بلکہ جس طرح راہ چلتے نوجوان' بوڑھے لڑکیوں کا نظروں ہی نظروں میں پوسٹ مارٹم کر لیتے ہیں' میں بھی ایسا ہی کروں لیکن فطری جھجک اور خاندانی شرافت جیسی زنجیروں نے اس ارادے کو تادیر قائم رہنے نہ دیا اور میں تین دن تک اس مقام پر اس لڑکی کو کھڑا دیکھ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے اس کا خیال مسلسل مجھے پریشان کیے رکھتا۔ ایک ایک کر کے میں نے اس پر اب تک چار بار نظریں ڈالی تھیں اور ان نظروں کے طفیل میں نے جو جانچا تھا' وہ بس یہی تھا کہ وہ یقیناً ایک خوبصورت لڑکی ہوگی۔ سفید لباس زیب تن ہے' اندھیرے میں اس کا چمکتا وجود' کالی کالی بڑی آنکھیں جو میری جانب دیکھ رہی ہوتی ہیں' ان آنکھوں میں کچھ ایسا سحر ہے جو آدمی کے پاؤں جکڑ لے۔ مجھے اب جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ کم از کم میں چند لمحے رک کر اس کے کھڑے ہونے کی وجہ جان سکتا۔ آخر میرا اس کا سامنا مسلسل تین روز سے ہو رہا تھا۔ مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بظاہر نظر انداز کر دیا۔ ہو سکتا ہے' میرے پوچھنے پر وہ کچھ بتا دیتی اور ہو سکتا ہے' مجھے خفت اٹھانا پڑتی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کل ضرور اس معاملے میں پیش رفت کروں گا اور پھر نہ جانے کب نیند نے مجھے آ دبوچا۔

ہماری لائبریری جس علاقے میں قائم تھی' وہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آبادی زیادہ نہ تھی بلکہ کچھ کچھ ویران سا علاقہ تھا لیکن نسبتاً پرسکون علاقہ بھی تھا۔ کتابوں سے شغف رکھنے والے لوگوں کے لیے بہترین مقام مطالعہ تھا۔ ہماری لائبریری کا اسٹاف تین افراد پر مشتمل تھا کیونکہ یہ زیادہ بڑی لائبریری نہ تھی۔ بلدیہ کی طرف سے میرا تقرر ہوئے بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا۔ میرے علاوہ ایک اسسٹنٹ کے فرائض انجام دینے والے بابا جی بھی تھے جنہیں ہم بابا کرامت کہا کرتے تھے جو ہم سب میں سینئر تھے۔ شوکت دین تھا جو مجھ سے کچھ تھوڑا سا سینئر ہوگا مگر وہ دونوں میرے ماتحت کے طور پر کام کر رہے تھے۔ روزانہ تقریباً آٹھ دس افراد لائبریری آجاتے تھے جن میں کچھ تو باقاعدگی سے آنے والے حضرات تھے۔ ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر صاحب تھے جو علم وادب سے دلچسپی کی خاطر روزانہ ہی تقریباً گیارہ بجے آجاتے تھے اور شام تک واپسی ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ طالب علموں کے دو ایک جوڑے بھی آتے تھے۔ باقاعدگی سے آنے والے ان افراد سے ہمارا رابطہ ایسا ہی تھا جیسے یہ اسٹاف ممبر ہوں۔

اگلی صبح جب میں لائبریری پہنچا تو ذہن میں یہی بات تھی کہ آج اگر وہ لڑکی وہاں نظر آئی تو ضرور رک کر پوچھوں گا۔ ذہن میں اس خیال نے اتنی جڑ پکڑلی کہ سارا دن مجھ سے کوئی کام ٹھیک سے نہ ہوسکا۔ معلوم نہیں، میرے ذہن سے اس لڑکی کا خیال اس بری طرح سے کیوں چپک گیا تھا کہ بار بار اس کی شبیہ ذہن میں ابھر رہی تھی۔ رجسٹر کھولا تو لگا، سارے صفحے پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جلدی جلدی سارے صفحے پلٹ ڈالے، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں البم دیکھ رہا ہوں اور ہر صفحے پر اسی حسین لڑکی کی مسکراتی تصویر بنی ہوئی ہے۔ میرا ذہن چکرانے لگا۔ رجسٹر بند کرکے میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟''

بابا کرامت سے پانی طلب کیا تو وہ شاید مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پانی لائے۔ شیشے کے گلاس میں شفاف پانی میری میز پر رکھ کر وہ مڑے تو میں نے چیخ کر بابا کو بلایا۔ دراصل اس پانی میں مجھے وہی چہرہ نظر آرہا تھا۔ بابا گھبرا گئے۔

''جی صاحب، کیا ہوا، پانی خراب ہے کیا؟ لائیے، دوسرا پانی لادوں۔''

وہ سمجھے کہ شاید پانی میں کچرا دیکھ کر میں چلا پڑا ہوں۔ وہ جلدی سے دوسرا گلاس لینے چلے گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ لڑکی میرے حواسوں پر کیوں چھائی جارہی ہے؟ میں کوئی سترہ، اٹھارہ سال کا نوجوان بھی نہ تھا کہ ایسا ہوتا بلکہ میں تو ایک شادی شدہ تیس، اکتیس سال کا مرد تھا اور میری شادی ہوئے بھی تین سال گزر چکے تھے۔ مجھے تو کبھی اس قسم کے حالات کا موقع ہی نہ ملا کہ کسی لڑکی وغیرہ کی طرف اس نظر سے دیکھتا یا سوچتا لیکن یہ سب کیا تھا، میری سمجھ سے بالا تھا۔

سارا دن میرا ذہن ماؤف رہا، کسی کام پر توجہ نہ دے سکا، بس دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے واپسی کا وقت ہوجائے۔ میری کیفیت بالکل ایسی ہورہی تھی جیسے میں نے اس لڑکی کو وقت دے رکھا ہے اور وہ میرے ہی انتظار میں کھڑی ہے۔ معلوم نہیں، میری یہ بے چینی کیسی تھی جو مجھے ہر چیز سے غافل کررہی تھی۔ میں اپنے اردگرد سے لاتعلق سا ہوگیا تھا۔ جونہی کلاک نے نو بجے کا الارم دیا، میں فوراً جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا جبکہ ابھی ایک دو افراد لائبریری میں موجود تھے اور میری ذمے داری تھی کہ جب سب لوگ جاچکیں تو اپنی نگرانی میں لائبریری بند کراؤں لیکن آج مجھے بہت جلدی تھی۔ میں نے کرامت بابا سے جو میری آج کی حالت پر حیران و پریشان تھے، کہہ دیا۔

''بابا، آپ سب دیکھ بھال کر جائیے گا، مجھے ذرا جلدی ہے۔'' وہ بس سر ہلا کر رہ گئے اور میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ ہوسکتا ہے، پیچھے بابا مزید پریشان ہوئے ہوں اور میری جلد بازی پر متفکر بھی لیکن مجھے کوئی پروا نہ تھی، مجھے تو بس ایک انجانی سی کشش کھینچ رہی تھی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کھنچا چلا جارہا تھا۔

رات کے دھندلکے چھا چکے تھے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں وہ لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی احساس نہ تھا کہ میرے آگے پیچھے کون چل رہا ہے، بس اپنی دھن میں میرے قدم بڑھ رہے تھے۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میرے اردگرد ایک دھواں سا ہے، گہرا غبار چھایا ہوا ہے اور میں تن تنہا بڑھا چلا جارہا ہوں۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جونہی میں اس گلی میں داخل ہوا، مجھے لگا، میں کسی اور ہی دنیا میں داخل ہوگیا ہوں۔ اس مسکراتے چہرے نے مجھے یوں خوش آمدید کہا جیسے میں ملکہ کی محل سرا میں داخل ہوا ہوں۔

''میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کررہی تھی۔''

یوں لگا جیسے میرے اردگرد گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔ مترنم سا لہجہ جس کے سحر میں، میں گم ہوگیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا سوائے اس کے کہ وہ حسین دوشیزہ میری منتظر تھی۔

''لیکن..... میں..... تمہیں..... نہیں جانتا۔''

''میرا نام ساحرہ ہے۔''

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ سمجھ گئی اور واقعی وہ ساحرہ تھی، اپنے سحر میں جکڑ لینے والی۔

''میں بہت عرصے سے تمہاری منتظر ہوں اور تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ آج تمہارے آنے سے گویا میری عید ہوگئی۔''

یوں لگ رہا تھا جیسے ساری فضا گنگنا رہی ہو، جھوم رہی ہو۔

''لیکن یہ بتاؤ، تم یہاں.....''

''دیکھو، کوئی سوال مت کرنا ورنہ میں واپس چلی جاؤں گی اور تمہیں کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ اگر جواب چاہتے ہو تو سوال مت کرو، جواب مل ہی جائے گا۔ اگر میں جواب دے دوں گی تو آج ہم آخری بار ہی ملیں گے۔''

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے یہ فیصلہ سنا دیا۔ مجھے تو اس کے چلے جانے کے نام سے ہی بے چینی ہونے لگی اور میں نے پھر کوئی سوال نہ کیا اور نہ مجھے کوئی جواب ملا۔ کچھ دیر بعد مجھے اس نے جانے کا فیصلہ سنا دیا اور میں لوٹ آیا اسی بے رنگ دنیا میں جہاں آنے کو میرا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس ساحرہ کا کہنا تھا کہ وہ روزانہ اسی مقام پر اسی وقت ملا کرے گی مگر کچھ دیر کے لیے، زیادہ دیر نہیں اور یہ بھی کہ میرا وہاں پہنچنا لازمی ہے۔ میں نے اس کی ہر بات بلاچون چرا کیے ایسے مان لی جیسے کوئی طالب علم اپنے نہایت محترم استاد کی بات ٹالنے کا حوصلہ نہیں کرسکتا۔ میرے اسٹاپ تک جانے کے دوران یقیناً وہ مجھے گھورتی رہی تھی۔ مجھے اس نے منع کردیا تھا کہ پیچھے نہیں دیکھنا، میں اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بس میں سوار ہوگیا۔ گھر آنے کے بعد بھی میری طبیعت اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ میں نے کسی سے کوئی بات نہ کی، بس چپ چاپ پڑ کر سو گیا اور پھر میرا یہ معمول بن گیا، روز لائبریری سے واپسی پر میں اس سے ملاقات کرتا، دیر سے گھر لوٹتا اور پڑ کر سو جاتا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا، طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہوگیا۔ میں جو ایک خوش اخلاق، مہذب، شائستہ طبیعت کا مالک کہلاتا تھا، میرے اطراف کے لوگوں کے مطابق اب میں ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بد دماغ، بداخلاق شخص ہوتا جارہا تھا۔ میرے گھر والے میرے رویئے کی اس تبدیلی پر حیران تھے تو میرے کولیگ پریشان اور میں سب سے بے خبر اپنی روش پر چل رہا تھا البتہ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اب میری صحت پہلے جیسی نہ رہی تھی بلکہ گر رہی تھی۔ میں کمزور سے کمزور ہوتا جارہا تھا۔ میرا صحت مند توانا جسم سوکھ رہا تھا۔ چہرے کی بشاشت کی جگہ پژمردگی نے لے لی تھی۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنستی جارہی تھیں لیکن اس کے باوجود میں مطمئن، سرشار اور مسرور تھا جیسے کوئی نشئی اپنے نشے کی حالت سے مطمئن رہتا ہے اور اس کا جسم اس کا ساتھ چھوڑتا چلا جاتا ہے، میں بھی اس نشے کا عادی ہو چلا تھا۔

میرے معمولات میں صرف سونا اور اٹھ کر اسی مقام پر چلے جانا شامل ہو چکا تھا۔ کئی ہفتوں سے میں لائبریری جانا بھی ترک کر چکا تھا۔ میرے ہوش و حواس بس اتنا ہی کام کررہے تھے کہ میں گھر کا راستہ نہیں بھولا تھا اور نہ ہی اس جگہ کا جہاں ساحرہ میری منتظر ہوتی تھی۔ باقی کسی بات کا مجھے ہوش نہ تھا، یوں لگتا تھا کہ دنیا میں صرف میں ہوں اور ساحرہ، باقی کوئی نہیں۔ میری اس بدلتی ہوئی طبیعت کے پیش نظر میری بیوی مجھ سے بددل ہوتی جارہی تھی۔ وہ بجھتی جھکتی رہتی اور میں منہ اوندھائے سویا رہتا یا ساحرہ کے خیالوں میں گم رہتا۔ اب ہماری ملاقات کا دورانیہ بڑھتا جارہا تھا۔ میرا دن سوتے گزرتا اور رات جاگتے ہوئے۔ گھر والے میری حالت کی وجہ سے تشویش میں مبتلا تھے۔ میری بیوی لڑ جھگڑ کر میکے جا بیٹھی تھی۔ والدین ضعیف تھے۔ والدہ ہر وقت دُعائیں کرتی رہتیں۔ باقی سب اپنے اپنے دھندوں میں مصروف اور میں اپنی اس انہونی دنیا میں مست ہوا چلا جارہا تھا۔

مجھے نوکری کی پروا نہ رہی تھی۔ مجھے کسی شے میں دلچسپی نہ تھی۔ میری دلچسپی، میری دنیا صرف اسی تک محدود ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں ہر لمحے اسی چہرے کو دیکھنا پسند کرتیں اور کان اسی سریلی آواز کے منتظر رہتے۔ دل ہر دم اسی کا نام پکارتا رہتا۔ میں کون ہوں، کیا ہوں، کیا کروں، یہ سب کچھ میرے ذہن سے محو ہوتا جارہا تھا۔ میری حالت اس مریض کی سی تھی جو صرف آکسیجن ماسک سے زندہ تھا اور میری زندگی کو قائم دائم رکھنے والی آکسیجن ماسک کا نام ساحرہ تھا۔

وہ کہاں سے آتی ہے، کہاں چلی جاتی ہے اور مجھ سے اس کا کیا رشتہ ہے، یہ سب پوچھنے، کہنے کی اس نے پابندی لگا رکھی تھی اور میں اس دھڑکے کے پیش نظر اس سے کچھ دریافت نہ کرتا کہ کہیں وہ روٹھ کر ہمیشہ کے لیے چلی نہ جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ جب تک مجھ سے ملو، میری طرف دیکھو، جانے کے بعد مڑ کر نہ دیکھو اور میں اس کی بات کا ایسے پابند ہو چکا تھا کہ جیسے اگر خلاف ورزی کی تو دھر لیا جاؤں گا۔ نہ جانے میں کب تک اس سحر میں مبتلا رہتا کہ ایک دن میں نے ساحرہ سے ہمیشہ ساتھ رہنے کی بات کی۔ میں چاہتا تھا کہ اب یہ سلسلہ کچھ ایسا ہو کہ میں ہمہ وقت ساحرہ کی قربت میں رہ سکوں۔ آنے جانے کا سلسلہ نہ رہے نہ مجھے لوگوں کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑے۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

وہ کچھ دیر ٹھہر کر گویا ہوئی۔ "ہاں بالکل، ایسا ممکن ہے لیکن....."

"لیکن..... لیکن کیا، میں ہر طرح سے تیار ہوں، جو تم کہو گی، وہی کروں گا۔" اس کے ہاں کہنے پر میں سرشار ہو گیا۔

"مگر اس کے لیے ایک شرط ہے۔" وہ بولی۔

"کیسی شرط؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"پہلے وعدہ کرو۔"

"ہاں، ہاں، میں ہر شرط کے لیے تیار ہوں، ہر شرط پوری کروں گا۔" میں نے جھٹ اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

"تو سنو، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا ایک ایسی جگہ جہاں میں تمہیں لے جاؤں گی اور پھر ہم کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ تمہیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہو گا۔ کیا چل سکو گے؟"

اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔ میں کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا تو وہ پھر گویا ہوئی۔

"میں تم سے کوئی زبردستی نہیں کروں گی، تمہاری اپنی مرضی ہے، اگر چاہتے ہو تو کل جواب دے دینا۔"

میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو موقوف ہو چکی تھی، بھلا میں کیا سوچ بچار کرتا لیکن پھر بھی اس لمحے مجھے کچھ سوچنا تھا۔ ان عارضی پناہوں سے دائمی پناہ گاہ کی طرف جانا تھا۔ اس رات میں جلد آ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں لیٹا اپنے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن مجھے لگا کہ جیسے ساحرہ میرے اردگرد ہی ہے اور میری اس کیفیت پر فاخرانہ مسکرا رہی ہے جیسے کہہ رہی ہو، بس سوچ میں پڑ گئے، کیا میرے بغیر رہ سکو گے؟

اور پھر مجھے نیند نے آلیا۔ صبح میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آج ساحرہ کے ساتھ چلا جاؤں گا اور شاید مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔ قوت فیصلہ بھی تو اسی کے تسلط میں تھی۔ میں آخری بار صرف والدین سے ملنا چاہ رہا تھا کہ انہیں کچھ بتاؤں گا نہیں، صرف مل لوں گا۔ ویسے بھی وہ سب مجھے نیم پاگل تصور کر چکے تھے۔ میں والدہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس وقت مصلے پر بیٹھی تھیں۔ آج کئی ہفتوں بعد میں نے اپنے کمرے کے علاوہ گھر کے دوسرے کمرے یا حصے میں قدم رکھا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا، میں نے ادھر ادھر جھانکا، کچھ غور کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بو میرے اپنے ہی وجود سے آرہی ہے۔ اطراف کی فضا تو خوش گوار تھی۔ والدہ نے سلام پھیر کر میری طرف دیکھا تو مجھے اُن کی آنکھوں میں چمکتے آنسو صاف دکھائی دیئے۔ میں کسی بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا لہٰذا جلدی جلدی انہیں خدا حافظ کہہ کر جانے کے لیے پلٹا لیکن ان کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔

"سنو بیٹا، ذرا ادھر آؤ۔" انہوں نے مجھ پر دَم کیا اور ایک گلاس پانی پینے کو کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے التجا کی۔ "بیٹا! میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پی لو۔"

میں نے سوچا، جب آخری بار ملنے آ ہی گیا ہوں تو چلو، چائے بھی پی لوں۔ اگرچہ بے دلی طاری تھی پھر بھی بیٹھ گیا۔ وہ ایک کپ چائے کا مجھے پکڑا کر خود بھی چائے پینے لگیں۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ مجھے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا جیسے میں نے چائے نہیں، زہر پی لیا ہو۔ مجھے اندر تک ایک تلخ سیال مادہ اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے قدم بھاری ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی سے خدا حافظ کہا اور باہر آ گیا۔ سر بہت وزنی محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بھاری بوجھ رکھ دیا ہو۔ مجھ میں چلنے کی سکت نہیں تھی لیکن ساحرہ کی سرگوشی مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھی۔

"میں تمہاری منتظر ہوں، میں تمہاری منتظر ہوں۔"

بس اسی آواز کے سہارے میں نے تھوڑی بہت ہمت کی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابھی جانے میں کچھ وقت تھا، سوچا طبیعت بحال کرلوں تاکہ وہاں تک صحیح حالت میں پہنچ جاؤں۔ یہ وقت میں نے کیسے گزارا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میری حالت ایسی تھی کہ جیسے جسم کے دو حصے کیے جارہے ہوں۔ بہرحال بڑی دقت کے بعد وہ وقت آ پہنچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب مجھے ساحرہ سے ملنے جانا تھا۔ میں ساحرہ کی آواز کے تعاقب میں وہاں تک پہنچ گیا۔ وہ کتنی خوش ہوئی تھی' آج اس کی خوشی دیدنی تھی جیسے اس کی خواہش غیر متوقع طور پر پوری ہوگئی ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

پھر میں اس کی تقلید میں چلتا ہوا ایک ویرانے میں پہنچ گیا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ تو مجھے قبر.....''

''شش.....'' اس نے میری بات مکمل نہ ہونے دی۔ ''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا' سوال مت کیا کرو۔ ہم یہاں ایک بزرگ سے ملنے آئے ہیں۔ میں دراصل ان ہی کے پاس رہتی ہوں لہٰذا میں ان سے تمہیں ملانے لائی ہوں۔ تم بس چپ چاپ اس چبوترے پر بیٹھ جاؤ۔''

اس نے ایک چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جونہی اس کے کہنے کے مطابق اپنے قدم چبوترے کی طرف بڑھائے' میرے قدم ڈگمگانے لگے' سر بھاری ہونے لگا۔ مجھے کوئی انجانی قوت پیچھے دھکیل رہی تھی اور میں باوجود کوشش کے اس قوت کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ میں اس کشمکش کا مقابلہ نہ کر سکا اور چبوترے پر بیٹھنے سے قبل ہی زمین پر گر گیا۔ میرے حواس گم ہوگئے اور میں بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنی والدہ کے بستر پر لیٹا تھا۔ میرے سرہانے میری والدہ' بیوی' والد صاحب اور دیگر گھر والے کھڑے تھے۔ میرے ہوش میں آنے پر اُن سب نے شکر ادا کیا۔ میری ماں نے میرا ماتھا چوما۔ سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان دکھائی دے رہا تھا۔ میں حیران حیران سا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن کا ہر گوشہ پرسکون اور خالی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی بھنور میں گھوم گھوم کر باہر نکل آیا ہوں یا میں کسی قید سے رہائی پا گیا ہوں۔

جی ہاں' میں دراصل قید ہی میں تھا' ایک ساحرہ کی قید یعنی ایک خبیث روح کی قید میں۔ جتنے عرصے میں اس مصیبت میں گرفتار رہا' ان دنوں کا شمار میرے بس کی بات نہیں البتہ گھر والوں سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً تین چار ہفتے تک میں اس بلا کے شکنجے میں تھا۔ اس دوران میری حالت نیم مردہ تھی' میں کسی نشئی کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا رہتا تھا۔ ایک ہفتے تک سب میری حالت پر تشویش کا اظہار کرتے رہے' میرے معمولات کو ٹٹولتے رہے تو پتہ چلا کہ میں روزانہ لائبریری کے عقب میں واقع قبرستان میں جایا کرتا تھا اور ایک پرانی قبر پر بیٹھ کر گھنٹوں گم رہا کرتا تھا۔ اس لمحے کسی دوسرے میں ہمت نہ تھی کہ وہ قریب آ کر دیکھے کہ میں کیا کرتا ہوں البتہ میرے بھائی کا کہنا تھا کہ میں کسی سے گفتگو کیا کرتا تھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا پھر ایک دن بھائی کو بھی وحشت اور ڈر نے آلیا اور وہ میرا پیچھا کرنے سے باز رہا البتہ والدہ صاحبہ نے ایک عامل بابا سے رجوع کیا اور انہوں نے اپنے علم سے بتایا کہ میں ایک ایسی خبیث روح کے شکنجے میں گرفتار ہوں جو روپ بدل کر پہلے انسانی حواس پر قابو پاتی ہے اور پھر موقع پا کر ایک دن اس کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ یہ روح انسانی خون کی پیاسی تھی جو اچانک حملے کی بجائے رفتہ رفتہ انسانی خون نچوڑ لیتی ہے۔ بابا کے مطابق یہ ایسی روحیں ہوتی ہیں جو اپنی ہلاکت کا سبب بھی خود ہی ہوتی ہیں۔ برزخ میں بھی ان کے لیے جگہ نہیں ہوتی اور یہ آزاد پھرتی رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی شیطانی چیلہ ان کو قبضے میں لے کر اپنے ناپاک ارادے کی

تکمیل کرتا ہے۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن اس مرتبہ اس بدروح کا ارادہ پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی سب کو خبر ہوگئی اور جب اس ساحرہ نے مجھے آخری مرتبہ آنے کو کہا کہ میں اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں تو اسی دن میں نے والدہ کے کمرے میں جا کر پانی پیا اور چائے پی تو اس پانی اور چائے کے ذریعے عامل بابا نے میرے اندر ایسی قوت پیدا کر دی جو اس خبیث روح کا مقابلہ کر سکے۔ عامل بابا نے بتایا کہ میرے اندر سے جو ناگوار بو اٹھ رہی تھی' وہ اسی خبیث روح کی عطا کردہ تھی اور پھر جب اس کا توڑ ہوا تو میں چکرا گیا۔ نیکی و بدی کی جنگ میرے وجود کے اندر لڑی جا رہی تھی اور میں بے خبر تھا۔ دراصل میں میدان جنگ میں تھا اور اس میدان میں نیکی کی فتح ہوئی اور بدی ہار گئی۔ اگر میں اس چبوترے پر جو میری موت کا چبوترہ تھا' بیٹھ جاتا تو شاید آج یہ کہانی آپ تک پہنچ ہی نہ پاتی لیکن میں اس وحشت ناک موت کے منہ سے بفضلِ خدا تعالیٰ بچ نکلا اور خدا نے مجھے اس ساحرہ کی سحر بانی اور سحر انگیزی سے نجات دلائی۔

اب میں خود کو بالکل پرسکون اور مطمئن محسوس کرتا ہوں البتہ نماز کی پابندی کو میں نے اپنا معمول بنا لیا ہے۔ لائبریری جانا پھر سے شروع کر دیا ہے۔ ایک دن میں نے کرامت بابا سے پانی طلب کیا تو بابا نے گلاس دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''صاحب! غور سے دیکھیے' کہیں پانی میں کوئی تصویر تو نہیں نظر آ رہی؟''

میں نے گھبرا کر غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اب تو بھرے مجمعے میں بھی کسی خوب صورت لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہوں اور کسی اکیلی لڑکی کو تو اسٹاپ پر' کسی موڑ پر اکیلے کھڑی دیکھ کر ہی الٹے پاؤں لوٹ جاتا ہوں۔

بہار اور پیار

بے چینی کیوں دل میں بسی ہے؟
اتنی کیوں گھبراہٹ ہے؟
کھلتے پھولوں کا موسم ہے
بہار کی آمد آمد ہے
میری خوشیوں کے موسم پر
گرد کے بادل چھائے ہیں
آنسوؤں کی رم جھم ہی بس
اِس وقت تو کارآمد ہے
اے دل میرے
تو فکر نہیں کر
اور کسی سے ذکر نہیں کر
سب کے سامنے
ہنستے رہنا
چپکے چپکے چھپ کے رونا
اپنی پرانی عادت ہے!

شگفتہ شفیق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ارم زہرا

شک کا بیج

عزیز جبران کا خیال

کس قدر یکسانیت ہے اب ہماری زیست میں
جو بھی سنتا ہے یہ کہتا ہے مری روداد ہے

ایک شکی مزاج مرد کا قصہ، ایجادِ جدید سے جڑی دلسوز شہر کہانی

''تم اب تک جاگ رہی ہو؟'' موبائل پر سنائی دیتی ثناء اللہ کی آواز میں حیرت تھی۔

''ہاں' تمہاری کال کا انتظار جو کر رہی تھی۔'' صغریٰ نے نہایت ہی شوخ لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی شدت سے میری کال کا انتظار کرو گی؟'' ثناء اللہ نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کی تھی جیسے کچھ کھوجنا چاہ رہا ہو۔

''میرا دل تو پہلے ہی تمہارا متمنی تھا' تم نے اپنا موبائل نمبر دے کر تو اسے مکمل گھائل ہی کر دیا۔'' صغریٰ شوخی سے ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''اوہو' بہت ہوئی شوخیاں' مجھے اب زیادہ بناؤ نہیں۔'' ثناء اللہ نے خاصے خشک لہجے میں کہا تھا۔

''میں تو بالکل سچ کہہ رہی ہوں' اب اگر تمہیں میری بات جھوٹ لگتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' صغریٰ نے ثناء اللہ کے لہجے اور بات کا برا منائے بغیر کہا تھا۔

''اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں' تمہیں سو جانا چاہیے تھا' صبح وقت پر آنکھ نہیں کھلی تو اپنی جاب کے لیے لیٹ ہو جاؤ گی۔'' ثناء اللہ کے لہجے میں بھی اس بار محبت رچی ہوئی تھی۔

''میں جب سے تم سے ملی ہوں اور تم سے باتیں شروع ہوئی ہیں' جانے کیوں مجھ سے نیند روٹھ چکی ہے؟ ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوں' پوری رات نیند کی خواہش میں ہی گزر جاتی ہے۔'' صغریٰ نے آہستگی سے کہا تھا۔

''اوہ ہو' کیا بات ہے؟ کہیں تمہیں پیار تو نہیں ہو گیا اور وہ بھی فرصت سے؟'' ثناء اللہ نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

''فرصت سے' کیا مطلب؟''

''ارے فول' یہ ''دل والے'' فلم کا ڈائیلاگ ہے۔'' ثناء اللہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

''اوہ اچھا' اصل میں مجھے فلم سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اس لیے۔''

''تو پھر تمہاری دلچسپی کا سامان کیا ہے؟'' ثناء اللہ نے صغریٰ کی بات کاٹتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

''میری دلچسپی کا سامان تم ہو ناں۔'' صغریٰ بہت پیار سے بولی تھی۔

''اور مجھ سے پہلے کون تھا؟'' ثناء اللہ جیسے اپنی رو میں بولتا چلا گیا تھا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' صغریٰ کی آواز میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔

''وہی جو تم نے سنا۔'' ثناء اللہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''کیا؟'' صغریٰ چیخی تھی۔

''ارے یار' وہی جو تم نے سنا۔ کیا میں یہ بات پھر کہوں؟''

''جی نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' صغریٰ کچھ ناراضی سے بولی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ' تم جو اتنی رات گئے موبائل پر اتنی آزادانہ گفتگو کر رہی ہو' تمہارے گھر والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''ان کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔'' صغریٰ نے خاصے ناراض لہجے میں مختصر سا جواب دیا تھا۔

''اچھا چلو ناراضی چھوڑو' یہ بتاؤ' تمہارے پاس گلابی رنگ کا بھی کوئی سوٹ ہے؟'' ثناء اللہ نے بہت ہی خوشگوار لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہاں' کیوں نہیں ہے مگر تم ادھورے سوال کیوں کر رہے ہو؟ ویسے میں کل تمہارے پاس گلابی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رنگ کا سوٹ ہی پہن کر آنے والی تھی۔'' صغریٰ کے لہجے میں خوش دلی کا تاثر نمایاں تھا۔

''ارے ہاں' مجھے تم سے ایک اور بات پوچھنی تھی؟'' ثناء اللہ کو جیسے اچانک کوئی ضروری بات یاد آ گئی تھی۔ ''وہ..... میں نے اپنا نمبر جس لڑکے کے ہاتھ تم تک پہنچایا تھا' اس نے کوئی ایسی ویسی بات تو تم سے نہیں کی تھی؟'' ثناء اللہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کچھ نہیں کہا تھا' بس اس نے مجھے خاموشی سے نمبر دیا تھا اور چلا گیا تھا۔''

''سچ بتاؤ' اس نے تو تمہیں تنگ کرنے کی کوشش تو نہیں کی ناں؟'' ثناء اللہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا تھا۔

''ارے نہیں بھئی' مجھے اس نے بالکل بھی تنگ نہیں کیا' کیوں' خیریت تو ہے؟''

''سب ٹھیک ہے' بس اگر اس کی طرف سے کوئی کال آئے تو اس سے بات نہیں کرنا' وہ بالکل بھی اچھا لڑکا نہیں ہے۔'' ثناء اللہ نے جیسے صغریٰ کو بہت کچھ سمجھانا چاہا تھا۔

''کمال ہے' جب جانتے تھے' وہ اچھا لڑکا نہیں ہے تو پھر ایسے لڑکے کے ہاتھ اپنا نمبر کیوں بھیجا؟'' صغریٰ نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''بس اُس وقت میرے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔''

''اچھا' اپنا موڈ تو ٹھیک کرو' صغریٰ کو صرف تم پسند آئے ہو اور تمہارے علاوہ صغریٰ کو کسی کی بھی نہ خواہش ہے اور نہ طلب۔''

''سچ کہہ رہی ہے ناں؟'' ثناء اللہ کے لہجے میں ایک بے چینی اور بے یقینی سی تھی۔

''سچ' سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔'' صغریٰ نے زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

•.....•.....•

''واہ' تم تو پوری گلابو لگ رہی ہو۔'' ثناء اللہ نے صغریٰ کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہاری خوشی کے لیے یہ جوڑا پہن کر آئی ہوں ورنہ میں یہ رنگ کم ہی پہنتی ہوں۔'' صغریٰ پر تکلف لہجے میں بولی تھی۔

''تھینکس' بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' ثناء اللہ کے یہ الفاظ صغریٰ کے دل کے تاروں کو ہولے سے چھو گئے تھے۔

''اچھا' یونہی کاؤنٹر پر کھڑی رہو گی یا اندر بھی آؤ گی؟'' ثناء اللہ نے اسے دکان کے اندر آنے کی پیشکش کی تھی۔

''یہ دکان تمہاری اپنی ہے؟'' صغریٰ نے پوری دکان پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی تھی جہاں کمپیوٹر اسپیئر پارٹس کے ساتھ ساتھ موبائل فون کی مرمت کا کام بھی یہاں ہو رہا تھا۔

''آؤ نا' اندر آ کے بیٹھ جاؤ۔'' دکان کے قدرے اندرونی حصے میں وہ کرسی رکھتا ہوا صغریٰ سے مخاطب تھا۔

''ہم کہیں اور چل کر نہیں بیٹھ سکتے؟'' اردگرد کے ماحول سے اکتا کر صغریٰ نے پوچھا تھا۔

''آج نہیں پھر اور کسی دن' آج میرا پارٹنر دوست چھٹی پر ہے' میں دکان نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے صغریٰ نے دزدیدہ نظروں سے ثناء اللہ کو دیکھا تھا۔

''ویسے کیا تم ہمیشہ ہی اتنا تیار ہو کر گھر سے نکلتی ہو؟'' ثناء اللہ نے اچانک ہی یہ سوال کیا تھا۔

''ہاں..... نہیں تو.....'' صغریٰ کا سارا اعتماد ایک پل میں ہی فضا میں دھوئیں کے مرغولے کی مانند تحلیل ہو گیا تھا۔ ''وہ..... بس..... آج کچھ خاص تیاری

ہے۔'' صغریٰ نے دبے دبے' مرے مرے سے لہجے میں کہا تھا۔

''استاد' بھابھی جی کے لیے کولڈ ڈرنک لاؤں یا جوس؟'' ایک قدرے چھوٹے قد کے موٹے سے لڑکے نے اچانک ہی وہاں آ کر یوں کہا تھا کہ وہ دونوں ہی اچھل گئے تھے۔ ''جا' دو کولڈ ڈرنک لے آ اور تو ذرا اپنی زبان کو قابو میں رکھا کر۔'' ثناء اللہ نے اُس لڑکے کو گھورتے ہوئے کہا تھا اور پھر صغریٰ کے چہرے پر نظر ڈالی تھی جو اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ اُس لڑکے کی شرارت تھی' کم بخت' میرے دل کا راز افشا کر گیا جو میں تمہیں نہیں کہہ سکا' وہ کہہ گیا۔''

''اچھا.....'' صغریٰ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ اس وقت ثناء اللہ کی نگاہوں کے رنگ کسی وضاحت کے محتاج نہیں تھے۔ اُس کی نگاہوں میں صغریٰ کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''اچھا' اب میں چلتی ہوں۔'' صغریٰ کولڈ ڈرنک ختم کر کے جانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے' جیسی تیری مرضی۔'' ثناء اللہ نے بھی اُسے رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''اچھا سنو' یہ سم تم رکھ لو' اس سم پر نیا پیکیج آن ہوا ہے' دو روپے میں پورا گھنٹہ بات ہوتی ہے۔'' ثناء اللہ نے سم کا نیا کنکشن صغریٰ کی جانب بڑھایا تھا۔

''شکریہ' اب میں جاؤں گی۔'' ثناء اللہ کے ہاتھ سے سم لے کر صغریٰ تیزی کے ساتھ شاپ سے نکل گئی تھی مگر ثناء اللہ کی نگاہیں دور تک اُس کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔

•.....•.....•

رات ہوتے ہی صغریٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ثناء اللہ کا نمبر ملا لے مگر وہ فطری شرم اور جھجک کے آگے مجبور تھی' ابھی وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی کہ اسکرین پر ثناء اللہ کا جھلملاتا نام دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا' اُس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

''بزی تو نہیں تھیں ناں اس وقت؟'' ثناء اللہ کے لہجے میں کچھ طنز کی آمیزش سی تھی۔

''نہیں' میں تو تمہاری کال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' ثناء اللہ کا لہجہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

''کیوں' کوئی شک ہے کیا؟'' ابھی صغریٰ اپنی حیرانی سمیٹ بھی نہیں پائی تھی کہ ثناء اللہ نے اگلا سوال داغ دیا تھا۔

''گھر اطمینان سے پہنچ گئی تھیں ناں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا رستے میں؟''

''نہیں' مسئلہ کیسا؟ تم شاید یہ بھول گئے کہ مجھے پرائیویٹ آفس میں جاب کرتے' گھر سے آتے جاتے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں تو اب ڈر کیسا؟''

''تین سال سے اُسی راستے پر آ جا رہی ہو' کبھی کوئی اچھا نہیں لگا تمہیں؟''

''یہ اتنی عجیب سی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ مجھے صرف تم ہی اچھے لگے ہو' کوئی اور اچھا لگتا ہوتا تو تم سے ہی کیوں دوستی کرتی؟'' صغریٰ کا منہ جیسے اندر تک کڑوا ہو چکا تھا۔

''لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا ناں' اور پھر آج کل کی لڑکیاں..... توبہ' توبہ' لڑکوں کو گھما کر رکھتی ہیں۔'' ثناء اللہ نے ایک مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

''جی نہیں' میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔'' صغریٰ نے کچھ ناراضی سے کہا تھا۔

''کہتی تو خیر' ساری لڑکیاں یہی ہیں مگر یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتاؤ....." ثناء اللہ نے یہ بتاؤ' پر زور دیتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا بتاؤں؟"

"تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟" ثناء اللہ کا سوال تجسس بھرا تھا۔

"یہ سوال تو بڑا بے معنی سا ہے' پیار کی تو کوئی حد نہیں ہوتی' نہ ہی کوئی سرا کہ یہاں سے تھام لیا تو اختتام یہاں ہو' پیار تو بس پیار ہے' ہو جاتا ہے۔" صغریٰ نے ایک گہری سانس کھینچ کر جیسے اپنے خیالوں کو ثناء اللہ سے آباد کیا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے' پیار ہو جاتا ہے' کیا نہیں جاتا؟"

"ہاں' بالکل۔"

"سو فیصد غلط بات' آج کل کی لڑکیاں پہلے لڑکا دیکھتی ہیں پھر دوستی کرتی ہیں اور اگر لڑکا موٹی آسامی ہو تو اس سے محبت بھی کر لیتی ہیں۔"

"نہیں..... نہیں..... ایسا بالکل نہیں ہے۔" صغریٰ نے ثناء اللہ کو بیچ میں ہی ٹوک دیا تھا۔

"ارے' اب ایسا ہی ہوتا ہے' لڑکا اگر کھاتا پیتا ہے تو لڑکی کو اُس سے محبت ہو جاتی ہے ورنہ وہ کسی اور لڑکے کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔" ثناء اللہ کا لہجہ بہت تلخ ہو چکا تھا۔

"تو پھر اسے محبت کہنا تو محبت کی توہین ہوگی۔ محبت تو قربانی مانگتی ہے نا کہ بینک بیلنس....." صغریٰ بس بولے چلی جا رہی تھی۔

"تم تو ایسا نہیں کرو گی ناں میرے ساتھ؟" ثناء اللہ کے لہجے میں اپنائیت اور خدشہ ایک ساتھ ہلکورے لے رہا تھا۔ "میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں' چاہتا ہوں' مجھے دھوکہ تو نہیں دو گی ناں؟" وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا تھا۔

"ثناء اللہ' میں تم سے حقیقی محبت کرتی ہوں' تمہارے علاوہ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی' میرے دل کے قفل کی کنجی بس تمہارے پاس ہے' تم چاہو تو کھولو ورنہ ہمیشہ کے لیے بند کر دو۔" صغریٰ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

"یہ کتابی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں' میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنے کا بھی خواہش مند ہوں' آگے تمہاری مرضی۔" ثناء اللہ کی آواز صغریٰ کو اپنے دل پر دستک دیتی محسوس ہوئی تھی۔

"پہلے میں امی سے بات کر لوں پھر تم رشتہ بھیجنے کا پروگرام بنا لینا۔" صغریٰ کے لہجے میں محبت اور شرم دونوں کا رنگ نمایاں تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔" ثناء اللہ احسان کر دینے والے لہجے کے ساتھ کال منقطع کر چکا تھا جبکہ صغریٰ کی آنکھیں نت نئے خواب سمانے کے لیے بے چین تھیں۔

•.....•.....•.....•

وہ دونوں اُس وقت ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ویٹر کو دو آئس کریم آرڈر کر دینے کے بعد اب ثناء اللہ' صغریٰ سے مخاطب تھا۔

"صغریٰ' جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر ہی لیا ہے تو پھر رشتہ ہونے میں دیر کیسی؟ میں چاہتا ہوں کہ جلد ہی تمہاری امی سے ملوں۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ صغریٰ کے چہرے کو بہت غور سے تک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں آج ہی امی سے بات کرتی ہوں' جب رات ہماری فون پر بات ہوگی تو میں تمہیں بتا دوں گی۔" اسی دوران صغریٰ کے سیل فون کی بیل بجی تھی' اس نے اسکرین پر نمبر دیکھتے ہی منہ بنایا تھا اور کال کینسل کرتی ہوئی دوبارہ ثناء اللہ کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ "ٹھیک ہے' رات تک تو انتظار

کر ہی لیں گے' ہیں ناں؟" رازدارانہ انداز میں بولتی صغریٰ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ' کس کی کال تھی جو تم نے کاٹ دی؟" ثناء اللہ نے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ارے' کوئی خاص نہیں' بس یونہی۔"

"کوئی تمہیں تنگ کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ' میں ایک کال پر ابھی اس کا نمبر بند کروا سکتا ہوں۔" ثناء اللہ منہ بگاڑتے ہوئے بولا تھا۔

"ارے نہیں بھئی' ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم بے کار غلط سمجھ رہے ہو۔" وہ آہستگی سے کرسی کو ٹیبل کے مزید قریب کرتے ہوئے خود بھی ثناء اللہ کے قریب ہو گئی تھی۔ اسی دوران ویٹر بھی آ گیا تھا۔

"لو' آئس کریم کھاؤ۔" ثناء اللہ' صغریٰ کی جانب آئس کریم کا کپ بڑھاتے ہوئے بولا تھا اور پھر اس ویٹر کو گھورنے لگا تھا جس کی نظریں صغریٰ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"آ' ادھر میری جگہ بیٹھ جا....." ثناء اللہ نے غصے سے ویٹر کو مخاطب کیا تھا تو وہ سٹپٹا کر بھاگ گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے بھئی' کیسا موڈ ہو رہا ہے تمہارا؟" صغریٰ کو ثناء اللہ کی نظریں سلگتی محسوس ہوئی تھیں جیسے وہ آنکھیں نہیں' ایکس رے مشین ہوں۔

"خیر' تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا مجھ سے کوئی چھپانے والی بات تھی جو تم نے میرے سامنے کال ریسیو نہیں کی؟" ثناء اللہ نے یہ سوال کچھ ایسے انداز میں کیا تھا کہ صغریٰ سناٹے میں آ گئی تھی۔

"اوہ خدایا.....! ارے بھئی' میرے آفس سے کال تھی' میں امی کی بیماری کا بہانہ کر کے وہاں سے نکلی ہوں' بات کر لیتی تو ساری پول کھل جاتی....." صغریٰ نے خفگی سے ثناء اللہ کو دیکھا تھا۔

"ایک بات غور سے سن لو' جو لوگ میری باتوں کو اگنور کرتے ہیں' وہ مجھے سخت زہر لگتے ہیں اور میں ان سے دور ہوتا چلا جاتا ہوں۔" ثناء اللہ کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔" یہ کہہ کر صغریٰ نے سر جھکا لیا اور خاموشی سے آئس کریم کھانے لگی۔

"اور ہاں' تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" صغریٰ نے حیرت سے ثناء اللہ کی طرف دیکھا تھا۔

"تم اپنی یہ جاب چھوڑ دو' کہو گی تو میں کہیں اور تمہاری جاب کا بندوبست کروا سکتا ہوں۔ اصل میں تم میری شاپ کے اتنے قریب ہو کہ مجھے یقین ہے' لوگ باتیں بنائیں گے کہ ثناء اللہ اپنی بیوی سے کام کرواتا ہے۔" ثناء اللہ کی یہ بات سن کر تو صغریٰ کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"یہاں سے آپریٹر کی جاب چھوڑ کر میں کہاں اور کیا کروں گی؟" وہ قدرے رکھائی سے بولی تھی۔

"یہ سوچنا میرا کام ہے' تم بس اپنا مائنڈ بناؤ کہ تمہیں جلد ہی یہاں سے جاب چھوڑ دینی ہے۔"

"عجیب سی بات ہے۔" صغریٰ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"اور ہاں' اپنی امی سے بات کر کے مجھے جلدی بتا دینا تاکہ میں اُن کے پاس آ کر تمہارے رشتے کے سلسلے میں بات کر سکوں۔" احسان کر دینے والے انداز میں یہ بات کہہ کر وہ اب والٹ سے پیسے نکال رہا تھا۔

"چلو' اب اٹھو' مجھے شاپ پر ٹائم سے پہنچنا ہے' میں تمہیں رکشہ کروا دیتا ہوں۔ گلی کے کونے پر اترنے کی ضرورت نہیں' بالکل گھر کے سامنے اترنا۔" ثناء اللہ زچ کر دینے والے انداز میں بولتا کھڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو چکا تھا جبکہ صغریٰ نظریں جھکائے کچھ سوچتی اور کھوجتی اُس کے پیچھے چل رہی تھی۔

•.....•.....•

''ارے یار' کتنی دیر سے کال کر رہا ہوں' نمبر ہے کہ مسلسل بزی مل رہا ہے؟'' اُس رات ثناء اللہ کال ریسیو کرتے ہی غصے سے دھاڑا تھا۔

''نمبر بزی مل رہا ہے مگر کیوں؟ میرے پاس تو کوئی کال نہیں آئی ہے؟'' صغریٰ کے لہجے میں غصے اور حیرت کی ملی جلی آمیزش تھی۔

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ آدھے گھنٹے سے تو مسلسل نمبر ہی ملا رہا ہوں' سچ بتاؤ' کس سے اتنی لمبی بات کر رہی تھیں؟'' ثناء اللہ کی آواز میں تناؤ تھا۔

''میں کیوں جھوٹ بولنے لگی' نمبر بزی ہوتا تو بتا ہی دیتی۔ اب جبکہ نمبر بزی نہیں ہے تو کیا جھوٹ بولوں؟'' صغریٰ پہلی بار موبائل پر چیخی تھی۔

''ٹھیک ہے' ہم دونوں ہی جھوٹ بول رہے ہیں' بات ختم اب' مجھے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہے جو ہر بات چھپاتی ہیں جو ہے' وہ ہے تو پھر چھپانے کی کیا ضرورت؟ اگر کسی اور سے بھی تمہاری دوستی ہے تو مجھے بتا دو؟''

''شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' ایسا کچھ بھی نہیں ہے' پیکیج سسٹم کی وجہ سے نیٹ ورک بزی ہو گا اور یقیناً اسی وجہ سے تمہیں میرا نمبر بھی بزی مل رہا ہو گا۔'' وہ غصے سے پھنکاری تھی۔

''ہاں' ہاں' ایک تمہارے ہی نمبر پر یہ پرابلم ہے' میرے سیل پر تمہارا نمبر بزی آ رہا تھا تو آ رہا تھا' اب میں اُس پر یقین کروں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا پھر تمہاری بات پر یقین کروں؟'' ثناء اللہ کا لہجہ شدید غصے کا غماز تھا۔

''جس پر دل چاہے' یقین کر لو' مجھ سے بات کرنی ہے تو سکون اور تحمل سے کرو ورنہ میں موبائل بند کرتی ہوں۔'' صغریٰ نے سخت غصے اور کوفت کے عالم میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر بند ہی کر دو' صاف کیوں نہیں کہتیں کہ اپنے آشنا سے بات کرنی ہے؟''

''اوہ خدایا.....! ثناء.....! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے' مجھ پر بے بنیاد الزام تراشی کر رہے ہو؟'' وہ چیخی تھی۔

''بکواس بند کرواپنی اور جو دل چاہے' کرو' میں بند کرتا ہوں فون.....'' لائن ڈسکنیکٹ ہو چکی تھی مگر صغریٰ کی سسکیاں بند کمرے میں دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھیں۔ اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ جب محبت شدت اختیار کر جاتی ہے تو اُس میں شک جنم لے ہی لیتا ہے' سو صغریٰ نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ یقیناً یہ مجھ سے شدید محبت کی ہی علامت ہے کہ ثناء آج مجھ پر اتنا چیخا ہے' میں صبح اُسے منا لوں گی۔''

•.....•.....•

''کل رات جو کچھ ہوا' میں اسے بھلا دینا چاہتا ہوں' اگر تمہیں واقعی میرے ساتھ اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہے تو مجھے کھلے دل سے سب کچھ بتا دو؟'' ثناء اللہ سلام' دُعا سے بے نیاز صغریٰ کی کال ریسیو کرتے ہی بے ساختہ بولا تھا۔

''کیا سب بتا دوں' میرے بارے میں تو تم سب ہی جانتے ہو؟''

''کاش..... مجھے تم نے اپنے بارے میں سب ہی کچھ بتایا ہوتا۔ خیر' تم نے امی سے بات کی؟'' وہ طنزیہ جملہ اچھالتے ہوئے بولا تھا۔

''ہاں' امی نے کہا ہے کہ وہ تم اور تمہارے گھر والوں سے مل کر فیصلہ کریں گی۔ اب تم جب چاہو' اپنی امی کے ساتھ میرے گھر آ سکتے ہو۔'' صغریٰ اندر سے جلی ہوئی تھی' سو اتنی خوشی کی خبر بھی تپے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھی۔

''دیکھو صغریٰ! میں لڑکا کچھ الگ ٹائپ کا ہوں' لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہوں' میں جو ہوں' تمہارے سامنے ہوں اور ایسے ہی تمہاری فیملی کے سامنے آ جاؤں گا لیکن جہاں تک میرے گھر والوں کی بات ہے تو میرے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔'' ثناء اللہ انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' صغریٰ کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

''میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے' خود محنت کی ہے اور آج جس مقام پر ہوں' میں یہاں خود اپنے بل بوتے پر پہنچا ہوں تو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے میں بھی مجھے کسی کی مدد درکار نہیں۔'' ثناء اللہ کے لہجے میں ایک غرور اور زعم تھا۔

''مگر یہ تو سوچیں' ہم شادی کرنے کا فیصلہ کر رہے ہیں' یہ بات تو تمہارے گھر والوں کے لیے باعثِ خوشی ہونی چاہیے' بھلا اس میں.....''

''بس میں تو ایسا ہی ہوں' تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے یا میری فیملی کے ساتھ؟'' ثناء اللہ نے صغریٰ کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

''یقیناً تمہارے ساتھ ثناء' لیکن ہم اُن سے کٹ کر بھی تو نہیں رہ سکتے ہیں ناں؟'' صغریٰ دل گرفتگی سے بولی تھی۔

''میں تو رشتے کے لیے اکیلے ہی آؤں گا' اگر تمہاری امی راضی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارے لیے تو بہت ہوں گے البتہ میں پوری زندگی اکیلے گزارنے کا فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں.....'' ثناء اللہ نے جیسے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے' تم اکیلے ہی آ جانا' میں امی کو سنبھال لوں گی۔'' صغریٰ نے آہستگی سے کہا تھا' ویسے یہ محبت بھی عجیب شے ہے' جس سے ہو جائے' اس کی خامیاں بھی خوبیاں جیسی لگنے لگتی ہیں۔

''یہ ہوئی ناں بات' میں آنے سے پہلے تمہیں بتا دوں گا۔'' ثناء اللہ نے قدرے رعب دار لہجے میں کہا تھا اور لائن کاٹ دی تھی۔

•.....•.....•

تقریباً پندرہ روز بعد صغریٰ نے ثناء اللہ کو فون پر کہا تھا۔ ''ثناء' تمہاری ایک خواہش تو پوری ہو گئی' نئی جگہ جاب کے لیے جہاں میں نے اپنی C.V. بھیجی تھی' وہاں سے کال آ گئی ہے۔ انشاء اللہ' میں پہلی تاریخ کو جوائن کر لوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے اور امی سے دوبارہ بات ہو گئی تمہاری؟'' ثناء اللہ نے اسے کریدا تھا۔

''امی نہیں مان رہی ہیں مگر تم بے فکر رہو' میں صبح سے بھوک ہڑتال پر ہوں' یقیناً وہ میری بات بالآخر مان جائیں گی۔'' صغریٰ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''تو اب تمہیں دیکھنے کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑے گی' پہلے تو جب دل چاہتا تھا' دیدار ہو جاتا تھا مگر اب.....'' ثناء اللہ قدرے اداس لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''ارے' یہ تمہاری ہی تو خواہش تھی کہ میں یہاں سے جاب چھوڑ دوں؟ اب جبکہ نئی جگہ سے آفر آ گئی ہے تو تم اداس ہو رہے ہو؟''

''چلو کوئی بات نہیں' ٹھیک ہے' بس تم اب نئی جگہ محتاط ہو کر کام کرنا' زیادہ کسی کو لفٹ کرانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اپنا نمبر بلاضرورت کسی کو دینا۔'' ایک کے بعد ایک نصیحت کرتا ثناء اللہ اسے اس وقت بڑا عجیب سا لگا تھا۔

''ٹھیک ہے' میں جانتی ہوں۔'' وہ بس اسی جملے پر اکتفا کر سکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سنو' امی کو جلدی سے راضی کرلو ناں' اب تو تمہارے بغیر اور بے سکون دن گزریں گے' جانے کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھنے کا موقع ملے گا؟'' وہ ایک دم سے چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا۔

''ہاں' کیوں نہیں' امی سے تو بات چل رہی ہے' ویسے اگر تم اپنی امی کو میرے گھر لے آتے تو.....''

''نہیں بھئی' یہ ممکن نہیں ہے۔'' ثناء اللہ نے فوراً ہی صغریٰ کی بات کاٹی تھی۔ ''میرا جو مسئلہ ہے' تمہارے سامنے ہے' تمہاری امی اگر راضی ہوتی ہیں تو اچھی بات ہے ورنہ میں خود کو اکیلے جینے کے لیے تیار تو کر ہی لوں گا۔''

''اچھی دھمکی ہے.....'' صغریٰ کچھ ناراضی سے بولی تھی۔ ''اچھا خیر' اب مجھے کچن میں جانا ہے پھر بات کروں گی لیٹ نائٹ۔''

''ہاں' ٹھیک ہے' اگر تمہیں فرصت ہو تو ضرور بات کرنا' میں منتظر رہوں گا۔'' یہ کہہ کر لائن کاٹ دی گئی تھی۔

•.....•.....•.....•

ایک ہفتے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔ ''ہم آج کتنے دنوں بعد مل رہے ہیں ناں؟'' صغریٰ نے جیسے چہکتے ہوئے کہا تھا۔

''شکر ہے' تمہاری امی راضی ہوگئیں۔'' ثناء اللہ کے چہرے پر بھی خوشی نمایاں تھی۔

''ہاں' میری بھوک ہڑتال اور ضد آخر کام آ ہی گئی۔'' صغریٰ نے ایک ادا سے کہا تھا۔

''بس اب میں پہلے ایک مکان کرائے پر لوں گا پھر ہم دونوں مل کر اُسے سیٹ کریں گے اور جب ہماری سیٹنگ مکمل ہوجائے گی تو میں تمہیں نکاح کر کے لے جاؤں گا۔'' وہ ایک ہی سانس میں روانی سے اپنے دل کی بات صغریٰ کو بتا رہا تھا۔

''اچھا جی' اور.....؟'' صغریٰ اس کے لہجے میں چھپی شدتوں کو کھوجتے ہوئے بولی۔

''میں نکاح بالکل سادگی سے کرنے کا خواہاں ہوں۔ مجھے شور وغل' ہلہ گلہ' فضول ہنگامہ بالکل پسند نہیں۔ بس گھر کے چار لوگوں میں ہم نکاح کر لیں گے۔ اب میں گھر ارینج کرنے کی تیاری کرتا ہوں۔''

''نکاح سے پہلے تو میں تمہارے ساتھ کہیں باہر نکلوں گی تو امی کو اعتراض ہوگا' کیوں ناں' ہم کہیں منگنی کرلیں؟'' بڑی مشکلوں سے صغریٰ کے دل کی بات اُس کے لبوں تک آئی تھی۔

''ہاں' یہ بھی ٹھیک رہے گا' میں کل ہی مٹھائی اور انگوٹھی کے ساتھ تمہارے گھر آجاتا ہوں۔'' ثناء نے فوراً ہی اس مسئلے پر آمادگی ظاہر کی تھی تو صغریٰ کے چہرے پر انجانی خوشی کے رنگ نمایاں ہوئے تھے۔

•.....•.....•.....•

پندرہ روز بعد ثناء اللہ اور صغریٰ کی منگنی ہوگئی تھی۔ ''دیکھو صغریٰ.....! میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے' تم سے شدید محبت کا ثبوت میرے نام کی وہ انگوٹھی ہے جو آج تمہاری انگلی میں جگمگا رہی ہے۔'' ثناء نے محبت سے مخمور لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں ثناء.....! میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔''

''اور سنو' میری اسی نشانی کی حفاظت کرنا' تمہاری انگلی میں جگمگا رہی ہے اور ہاں' خبردار' جو ان انگلیوں سے کسی غیر کا نمبر ملایا یا کسی غیر کی کال ریسیو کی۔''

''مطلب؟'' ایک ہی پل میں صغریٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''مطلب یہ کہ میں تمہاری انگلیاں توڑ دوں گا۔ اب تم میری ہوچکی ہو۔'' ثناء اللہ نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

''ابھی کہاں' ابھی ان انگلیوں نے نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔'' صغریٰ جیسے چڑ کر بولی تھی۔

''ارے' وہ دن بھی آجائے گا' بس تم اب اپنی خیر مناؤ۔''

''آج آپ مجھے دھمکیاں کیوں دیتے چلے جا رہے ہیں؟'' صغریٰ نے غصے میں چیختے ہوئے موبائل اپنے دوسرے کان پر منتقل کیا تھا۔

''چلو' آج تو مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم رات میں اور کس سے بات کرتی ہو؟''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' ثناء اللہ کے اس سوال پر صغریٰ غصے میں چیخ اٹھی تھی۔

''ہاں ناں' مجھے آج بھی تمہارا نمبر دس منٹ تک بزی ملا ہے مگر میں اپنا اتنا اچھا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا اس لیے تمہیں بڑے سکون سے بتا رہا ہوں بلکہ تنبیہہ بھی کر رہا ہوں کہ اب محتاط ہوجاؤ۔''

''آپ کے اس دماغی خلل کا میرے پاس کوئی علاج نہیں' بہتر ہوگا کہ آپ اپنی غلط فہمی خود دور کرلیں یا دل چاہے تو میرا نمبر ٹریس کروا لیں۔'' صغریٰ کی منگنی والی ساری خوشی دودھ میں آئے ابال کی طرح پل میں بیٹھ چکی تھی اور اب وہ اپنے کردار کے حوالے سے صفائیاں پیش کر رہی تھی۔

''کب تک چھپاؤ گی مجھ سے؟ ایک دن تو پکڑی جاؤ گی اور یاد رکھنا' اُس دن تمہاری خیر نہیں ہوگی۔''

''لیکن یہ تو بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ تم کوئی ثبوت تو دو کہ واقعی میں تمہیں چیٹ کر رہی ہوں؟ یہ بہت غلط بات ہے ثناء اللہ.....!'' وہ اب ایک بار پھر آپ سے تم پر آ گئی تھی اور رونے لگی تھی۔

''بس..... بس..... یہ فضول لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہانا بند کرو' جس دن ثبوت میرے ہاتھ آ گیا' میں تمہارے منہ پر دے ماروں گا پھر تم اپنی شکل دیکھنا.....'' ثناء اللہ کے لہجے میں ناگ جیسی پھنکار نکل رہی تھی۔

''جب اتنا شک کرتے ہو مجھ پر تو مجھ سے منگنی کیوں کی؟'' وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

''اچھا..... اچھا بس..... یہ رونا دھونا جب بند ہوجائے تو مجھ سے بات کرلینا' فضول میں میرا دماغ خراب نہیں کرو۔'' ثناء اللہ نے تیزی سے اپنی بات مکمل کر کے لائن کاٹ دی تھی۔

•.....•.....•.....•

تین دن گزر گئے تھے' صغریٰ نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا' اُسے ثناء اللہ کی باتوں سے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اُس کے نزدیک خاموشی ثناء اللہ کا بہترین علاج تھی جس کے ذریعے وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ اُس روز صغریٰ کے خاموش احتجاج کا چوتھا دن تھا' وہ ذرا دیر پہلے ہی جاب سے فری ہو کر گھر آئی تھی کہ اُس کی چھوٹی بہن بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

''آپی.....! ثناء بھائی آپ سے ملنے آئے ہیں' میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔''

''اچھا کیا'' وہ خوشدلی سے بولی تھی کیونکہ اُس کے خیال میں ثناء اُسے منانے آیا تھا۔

''امی نہیں ہیں گھر میں؟'' ثناء اللہ اچانک اُس کے کمرے میں ہی آ گیا تھا تو وہ سٹپٹا سی گئی تھی۔

''نہیں..... وہ کسی کام سے منگھوپیر تک گئی ہیں..... آپ بیٹھو ناں۔''

''نہیں..... میں بیٹھنے نہیں آیا..... مجھے صاف صاف بتاؤ کہ آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''میں بے قصور ہوں' بس اسی بات کا یقین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں دلانا چاہتی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''تم منہ سے کچھ بھی کہہ لومگر جب تک اپنی یہ عادت ترک نہیں کروگی' میں نہیں مانوں گا۔''

''کون سی عادت؟ تم کیوں مجھ پر الزام تراشی کررہے ہو؟'' وہ بہت زور سے دھاڑی تھی۔

''آواز نیچی رکھو اپنی ورنہ تمہارا گلہ دبا دوں گا......'' ثناءاللہ نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

''ہاں......تو دبا دو......بس دیکھ لی تمہاری شدید محبت......شکی مزاج ہوخود اور شک میرے کردار پر کررہے ہو۔''

''بس اب ایک لفظ نکلا تمہاری زبان سے تو مجھ سے براکوئی نہیں ہوگا......'' ثناءاللہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صغریٰ کے گلے پر رکھ دیئے تھے۔

''ایسا نہیں کرو ثناء...... مجھے تکلیف ہورہی ہے......ہٹاؤ اپنے ہاتھ......'' وہ بہت نڈھال سی چیخ رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس کی آواز بند ہوگئی تھی۔ ثناءاللہ اسے اب بیڈ پر پٹخ چکا تھا۔ وہ ابلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ گلے پر رکھے بس ثناءاللہ کو گھور رہی تھی۔ وہ صغریٰ کی ایسی حالت دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور باہر کی جانب بھاگا تھا۔

•......•......•......•

مورخہ ۲۳ مئی کو بائیس سالہ صغریٰ عرف نوشین کو ثناءاللہ گلہ دبا کر' ہلاک کرنے کے بعد بھاگا تو تھا مگر وہ پولیس سے بچ نہیں سکا' اسے پکڑ لیا گیا تھا' پکڑے جانے کے بعد اب وہ پاگلوں کی طرح اسی بات کی گردان کرتا رہتا ہے کہ صغریٰ کا فون انگیج رہتا تھا اور جب میں اُسے تنبیہہ کرتا تھا تو وہ الٹا مجھ سے لڑنے لگ جاتی تھی۔

قارئین......! یہ واقعہ سرجانی تھانے کی حدود صدیق گوٹھ میں پیش آیا تھا جبکہ اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ ۲۲ مئی کو تیموریہ تھانے نارتھ ناظم آباد میں بھی پیش آیا جہاں ملزم غلام صداقت کو اپنی بیوی پر شک تھا کہ وہ رات گئے کسی نامعلوم شخص سے باتیں کرتی ہے اور اس شک کی بنا پر اس نے ساجدہ کو چھری کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ نیو کراچی کے علاقے صبا سنیما کے قریب پیش آیا جہاں ملزم شیر محمد نے اپنی بیوی مہناز پر شک کی بنا پر پہلے اس کی شہ رگ کاٹی اور اس کے بعد پھندا لگا کر لاش پنکھے سے لٹکا کر خودکشی کا تاثر دینے کی کوشش کی مگر ملزم شیر محمد بھی موقع پر پکڑا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ سائٹ ٹاؤن تھانے کی حدود غنی چورنگی کے پاس پیش آیا جہاں نذیر آصف نے اپنی بیٹی کو موبائل پر تنگ کرنے والے زین الحسن کو گولی مار کر اس کی موت کو ٹارگٹ کلنگ کا رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔

قارئین......! کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں جہاں ایک کال پر ہزاروں' لاکھوں کا بزنس ہورہا ہے' ایک کال نے میلوں کے سفر کو منٹوں میں محیط کر دیا ہے' وہیں پیکج سسٹم نے گفتگو کا ٹائم ڈیوریشن بھی بڑھا دیا ہے جس کی بدولت اب کام کی باتوں کے علاوہ یہ ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات اور پل بھر میں آنے والا خیال سیکنڈوں میں میسج کے ذریعے مقابل تک پہنچ جاتا ہے جس کی بنا پر شک کا بیج بھی باآسانی نمو پانے لگ جاتا ہے اور پھر اس پر لمبی لمبی کال' صفائیاں اسے مزید بڑھاوا دینے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

قارئین......! بات ساری ہماری سوچ کی ہے کہ اس سہولت کے مثبت رخ کو اپنایا جائے یا منفی کو؟ یقیناً آج ہماری نسل اپنے نفس کے آگے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ اسے تو آج اپنی انگلیوں پر بھی بھروسہ نہیں رہا جو عالمِ بے خودی میں خود اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل تباہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں......

محمد اقبال زمان

ظلم کی آگ

حمیرا راحت کا خیال

کیوں گھور اندھیرا ہے مقدر میں تمہارے
بجھتے ہوئے سورج کی کرن پوچھ رہی ہے

معاشرے میں روا، عورت پر مرد کے ظلم سے جڑا قصہ الم

زندگی کے روزنامچے میں مرد کے عورت کے ساتھ کیے گئے ظلم کی ایک اور کہانی درج ہوگئی ہے۔ حوا کی بیٹی کے خلاف مرد کی جانب سے روا رکھا گیا یہ ظلم اور بربریت کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟؟؟ اس سوال کے ساتھ جڑی اس کہانی کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔

•......•......•......•

اپنی بیوی عروسہ کو جلا کر مارنے والا محمد اقبال گرفتار تو ہوگیا ہے لیکن اسے سزا بھی ہوگی؟ اس بات کا جواب ہمارے موجودہ نظام میں کچھ آسان نہیں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیسے اور بہت سی قانونی موشگافیوں کا سہارا لے کر وہ آزاد ہوجائے' سزا سے بچ جائے لیکن کسی صورت میں بھی کیا وہ......اوپر والے کے انصاف' اس کی سزا جہنم سے بچ سکتا ہے؟؟

ملزم شوہر اپنی مقتولہ بیوی کے ساتھ

ہمارے شہر کراچی کے تھانے کی ایئرپورٹ پولیس نے بیوی کے قتل میں ملوث اس شوہر کو گرفتار کر لیا جس کی مقتولہ بیوی موت سے کچھ دیر قبل پولیس کو ساری حقیقت سے آگاہ کر کے زندگی ہار بیٹھی تھی۔

ملزم محمد اقبال نے 19 دسمبر 2011ء کو پیٹرول چھڑک کر بیوی کو آگ لگا دی تھی۔ مقتولہ ایک ماہ سے زائد عرصے تک سول اسپتال کے برنس وارڈ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گئی۔ مقتولہ عروسہ سول ایوی ایشن کالونی کی رہائشی تھی اور تین سال پہلے گھر والوں کی پسند سے اُس کی ملزم محمد اقبال سے شادی ہوئی تھی اور اس سے اس کا ایک بچہ بھی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحقیقات کے دوران سب انسپکٹر ممتاز کو مقتولہ عروسہ کی والدہ نے بتایا کہ..... ملزم محمد اقبال کے والد اور ان کے رشتے دار جب میری بیٹی عروسہ کا رشتہ مانگنے کے لیے آئے تو ہم نے معمولی دیکھ بھال کے بعد ہاں کردی اور پھر عروسہ کی اقبال سے شادی ہوگئی۔ ہم لوگوں کو ملزم محمد اقبال کے والد نے بتایا تھا کہ ان کا اپنا ایک فلیٹ رابعہ سٹی میں ہے اور اقبال گورنر ہاؤس میں سرکاری نوکری کرتا ہے۔ ملزم محمد اقبال نے عروسہ کو شادی کے بعد رابعہ سٹی والے فلیٹ میں دو ماہ تک کرائے کا گھر لے کر رکھا۔ اس کے بعد اقبال نے سول ایوی ایشن سوسائٹی میں کرائے کا گھر لے کر رہائش اختیار کرلی تھی۔ اقبال میری بیٹی پر معمولی معمولی باتوں پہ تشدد کرتا تھا اور اس پر پابندی لگادی کہ تم اپنی ماں کے گھر رہنے نہیں جاؤ گی۔ وہ اپنی بیوی پر شک کرتا تھا۔ میری بیٹی نے اس کی یہ بات نہیں مانی تھی۔ عروسہ کی والدہ کے مطابق' اقبال عروسہ کو ایک دن سے زیادہ ہمارے گھر رہنے نہیں دیتا تھا۔ بیٹی مجھے اکثر بتاتی تھی کہ اقبال مجھ پر تشدد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہورہا ہے۔ شادی کے ایک سال بعد جب بیٹا پیدا ہوا تھا تو ہم لوگوں نے سوچا تھا کہ اب داماد ٹھیک ہو جائے گا مگر محمد اقبال نے میری بیٹی پر تشدد کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ ہم نے کئی مرتبہ اقبال کو اپنے گھر بلوا کر سمجھایا تھا لیکن وہ اپنی اس ذلیل حرکت سے باز نہیں آیا تھا اور چھ ماہ پہلے اس نے عروسہ کو بیٹ سے مارا تھا جس سے اُس کے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ہم لوگوں نے اپنی بیٹی عروسہ کو ایک ماہ تک اپنے گھر روک لیا تھا..... تو اقبال نے ہمارے گھر آ کر معافی مانگی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ..... اب میں عروسہ پر تشدد نہیں کروں گا جس پر ہم لوگوں نے عروسہ کو دوبارہ یہ سوچ کر واپس بھیج دیا تھا کہ بیٹی کا گھر ہے' اجڑنے سے بچ جائے مگر اقبال نے تو چند روز بعد اس پر دوبارہ تشدد شروع کردیا تھا۔ وہ ہر وقت میری بیٹی عروسہ کو طلاق کی دھمکی دیتا تھا اور پھر آخر کار 19 دسمبر 2011ء کو اس نے عروسہ پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا کے اسے باتھ روم میں بند کردیا جبکہ خود باہر چلا گیا۔ اس آگ سے میری بیٹی زیادہ نہیں جلی تھی۔ اقبال نے گھر واپس آ کر میری بیٹی کو ڈراتے ہوئے کہا تھا.....

''ابھی تو میں نے تم کو صرف ڈرایا ہے' میں تمہیں ہلاک بھی کرسکتا ہوں۔ ابھی تم معمولی جلی ہو' کچھ دن بعد اسپتال میں رہو گی تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم بیان دو کہ میں نے خودکشی کی ہے۔ تم نے پولیس کو میرے خلاف بیان دیا تو میں جیل چلا جاؤں گا پھر تمہارے بچے کا کیا ہوگا؟.....'' جس پر عروسہ نے یہ بیان دیا تھا کہ میں اپنی غلطی سے جل گئی ہوں۔ مجھے میرے میاں نے نہیں جلایا اور میری بیٹی علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوگئی تھی۔ اس دوران میں کچھ دن بعد اقبال نے عروسہ سے کہا تھا کہ میں کچھ پیپر لے آؤں گا' تم اس پر سائن کردینا کہ میرے مرنے کے بعد بچہ شوہر کے پاس رہے گا جس پر میری بیٹی نے مجھے کہا تھا کہ ''امی! آپ پولیس کو اطلاع کریں۔ میں بیان دینا چاہتی ہوں''..... جس پر میں نے ایئرپورٹ تھانے میں پولیس کو اطلاع دی تھی اور پھر میری بیٹی نے تمام صورتِ حال سے پولیس کو آگاہ کردیا تھا۔ اس کے بعد میری بیٹی کی حالت مسلسل بگڑتی چلی گئی تھی اور پانچ فروری کو وہ انتقال کرگئی تھی..... میری بیٹی کا انتقال ہوا تو ہم نے کئی بار ملزم اقبال کو اطلاع دی لیکن وہ بیٹی کے جنازے میں نہیں آیا۔ میں نے عروسہ کے چالیسویں کے بعد ایئرپورٹ تھانے میں قتل کا مقدمہ درج کروا دیا اور پولیس نے ملزم اقبال کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

.....☆☆.....

سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد

عکاشہ سحر ایمان

برف زار

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہٹلر کے دیس جرمنی سے جڑی سفر کہانی، عکاشہ سحر کے خوبصورت لفظوں میں۔ دوسرا حصہ

ایک نئی صبح کا آغاز ہوا۔ آج ہمیں باسحے ایئر برلن روانہ ہونا تھا۔ باہر دیکھا تو موسم بہت سرد تھا۔ بے ساختہ پاکستان یاد آیا اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ۔ بارہ بجے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا پھر دو بجے برلن کی فلائٹ تھی۔ خالص پاکستانی ناشتا ہمارے لیے آیا تھا۔ ہمارے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں ایک پاکستانی فیملی رہائش پذیر تھی۔ بہت اچھے محبت کرنے والے لوگ تھے۔ مجھ سے بطورِ خاص ملنے آئے۔ ناہید آپی کے دو بیٹے ہیں' دو تو بہت شرارتی ہیں' مجھ سے فوراً دوستی ہوگئی۔ زین سب سے چھوٹا تھا' ابھی اسکول گوئنگ نہیں تھا اس لیے ہر وقت ہمارے اپارٹمنٹ میں پایا جاتا۔ ناہید آپی کے میاں بھی ہمارے بھائی کی طرح انجینئر ہیں' انہیں جرمنی میں سیٹل ہوئے تین سال ہونے والے تھے۔ یہ ناشتا ناہید آپی نے ہی بھجوایا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے سکندر اور میں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہونے لگے تھے۔ ہاسپٹل چند کلومیٹر دور تھا۔ تیز ڈرائیونگ سے مجھے ہمیشہ بہت الجھن ہوتی ہے' رفتار تو ٹھیک تھی مگر میں بار بار کہتی۔ ''سلو..... سلو.....'' پاکستان میں ہمارا ڈرائیور افضل ہے' اسے بہت تیز ڈرائیونگ کا جنون ہے مگر جب میں سفر کرتی تھی تو اسے گاڑی بہت آہستہ چلانی پڑتی تھی۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد میں جب بھی گئی ہوں' کبھی پیدل سڑک کراس نہیں کی' بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ لوگ تو اتنے اعتماد سے سڑک کراس کر رہے ہوتے ہیں کہ رشک آتا ہے۔ میری اس بے وقوفانہ سوچ پہ سب کو بہت ہنسی آتی ہے لیکن جرمنی میں تو ٹریفک کا نظام ہی اور ہے' گاڑیوں والے پیدل چلنے والوں کا خیال کرتے ہیں' شیشے کی طرح چمکتی دمکتی سڑکیں' مہذب راہ گیر' کوئی کوڑا کرکٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں' پوری سڑک پر ایک بھی ریپر' کین کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

بیس منٹ کے بعد ہم ہاسپٹل میں تھے' خوبصورت عمارت ہے' اُسے دیکھ کر لاہور میں جوہر ٹاؤن میں جو "ڈاکٹرز ہاسپٹل" کی عمارت ہے' بے ساختہ یاد آئی۔ صفائی کا بہت اعلیٰ انتظام تھا۔ میڈیسن کی مخصوص بو کہیں نہیں تھی۔ پرسکون ماحول' کوئی چیخ وپکار نہیں تھی۔ ہر کام ایک مکمل ضابطے کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کہیں افراتفری کا عالم نہیں تھا۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں دو شعبے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں' ترقی کا راز انہی دو شعبوں میں چھپا ہوتا ہے' ایجوکیشن اور ہیلتھ کا محکمہ' یہ دونوں مضبوط ہونے چاہئیں۔ جرمنی میں یہ دونوں محکمے بہت مضبوط ہیں۔ مجھے ہر بات' ہر چیز کو گہرائی میں جا کے محسوس کرنے کی عادت ہے۔ میں نے وہاں بھی ہر بات' ہر کام بغور جائزہ لیا۔

ایک گھنٹے میں چیک اپ ہوا' ٹیسٹ ہوئے پھر سے ای سی جی ہوا۔ امریکن لہجے میں بولنے والا ڈاکٹر پیٹرا اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ سب ڈاکٹرز کی طرح اس نے بھی نصیحت کا پلندہ تھمایا۔ خوش رہنے کے اثرات پر ایک طویل لیکچر دیا۔ کوئی بھی پرابلم ہو' کوئی بیماری' کوئی حادثہ' کوئی نفسیاتی گرہ' اِن سارے معاملات سے نکلنے میں ہماری ول پاور کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ خیر سے میری ول پاور کے کیا کہنے! دوسرا چیک اپ نیکسٹ ویک تھا۔ واپسی پر ہم نے کیفے ڈس ڈراف Biba میں لنچ کیا۔ بابا سائیں گھر پہ تھے۔ ناہید آپی کی وجہ سے اُن کی فکر نہیں تھی۔ ڈس ڈراف کی خوبصورتی میں جو چیز اضافہ کرتی ہے' وہ سبزہ' جھیلیں اور چھوٹی چھوٹی دلکش نہریں ہیں' میلوں میل پھیلا نیلا پانی اور نیلے پانیوں میں ہلکورے کھاتا طلسم' ایسا حسن' ایسا طلسم' کہ کشش اور خوبصورتی کہ انسان مبہوت رہ جائے۔

گھر واپس آئے اور سامان لیا۔ برلن جا کے لیے ایئرپورٹ روانہ ہونا تھا۔ ناہید آپی سے ملاقات کی۔ زین اداس تھا' ایک ہفتہ اسے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ تم بھی چلو تو شرماتے ہوئے ماں کے پیچھے چھپ گیا۔ بابا' میں سکندر ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ گاڑی ناہید آپی کے میاں جی شہریار ڈرائیو کر رہے تھے پھر کیفے کیپری بیک فیکٹری پولائیز روڈ سے ہوتے ہوئے ایئرپورٹ پہنچے۔ وہاں بہت گہما گہمی تھی۔ برلن جانے کے لیے پرواز تیار تھی۔ شہریار بھائی ہمیں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے تھے۔

سفر خوشگوار گزرا۔ 45 منٹ کی پرواز کے بعد برلن میں تھے۔ برلن بہت تاریخی شہر ہے' اس کا ٹوٹل ایریا 892 کلومیٹر ہے جس میں سے 54 کلومیٹر ایریا ہے۔ ہر حوالے سے یہ ایک مشہور اور خوبصورت ترین شہر ہے۔ برلن میں 3,892,91 ہیں' 569 میوزیم اور گیلریز ہیں۔ روزانہ 00 ایونٹس مختلف حوالوں سے ہوتے ہیں۔ تین era ہاؤس ہیں۔ میوزیشنز کی تعداد 3,039,123 پورے برلن میں 4,160,000 درخت ہیں۔ کنزرویشن کی تعداد 40,000,000 3,278,645 آرٹسٹ ہیں برلن میں۔ اوور سالہ ہسٹری ہے برلن کی۔

ہماری رہائش برلن ہوٹل میں تھی' خوبصورت واٹر اور گرین ایریا کیفے Moskaus کے ساتھ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے' اس کا Adlew ہے' برلن کا مشہور ترین ہوٹل' اس ہوٹل دنیا کی بڑی بڑی شخصیات جن میں امریکا کے

ہی شامل ہیں' آ کر ٹھہرتے ہیں۔ ہوٹل کی بالکنی سے سارے برلن کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ جرمن قوم سادہ اور فرض شناس تو ہے ہی' ان کا لہجہ نہایت دھیما اور شائستہ ہے۔ کوئی بات پوچھیں تو نہایت نرمی اور محبت سے جواب دیتے ہیں۔ بے ایمانی اور جھوٹ کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ دن ہم نے خوب آرام کیا تھا۔

دوسرے دن ہم صبح صبح ہی باہر نکل آئے تھے۔ برلن میں اس بار شدید برف باری ہوئی تھی۔ میں تو حیران تھی اتنی برف دیکھ کر' سڑکوں پر فٹ پاتھ پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سڑکیں تو انتظامیہ صاف کر رہی تھی مگر فٹ پاتھ ابھی تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہم سب سے پہلے برلن کی قدم ترین مارکیٹ باڈی میوزیم گئے۔ نیچرل ہسٹری میوزیم کی مارکیٹ بھی ساتھ ساتھ ہے۔ اُس دن وہاں پر بہت بڑی مارکیٹ لگی ہوئی تھی۔ اسے فلی مارکیٹ کہا جاتا ہے۔ بے شمار نوادرات اُن دکانوں میں تھے۔

رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ پانی پگھلی ہوئی برف تھی پھر ہم وہاں پہنچے جہاں جرمنیوں نے جنگِ عظیم کے دوران چیک پوسٹ بنائی تھی' اس چیک پوسٹ کا نام "چارلی چیک پوائنٹ" ہے۔ وہاں کی کچھ تصویریں بنائیں۔ ایک پرانی قدیم عمارت الٹے ہاتھ پر واقع تھی جس پر روس نے اس زمانے کا نہایت بوسیدہ جھنڈا آویزاں تھا۔ اس کا کچھ حصہ پھٹ بھی چکا تھا۔ اس عمارت پر بہت نشان بنا ہے جو کہ ہتھوڑی اور وکٹری کے نشان کی شکل ہے۔ اس پرانی عمارت کے ہر ستون پر دیوارِ برلن کے دو ڈھائی فٹ کے ٹکڑے لگا دیئے ہیں جو اسی حالت میں موجود ہیں۔ اسی پوائنٹ پر سوونیئر کی چار چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں جن میں قدیم روسی حکومت کے لباس' ٹوپیاں' بیج اور بٹن' سکے رکھے تھے۔ دنیا بھر سے ٹورسٹ آئے ہوئے تھے۔ چارلی چیک پوائنٹ کی عمارت جہاں لوگوں کو چیک کرنے کے بعد آگے جانے دیا جاتا تھا' اسی حالت میں موجود ہے۔ شہر کے وسط میں ایک گرجا گھر ہے جو دوسری جنگِ عظیم میں بمباری کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا لیکن جرمنی کی حکومت نے اس کے اوپر کے حصے کو جنگِ عظیم دوم کی یادگار کے طور پر ویسے ہی ٹوٹا ہوا رہنے دیا ہے۔ اس گرجا گھر کے اردگرد فرانس کے شانزے لیزا کی طرح کی مارکیٹ بنائی گئی ہے جہاں برانڈڈ چیزیں دستیاب ہیں۔ جرمن لوگ کسی بھی معاملے میں دھوکہ دہی پسند نہیں کرتے۔ اس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ اکثر دکانوں پر سیاحوں کی دلچسپی کے لیے دیوارِ برلن کے سوونیئر کے طور پر ٹکڑے فروخت کے لیے رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف رنگ کیے گئے ہیں۔ کچھ ٹکڑے شیشوں میں بند تھے اور کچھ پلاسٹک کور میں۔ اگرچہ شیشوں والے ٹکڑے بہت مہنگے تھے لیکن ان کے متعلق وہ صاف بتاتے تھے کہ یہ اصل ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ symbolit ہیں اور پلاسٹک والے پتھر کے رنگین ٹکڑے اصل ہیں اور ان کے ساتھ ان کے اصلی ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے۔ جرمن قوم کی سچائی' ایمانداری' نرم طرزِ گفتگو' اپنے کام میں مخلص ہونا' یہ ساری باتیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اُن کی ترقی کا راز انہی چیزوں میں پنہاں ہے۔

چارلی چیک پوائنٹ کے قریب فقیروں کا ہجوم بھی تھا جو میوزک بجا کر اور گانے سنا کر بھیک وصول کر رہے تھے۔ برلن کے سب سے بڑے چوک الیگزینڈر پلاس پر ایک میوزک کنسرٹ ہو رہا تھا' بہت رش تھا پھر بابا تو ہوٹل میں واپس چلے گئے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر میں اور سکندر ہم دونوں پیدل گھومتے رہے۔ حدِ نگاہ تک پھول ہی پھول' سبزہ ہی سبزہ' رنگوں اور خوشبو کا سیلاب' نیلے پانی کی موسیقی' خوش آواز پرندوں کا ترنم' مست ہواؤں کا خوشگوار لمس' وہیں پر ہی جرمنی کے مشہور و معروف شاعر ہائنا کے بارے میں پڑھا' وہ ہائنا جس کی نظم کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے فارسی میں یہ نظم لکھی تھی۔

ے ساحل افتاد گفت' گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

(ترجمہ).....ٹھہرے ہوئے جامد ساحل نے اپنے آپ سے کہا۔ 'میں مدتوں سے زندہ ہوں لیکن آہ..... مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ میں کیا ہوں؟'

موج زخود رفتہ' تیز خرامیدہ گفت
ہستم اگر میروم' گرنہ روم نیستم

(ترجمہ).....میری حقیقت کیا ہے' تیزی سے چلتی موج نے جواب دیا کہ اگر میں چلتی ہوں تو موج کہلاتی ہوں اور اگر میں نہ چلوں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔

ہائنا بڑا کمال کا شاعر تھا۔ نطشے نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ جرمنی نے ہائنا اور مجھ سے بڑا آرٹسٹ پیدا نہیں کیا۔ گائیٹر نے تبصرہ کیا تھا کہ ہائنا کی شاعری میں قدیم اسلوبِ بیان اور جدید عاشقانہ تصورات کا نہایت خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔

ہم پیدل چلتے جھیل کنارے آگئے۔ طلسماتی نمی' مدھر بھری شفافیت' کوئی کہانی میرے اندر ہی اندر کہیں اپنا آپ لکھے جارہی ہے۔ پانیوں کی کہانی بھی عجب ہے اور ان منظروں کی بھی جو پانیوں کے آس پاس ہوتے ہیں' بھنور اور بہاؤ' کبھی تیز' کبھی آہستہ' دھن کہ جس کی سانس کبھی اکھڑتی نہیں اور دھند جو نرمیلی کشش کے ساتھ ہر شے کو لپیٹے چلی جاتی ہے۔ نشیلا سکون' بھرا' تلاطم' جھیل کی گود نیلے پانی سے بھری ہوئی ہے جہاں تک نظر جاتی ہے' بس پانی ہی پانی' ٹھہرا ہوا' چپ چاپ' پرسکون پانی' سناٹوں کی دھن اور نرمیلی ہواؤں کا ارتعاش' گہرا نیلا اور برفاب یخ بستہ پانی جس میں سبز پیڑوں کے عکس اتر رہے تھے۔ جھیل کے ایک جانب گھنا سبز جنگل جو یقیناً بہت دور تک پھیلا ہوگا۔ مجھے پانی کی سرد کاٹ رگوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ حواسِ خمسہ کی قوتِ ادراک بھی عجیب ہوتی ہے۔ اندر باہر کی دنیا کا فرق مٹنے لگتا ہے جیسے سورج کی تمازت سے بیٹری سیل لمحاتی توانائی حاصل کرلیتا ہے' اسی طرح اچھے مناظر' چہار قص' اچھی موسیقی' خوبصورت شاعری' دل چھونے والے مناظر' فطرت کے حسین نظارے ہمیں فریش کردیتے ہیں۔ میں بھی اس منظر میں کھو گئی۔ پردۂ سیمیں پر جو نظر آتا ہے' وہ اصل کا عکس ہوتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھ صرف عکس کو متحرک دیکھتی ہے۔ منظر نا معلوم کیا ہوتے ہیں' حقیقت میں وہ جو ہمیں نظر آتے ہیں یا پھر کچھ اور' حقیقت سے کون باخبر ہے؟

وہ دن بہت اچھا گزرا' کچھ تفریحی مقامات بھی دیکھے مگر مجھے میوزیم دیکھنے کا شوق ہے۔ وہ پروگرام دوسرے دن پر رکھا۔ درمیان میں سیما آپی کا فون آیا۔ اُن سے خوب گپ شپ کی۔ وہ میری صحت کے حوالے سے فکرمند تھیں۔ چیک اپ کے بارے میں پوچھا۔ گھر آنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے بتایا کہ ہم ابھی چند دن برلن میں ہیں۔ دوسرے دن بھی موسم خوشگوار تھا پھر سے سکندر اور میں باہر نکل آئے۔ برلن کے تاریخی مقامات دیکھے۔ دیوارِ برلن کا وہ ایک حصہ بھی دیکھا جو یادگار کے طور پر چھوڑا گیا تھا۔ بتاتے چلیں کہ دیوارِ برلن کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے اور دوسری جنگِ عظیم کا تعلق بہرحال پہلی جنگِ عظیم سے ہے۔ مختصر یہ کہ پہلی جنگِ عظیم 1914ء سے 1919ء تک رہی جبکہ دوسری جنگِ عظیم 1939ء سے 1945ء تک رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر جرمنی کو شکست ہوئی۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کو عبرت ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد جرمنی پر انتہائی ذلت آمیز شرائط عائد کردی گئیں اور بظاہر صلح ہوگئی۔ ان ذلت آمیز شرائط کے نتیجے میں جرمنی اپنے قومی افتخار سے محروم ہوگیا لیکن اسی اثناء میں ایڈولف ہٹلر نے جرمن قوم کو پھر سے منظم کیا اور طاقت ور بنایا۔ بدقسمتی سے اسی طاقت کے نشے میں ہٹلر نے 1939ء میں ہمسایہ ریاست پولینڈ پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا اور یوں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ اٹلی اور جاپان دے رہے تھے۔ ان طاقتوں کو اتحادی کہا گیا جبکہ دوسری جانب فرانس' برطانیہ اور بعد ازاں امریکا تھے۔ اس جنگ کے خاتمے پر ایک بار پھر جرمنی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ جرمنی پر قبضہ کرنے والی طاقتوں میں سوویت یونین' فرانس اور برطانیہ نے اپنے اپنے حصے الگ کردیئے۔ سوویت یونین اشتراکی نظام کا نمائندہ تھا اور اس نے اپنے مقبوضہ حصے میں یہی نظام رائج کرنا چاہا جبکہ دوسری جانب فرانس اور برطانیہ سرمایہ دارانہ ممالک تھے اور وہ اپنے مقبوضہ حصے پر اپنا نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہی کشمکش جرمنی کی تقسیم کی وجہ بنی اور جرمنی کے دو حصے ہوگئے مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی۔ قصہ برلن تک پہنچا تو یہ عظیم شہر بھی دو ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا۔ شہر کے درمیان میں طویل سنگی فصیل کھڑی کردی گئی اور برلن کے رہنے والے اپنے ہی شہر کے دوسرے حصے میں جانے سے محروم ہوگئے۔ دیوارِ برلن 1989ء تک رہی۔

1989ء میں سوویت یونین کے زوال کے ساتھ ہی دو بڑی عالمی طاقتوں کے مابین سرد جنگ کے خاتمے کے آثار پیدا ہوتے ہی برلن عوام نے دونوں جانب سے اس خونی دیوار پر ہلہ بول دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جرمن عوام کو تقسیم کرنے والی دیوارِ برلن زمیں بوس ہوگئی اور دونوں طرف کے عوام خوشی' غم اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے ایک دوسرے کو ملنے لگے۔ یہ ہے دیوارِ برلن کی مختصر تاریخ.....

دوسرا دن بہت خوشگوار تھا' آسمان پر کہیں کہیں بادل تیرتے پھر رہے تھے' پارکنگ ایریا میں موجود فوارے سے اچھلتا ہوا پانی آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اونچی عمارت کی بالکنی سے نیچے جھانکنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آج بابا نے واپس پاکستان چلے جانا تھا جبکہ میرا کچھ دن اور رہنے کا ارادہ تھا۔ کافی کی طلب ہورہی تھی۔ ویٹر کو آرڈر کیا' کافی آگئی۔ دور نیلے آسمان پر بادل رقص کررہے تھے' کس قدر امن' آزادی اور سکون ہے یہاں' لوگ انسانیت سے پیار کرتے ہیں' ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں' کسی محکمے میں کوئی بدامنی' کوئی کرپشن نہیں۔ مجھے اپنے ملک خصوصاً کراچی کا خیال آیا اور وہاں کے حالات نے افسردہ کردیا۔ نوجوان نسل کے اندر معاشرے کے خلاف شدید نفرت اور پھر معاشرتی ناانصافیوں کا خود سے بدلہ لینا..... نیگیٹو چارج کی طرح بے مقصد جینے والے لوگوں کو پازیٹو چارج کی ضرورت ہے۔ بامقصد زندگی گزارنے کے لیے چراغ سے چراغ جلانا ضروری ہوتا ہے لیکن؟؟؟ امن سکون کی خواہش انسان کا بہت پرانا خواب ہے' خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برلن سے بابا کی فلائٹ دن بارہ بجے تھی۔ سکندر اور میں انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گئے۔ آسمان پر بادلوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر تیرتی ہوئی آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھیں' کبھی کبھی سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا۔ چوڑی سڑک کے دونوں کناروں پر سبزے کی تہہ بچھی ہوئی تھی' تاحدِ نگاہ ہریالی اور سبزہ ہی سبزہ' مناظرِ فطرت اپنی طرف سے توجہ ہٹنے نہ دیتے تھے۔ ہمارے دائیں جانب ڈینیوب دریا اور اس کے پیچھے الپس کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ ڈینیوب یورپی دریاؤں میں دوسرا بڑا دریا ہے جو جرمنی کے ایک پہاڑی سلسلے بلیک فاریسٹ کی مشرقی ڈھلوانوں سے نکلتا ہوا ایک ہزار سات سو پچاس میل تک بہنے کے بعد رومانیہ سے ہوتا ہوا بحیرۂ اسود میں جا گرتا ہے۔ غور فرمایئے جی کہ ایک دریا تین چار ملکوں میں سے گزرتا ہے لیکن اس کے حوالے سے یورپ میں کبھی کوئی تنازع سامنے نہیں آیا۔ ایک ہمارا دریائے سندھ ہے جس کے راستے میں آنے والے صوبے مختلف دلائل کی رو سے اس پر اپنا حق جتاتے رہتے ہیں۔

چالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ایئرپورٹ آ گیا تھا۔ ایئرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں ہم نے بابا کو الوداع کہا۔ واپسی کا سفر ذرا اداس تھا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ویٹنبرگ.....'' مختصر جواب آیا۔

''ویٹنبرگ سے مارٹن لوتھر کا تصور ذہن میں ابھر آیا۔ جرمنی میں عیسائی پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی..... جو کہ ایک معمولی کان کن کا بیٹا تھا۔ اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ وہ مارٹن لوتھر جس نے 19 برس کی عمر میں رہبانیت اختیار کر لی تھی اور روم کے دورے کے بعد پوپ اور رومن کیتھولک عقیدے سے پروٹسٹ کرتے ہوئے اس عقیدے سے منحرف ہو گیا۔ اس نے اپنے عقیدے کے 195 اصول مرتب کیے۔ 1520ء میں اصلاح کلیسا کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا اور پھر 1521ء میں احتساب کی ایک مذہبی عدالت میں پیش ہوا جہاں اس نے پاپائے روم کے خلاف اپنے الزامات واپس لینے سے انکار کر دیا۔ 1525ء میں کیتھرائن نام کی ایک راہبہ سے شادی کی۔ بائبل کا ترجمہ لاطینی زبان سے جرمن زبان میں کیا۔ مارٹن لوتھر کی تمام تصانیف 1534ء میں ایک ہی جلد میں شائع ہوئیں اور مناظرے کی کتابوں میں ''ٹیبل ٹاک'' بہت مشہور ہوئی۔

ویٹنبرگ میں سیاحوں کی بہتات تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں گفٹ شاپس اور ریستوران کی بھرمار تھی۔ اُسی وقت ہلکی ہلکی بارش ہونا شروع ہو گئی۔ ہر طرف ڈاگ ووڈ کے پودوں میں خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ گاڑی ریستوران کے پارکنگ میں رک گئی۔ وسیع و عریض پارکنگ میں بڑی مشکل سے جگہ ملی۔ مرکزی دروازے کے سامنے پام کے درختوں کی قطاریں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ریستوران میں انڈین رنگ اور کلچر خاصا نمایاں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد قریب ہی شاپنگ مالز سے شاپنگ کی۔ تیز بارش اَب ہلکی ہلکی بوندا باندی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہوا کے تھپیڑے خوشگوار لگ رہے تھے۔ یہاں پر بھی دو اوپیرا ہاؤس ہیں' آٹھ عدد میوزیم ہیں مگر وقت کی کمی کے باعث ہم کہیں نہ جا سکے۔

وہ برلن میں ہمارا آخری دن تھا۔ شام کی فلائٹ سے ہم نے ڈسل ڈراف واپس چلے جانا تھا۔ ساری رات بارش ہوتی رہی تھی لیکن صبح مطلع بالکل صاف شفاف تھا۔ سکندر کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا' برف باری ہو رہی تھی۔ برلن کا آخری دن اداس کر دینے والا تھا۔ جرمنی کے سارے شہر ہی بہت خوبصورت ہیں لیکن برلن کی بات ہی اور ہے۔ بہت تاریخی اور خاص شہر ہے۔ ڈسل ڈراف سبزے اور جھیلوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ ڈسل ڈراف میں بہت خوبصورتی اور حسن ہے اور پھر نیلا' سرد' کاٹ دار پانی..... میونخ بہت پراسرار شہر ہے' اس شہر کی فضا میں عجیب سا سکون اور پراسراریت ہے۔ فرینکفرٹ ہنگامہ پرور شہر ہے۔ وہاں زندگی اپنے تمام تر رنگوں سمیت موجود ہے۔

میں سوچ رہی تھی' زندگی موسموں کے بھید مجھ پر کیوں نہیں کھولتی؟ مجھے مولانا رومؒ کا بہت خوبصورت شعر یاد آیا تھا۔

پیکرِ از ما ہست شد نے ماازو
بادہ از ما است شد نے ماازو

ترجمہ..... وجود کی زندگی ہم سے ہے' ہماری زندگی اس سے نہیں۔ (جس طرح) شراب کا وجود ہم سے ہے مگر ہمارا وجود اس سے نہیں ہے۔

عجیب سی زندگی ہے ناں اور پھر زندگی کا فلسفہ عجیب تر..... کوچۂ دلبراں' خیالِ یار کی چادر اور شبِ فراق کا بہتا زہر..... پتہ نہیں' دھند کے اس پار کیا کچھ رہ گیا ہے؟ اداسی کے غلاف میں لپٹی چند ہجر زدہ سوچیں' اثاثۂ حیات' امیدوں کا مرکز' ایک زرد چاند ہے جو محبت کے آکاش سے جھانکا کرتا تھا اور زادِ راہ کے طور پر یادگارِ شہرِ ستم..... یہ زندگی ہے۔ زندگی جو اپنا آپ کسی پر عیاں نہیں کرتی۔

سیما آپی کی کال نے مجھے زندگی کے فلسفے سے باہر نکالا۔ فرینکفرٹ سے اُن کی کال تھی' خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے پوچھا تھا کہ اُن کے پاس فرینکفرٹ کب آنا ہے؟ وہ بہت شدت کے ساتھ انتظار کر رہی تھیں۔ فون بند ہوا تو میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا' بچے دیکھ رہے تھے' میں نے انہیں ہاتھ ہلایا۔ برلن سیاحوں کے لیے خاصی کشش رکھتا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے برلن کے موسم نے خاصا پریشان کیا۔ ہر وقت برف باری اور بارش۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے پہلے ہی نصیحتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ''اِس بار وہاں بہت سردی ہے' احتیاط کرنا۔'' ایون کراچی ایئرپورٹ تک سیل پر ''اپنا خیال رکھنا۔'' کے پیغامات موصول ہوتے رہے۔ مجھ سے سردی برداشت جو نہیں ہوتی۔ بی بی جان اور جنت کی دن میں کئی کئی بار کالز آتیں۔ ''گڑیا' تم ٹھیک ہو؟ عاشی' تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ یہ پہن لو' وہ جیکٹ اور کوٹ پہن لو۔'' اکتوبر کے مہینے میں تین تین جیکٹس' جرسی اور ہائی نیک پہننے والی کا جرمنی کے سرد ترین موسم میں کیا حال ہوگا۔ سکندر کی تو ہنسی ہی نہیں رکتی تھی۔ مجھے حفاظتی اقدام کرتے ہوئے دیکھ کر فیس بک پہ جاتی تو وہیں پیغامات ''اپنا خیال رکھنا' بہت سردی ہے۔''

اِس بار واقعی جرمنی کا موسم بہت سرد رہا۔ جنوری' فروری میں خاصی برف باری ہوئی۔ میں نے بھی چیلنج کے طور پر سردی کا سامنا کیا۔ کافی پینے کی عادت ہو گئی جو کہ سختی سے منع ہے۔ میں برلن کی فضاؤں میں کھوئی ہوئی تھی' جانے پھر کب؟ کبھی کبھی یا پھر شاید کبھی نہیں۔ چیری کے خوبصورت پودے جن پر گلابی' سرخ اور جامنی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جی بھر کے انہیں دیکھا۔ یہ فطرت کے رنگین نظارے اور رنگوں کو کاٹ دینے والا نیلا پانی پھر آرٹ کے حوالے سے نیشنل گیلری آف آرٹ...... بین ز میوزیم، شہنشاہ بس مارک کا مجسمہ، چارلی چیک پوائنٹ، پرانا گرجا گھر، پورٹریٹ گیلری، برلن کی عمارتیں دلکش فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ ہر عمارت اپنی جگہ ماسٹر پیس ہے۔ ڈسل ڈراف میں عمارتیں پرانے طرزِ تعمیر پر ہیں۔ قدیم رنگ جھلکتے ہیں اُن میں۔ فرینکفرٹ بھی جدید طرزِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اتنے دنوں میں اُس روز پہلی بار میں نے لنچ تنہا کیا۔ میری نام والی ویٹرس ایک خوش اخلاق اور پیاری لڑکی تھی۔ اس نے جنت کی طرح میرا بہت خیال رکھا۔

امریکا سے تعلق رکھنے والی 28 سالہ میری پچھلے دس سال سے برلن میں مقیم ہے۔ وہ کئی جگہ جاب کرتی ہے، دن میں ہوٹل میں، رات کو کسی کیفے میں، دو چار گھنٹے جو آرام کے ہوتے ہیں، وہ بھی کسی شاپ پر کام کرتے ہوئے گزارتی ہے۔ خوبصورت آنکھوں والی میری، بہت محنتی اور پیاری لڑکی تھی۔

تین بجے سکندر آ گیا۔ شام چھے بجے ہماری فلائٹ تھی۔ سامان پیک کیا۔ میری اور اس کے مشہور ومعروف ہوٹل کو خدا حافظ کہا اور ہم باہر نکل آئے۔ باہر کا موسم اب ٹھیک تھا مگر سردی بہر حال تھی۔ ہوٹل کی بیک سائیڈ پر ایک بہت بڑا شاپنگ مال تھا۔ ہمارا شاپنگ کرنے کا ارادہ تھا۔ پیدل چلتے ہوئے ہم شاپنگ مال کے مرکزی دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف روشنیوں کا سیلاب ہی سیلاب ہو۔ برقی سیڑھیوں سے اتر کر ہم نیچے فلور پر آ گئے۔ دو منزلہ شاپنگ مال انتہائی خوبصورت اور وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اندرونی ماحول میں بھی خاصی خنکی تھی۔ شاپنگ مال کے عین درمیان میں ایک بڑا سا فوارہ نظر آیا جس میں سے پانی اچھل رہا تھا۔ فوارے کے چاروں طرف پھولوں کے تختے تھے۔ پتھریلی بنچوں پر عورتیں اور مرد حضرات بیٹھے تھے۔ شاپنگ مال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ کئی جگہ انڈین جن میں مشرقی پنجاب کے سکھ حضرات کی اکثریت نظر آئی۔

ہم خریداری کے بعد باہر نکل آئے۔ موسم کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ شاپنگ مال کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی جھیل نظر آئی جس کی خاموش سطح پر بارش کے قطرے ارتعاش پیدا کرتے ہوئے جھیل کے پانی کا حصہ بن جاتے تھے۔ جھیل کے کناروں پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ وہ منظر بھی خاصا دلکش تھا۔ کچھ ہی دیر میں سکندر کے دوست جمال بھائی گاڑی لے کر آ گئے۔ جمال بھائی ملتان کے رہائشی ہیں لیکن جاب کی وجہ سے جرمنی، برلن میں مقیم اُن کی فیملی سے ہمارے قریبی تعلقات ہیں۔ تعلقات کی مضبوط وجہ ہماری اور اُن کی فیملی کا سیاسی بیک گراؤنڈ ہے۔

''اچھی خاصی بارش ہوئی ہے۔ میں آفس میں تھا، خبر ہی نہ ہو سکی۔'' جمال بھائی نے کہا تھا۔

باہر کی زندگی کا یہ پہلو بھی عجیب ہے کہ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر آتے جاتے کتنے موسم بیت جاتے ہیں، کتنی رُتیں تبدیل ہو جاتی ہیں اور خبر بھی نہیں ہوتی۔ سڑکیں دھلی ہوئی تھیں، گاڑی ایئرپورٹ کی طرف رواں دواں تھی۔ میں نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر دیا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے خوشگوار لگ رہے تھے۔ برلن کی خوبصورت فضا اداس کر رہی تھی۔ جانے پھر کب یہاں آنا ہو، ویسے بھی اگلے چند ماہ میں سکندر نے جاپان چلے جانا تھا۔

اِس خوبصورت، دلچسپ سفرنامے کی
آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

رخسانہ سہام مرزا

یادوں کے اوراق

حجاب عباسی کا خیال

گزرتا وقت بدلتا ہے خال و خد سب کے
یہ ساری عمر کا سامان تھوڑی ہوتا ہے

ماضی کی خوش رنگ یادوں سے جڑی رخسانہ سہام مرزا کی ہفت رنگ آپ بیتی

وقت کی تیز ہوا میری کتابِ زیست کے اوراق بہت تیزی سے آگے کی جانب پلٹ رہی ہے۔ میں بہت دن سے سوچ رہی تھی کہ اپنی کتابِ زیست کے حوالے سے کچھ لکھوں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا لکھوں؟ اور پھر جب میں نے اس بات کا ذکر دفتر میں ناصر رضا اور غزالہ سے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی بھولی بسری یادوں کو کاغذی پیرہن پہنا دیں اور جب منزہ، راجہ محمود اور کاشی نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا تو میں نے اپنی ''کتابِ زیست'' سے ''یادوں کے اوراق'' اپنے پڑھنے والوں کی بصارت کا رزق بنانے کا فیصلہ کر لیا اور جب میں نے اس کا آغاز کیا تھا تو فوراً ہی میرے دل کے دروازے پر کسی شاعر کے اس خیال نے دستک دی تھی۔

بچپن کے دن بھی کیا دن تھے
اُڑتے پھرتے تھے تتلی بن کے

بچپن تتلی جیسا ہی تو ہوتا ہے، یادوں کے رنگ چھوڑ کر اڑ جانے والا۔ میرا بچپن اس شہر کراچی کی مشہورِ زمانہ قدیم آبادی پیرالٰہی بخش کالونی کی گلیوں اور گھروں میں گزرا۔ وہاں موجود میں اپنا گھر کبھی نہیں بھولتی، وہ میرا پیارا سا گھر جہاں صحن میں امرود کا ایک گھنا درخت لگا تھا جس کا ایک امرود بھی ہم نے کبھی پکنے نہیں دیا تھا۔ اُس کی ایک ڈال پر لٹکا طوطے کا پنجرہ بڑے سے صحن میں بنی بڑی سی کیاریوں میں سدا بہار کے پھولوں سے لدے ہوئے پودے اور چھوٹی کیاریوں میں بہار دکھاتا ہرا دھنیہ اور پودینہ اور ساتھ ہی ہمارے خانساماں امیر حسن کی ہمیں گھورتی خونخوار نظریں کہ کہیں ہم کھیل کھیل میں اُن پودوں کو خراب نہ کر دیں۔ ایسے میں مجھے کہیں سے اپنی ایک عزیز ترین سہیلی طاہرہ کی آواز آ رہی ہے...... تو کہیں دوسری پیاری سہیلی نسیم بیٹھی گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ (آج طاہرہ جلیل امریکہ کو پیاری ہو کر نیویارک میں زندگی گزار رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ وہ جب پاکستان آئی اور ہم نے بچپن کے دنوں کو ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے بچپن کے دنوں کو بہت یاد کیا جبکہ نسیم کی کوئی خبر نہیں' وہ کہاں ہے؟ ہے بھی یا؟؟) جبکہ میں اور زبیدہ جن کو آپ ''زبیدہ آپا'' کے نام سے جانتے ہیں' رسی کودنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کررہے ہیں اور انور جو کہ اَب ''انور مقصود'' ہیں' وہ ریفری بنے یہ گنتی کررہے ہیں کہ کس نے زیادہ رسی کودی اور اس مقابلے کا اختتام جھگڑے پر ہوا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی درست فیصلہ نہیں دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ سرِشام گھر میں رشتے داروں کی آمد شروع ہوجاتی' کوئی چائے پر راضی تو کوئی ٹھنڈے کا طالب اور کسی کا دل اور پیٹ صرف باتوں سے ہی بھرتا۔ کہیں ایسی بحث چھڑی ہوتی کہ کوئی ہار ماننے پر تیار نہ ہوتا اور پھر جب اس بحث کے دوران آوازوں کی گونج بہت زیادہ بڑھ جاتی تو بزرگوں میں سے کوئی مداخلت کرتا۔ ذرا دیر کو خاموشی ہوتی اور پھر زندگی بولنے لگتی تھی۔ یہ تمام منظر میرے ذہن کی سلیٹ پر نقش ہیں اور شاید آخری سانس تک نقش رہیں گے۔

بچپن میں میرا شمار سب سے زیادہ شریر بچوں میں کیا جاتا تھا۔ اُن دنوں پیر کالونی کے تمام گھر ہم بچوں کے تھے' جس گھر میں چاہا' گھس گئے' کوئی روکنے والا نہ تھا۔ ہر طرف خلوص اور محبتوں کی بوچھار تھی۔ اللہ رحم کرے' موجودہ وقت کی طرح نہ کوئی ڈر نہ خوف نہ ہی حالات تھے۔ ہم رات دیر تک بے خوف و خطر کھیلتے تھے۔ اُن دنوں ہر طرف محبت' خلوص اور بھائی چارے کے رنگ اور امن کا ماحول تھا۔

نسیم کے گھر اور ہمارے گھر کے بیچ ایک دیوار تھی۔ وہاں بھی شام ایسی ہی نظر آتی تھی۔ نسیم کی والدہ نہیں تھیں۔ اُس کا گھرانہ نو افراد پر مشتمل تھا' نسیم کے ابا جی' پھوپی پھوپا' اُس کے پانچ بہن

ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے بچپن کے دنوں کو بہت یاد کیا جبکہ نسیم کی کوئی خبر نہیں' وہ کہاں ہے؟ ہے بھی یا؟؟) جبکہ میں اور زبیدہ جن کو آپ ''زبیدہ آپا'' کے نام سے جانتے ہیں' رسی کودنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کررہے ہیں اور انور جو کہ اَب ''انور مقصود'' ہیں' وہ ریفری بنے یہ گنتی کررہے ہیں کہ کس نے زیادہ رسی کودی اور اس مقابلے کا اختتام جھگڑے پر ہوا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی درست فیصلہ نہیں دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ سرِشام گھر میں رشتے داروں کی آمد شروع ہوجاتی' کوئی چائے پر راضی تو کوئی ٹھنڈے کا طالب اور کسی کا دل اور پیٹ صرف باتوں سے ہی بھرتا۔ کہیں ایسی بحث چھڑی ہوتی کہ کوئی ہار ماننے پر تیار نہ ہوتا اور پھر جب اس بحث کے دوران آوازوں کی گونج بہت زیادہ بڑھ جاتی تو بزرگوں میں سے کوئی مداخلت کرتا۔ ذرا دیر کو خاموشی ہوتی اور پھر زندگی بولنے لگتی تھی۔ یہ تمام منظر میرے ذہن کی سلیٹ پر نقش ہیں اور شاید آخری سانس تک نقش رہیں گے۔

بچپن میں میرا شمار سب سے زیادہ شریر بچوں میں کیا جاتا تھا۔ اُن دنوں پیر کالونی کے تمام گھر ہم بچوں کے تھے' جس گھر میں چاہا' گھس گئے' کوئی روکنے والا نہ تھا۔ ہر طرف خلوص اور محبتوں کی بوچھار تھی۔ اللہ رحم کرے' موجودہ وقت کی طرح نہ کوئی ڈر نہ خوف نہ ہی حالات تھے۔ ہم رات دیر تک بے خوف و خطر کھیلتے تھے۔ اُن دنوں ہر طرف محبت' خلوص اور بھائی چارے کے رنگ اور امن کا ماحول تھا۔

نسیم کے گھر اور ہمارے گھر کے بیچ ایک دیوار تھی۔ وہاں بھی شام ایسی ہی نظر آتی تھی۔ نسیم کی والدہ نہیں تھیں۔ اُس کا گھرانہ نو افراد پر مشتمل تھا' نسیم کے ابا جی' پھوپی پھوپا' اُس کے پانچ بہن

انسان کی بچپن میں سوچ بڑی بچکانہ معصومانہ اور احمقانہ ہوتی ہے۔ میری ایسی ہی ایک سوچ نے ایک دلچسپ جھگڑے کو جنم دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ نسیم کی پھوپی کے گھر ایک ننھی منی مہمان آئی تھی۔ ہم سب بس اُس کو پیار کرنے اور گود میں لینے کے لیے اتنے بے تاب ہوتے کہ وہ اُس بچی کو ہم سے بچا بچا کر تھک جاتیں، خیر، اسی دوران میں غضب یہ ہوا تھا کہ انہوں نے اُس بچی کا نام رخسانہ رکھ دیا تھا۔ اب تو میں نے جو قیامت برپا کی تھی کہ میرا نام نسیم کی پھوپی نے چرالیا۔ نام کسی کا رکھا گیا اور لڑائی میری نسیم سے' اُس بے چاری کا گھر سے نکلنا تو مشکل ہوگیا تھا۔ دوسری طرف سب بزرگوں کے ہاتھ تو گویا ایک تماشہ لگ گیا۔ میں جب ذرا اس بات کو بھولتی' کوئی نہ کوئی بزرگ مجھے چھیڑتا۔ ''ارے رخسانہ' تمہارا نام تو چوری ہوگیا۔'' بس پھر تو میں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیتی' یہاں تک کہ میری آواز نسیم کے گھر پہنچ جاتی اور اُدھر سے ثریا باجی کی آواز آتی۔

''پھوپھو' اُس کو اپنے نام کی چوری پھر یاد آگئی۔''

اور پھر دونوں طرف ہنسی کا بازار گرم ہوجاتا۔ میں نے تو نسیم کے گھر جانا ہی چھوڑ دیا تھا..... ہمارا گھر مین روڈ پر تھا۔ اُس وقت شاید بسوں کا سب سے بڑا اڈہ پیر کالونی میں ہوتا تھا۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھ کر بسیں گنا کرتی۔ میں اپنے کام میں مشغول ہوتی تو ایسے میں افتخار بھائی یا زلفی بھائی اپنے گھر سے نکلتے اور مجھے چھیڑ دیتے۔

''اوہ..... تم یہاں بیٹھی ہو اور تمہارا نام کوئی لے گیا ہے' بس پھر تو میں سب کام چھوڑ کر اپنی ساری توانائی بدتمیزی پر خرچ کردیتی۔ مٹھیوں میں مٹی بھر کر نسیم کے گھر کے برآمدے میں پھینکنا شروع کردیتی یہاں تک کہ ثریا باجی کی آواز آتی تھی۔ ''اوئے..... افتی' زلفی اینوں نا چھیڑا کرو' دیکھ سارا گند پا دیتا ہے۔ میں ہنی صاف کیتا سی۔''

اور پھر جب وہ غصے سے آنکھیں نکال کر باہر آتیں تو میں پلک جھپکتے اپنے گھر میں چلی جاتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو کہیں آپس میں مل کر کھیل رہے ہوتے ہیں لیکن بڑوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔

گئے وقت میں بہت سے رشتے دار مل کر ساتھ رہتے تھے' کھاتے پیتے' ہنستے بولتے تھے' اس بات کا کوئی جھگڑا نہیں تھا کہ یہ میرا ہے' یہ تمہارا ہے' ہر مسئلہ سلجھا ہوتا تھا۔ محلہ پڑوس سب ایک دوسرے کے سنگی ساتھی' خوشی اور غم بھی سب کے یکساں۔ وہ بڑا حسین وقت تھا' کسی گھر کی گھنٹی نہیں بجانی پڑتی تھی' دروازہ ہر دم کھلا رہتا تھا' بس ایک چق یا چلمن پڑی ہوتی تھی' مگر اب تو گھر کیا' دلوں میں بھی دیواریں اور بند دروازے ہیں۔

جب میری زندگی چند قدم اور آگے بڑھی تو بڑوں نے سوچا کہ ان بچوں کو گھر کی اہمیت سمجھائی جائے' سو امرود کے درخت کے نیچے ایک کونے میں گڑیا کا گھر بنا۔ یہ گھر میری بڑی پھوپی نے بنایا تھا۔ اس کی تعمیر میں میرے تمام دوستوں' لڑکوں اور لڑکیوں نے حصہ لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے' گڑیا کے اس گھر کے پاس پانی کا ایک کنواں بھی بنایا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے زمین کھود کر دھات کا ایک ڈبہ رکھا گیا تھا جس کے دونوں طرف لکڑیاں گاڑی گئی تھیں پھر ایک لکڑی میں دھاگے کی خالی ریل ڈال کر ان دونوں لکڑیوں کے درمیان باندھی گئی تھیں اور اس میں سُتلی سے ڈول باندھا تھا۔ دھاگے کی خالی ریل کے ذریعے یہ ڈول چلتا ہوا نیچے جا کر اُس دھات کے ڈبے والے کنویں سے پانی بھرتا تھا۔ اس کے علاوہ گڑیا کے اُس گھر میں ہر اتوار کو ایک ہانڈی پکتی تھی اور ہم سب اُس کے لیے کام کرتے تھے' کوئی آلو دھوتا' کوئی آٹا گوندھتا' لڑکوں کو لکڑیاں چُننے کا کام دیا جاتا تھا اور پھر سب مل کر پکاتے اور کھاتے تھے۔

.....•.....•.....•

ہمارے خاندان کے زیادہ تر لوگ پیر کالونی میں آباد تھے۔ یہ ہمیں بہت عرصے کے بعد پتہ چلا کہ ایسا کیوں تھا۔ پیر الٰہی بخش مرحوم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے آنے والے اور خاص کر علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے یہ بستی پیر الٰہی بخش کالونی بسائی تھی۔ میرے پھوپھا اُن کے کلاس فیلو تھے جبکہ میرے تایا اور زیادہ تر رشتے دار علی گڑھ سے پڑھ کر آئے تھے' یقیناً اسی وجہ سے سب یہاں آباد ہوئے تھے۔ پیر الٰہی بخش صاحب ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور اکثر کھانے پر بھی مدعو ہوتے تھے' یہ سب مجھے بس خواب کی طرح ہی یاد ہے۔

آج کے دور میں Culinary Art expert اور expert in household tips زبیدہ آپا' میری کزن ہیں۔ اکثر شرارتوں میں وہ بھی میرا ساتھ دیتیں۔ ایک دن دوپہر کو ہم دونوں گھر سے اجازت لے کر اپنی کزن کے پاس روانہ ہوئے۔ اُس کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ راستے میں املی کا ایک درخت بھی تھا۔ اُس روز ہم دونوں نے دیکھا' املی کے درخت میں املیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کے منہ میں تو پانی آ گیا تھا اور ہم دونوں اپنی منزل بھول کر بڑی مشکل سے املی کے اُس درخت پر چڑھ گئے تھے مگر اوپر چڑھنے کے بعد ''انگور کھٹے ہیں۔'' والی مثال ہمارے سامنے آئی تھی۔ نیچے سے بہت قریب نظر آنے والی املیاں ہم سے بہت دور تھیں اور پھر غضب یہ ہوا کہ ہم دونوں درخت سے اترنے کا راستہ یا طریقہ بھول گئے تھے۔ اب آنے جانے والے لوگ ہم کو درخت پر چڑھا دیکھتے تو مگر ہم ڈر اور شرم کے مارے اُن سے نیچے اترنے کے لیے مدد بھی نہیں مانگتے تھے۔

ہم دونوں تقریباً تین گھنٹے سے درخت پر بیٹھے تھے' اُدھر ہماری وہ کزن جن کے گھر کا کہہ کر ہم لوگ گئے تھے' وہ ہمارے گھر پہنچ گئی تھیں۔ جب اُن کو یہ بتایا گیا تھا کہ زبیدہ اور رخسانہ تو تمہارے گھر گئی ہیں' جواباً اُن کے منہ سے یہ سن کر کہ ''وہ تو میرے

پاس آئی نہیں۔'' سب گھر والے سخت پریشان ہو گئے تھے پھر اڑوس پڑوس سب ہی گھروں سے لڑکے اور ہمارے گھر کے لوگ ہم کو ڈھونڈنے نکل پڑے تھے۔ اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم درخت پر دم سادھے بیٹھے تھے کہ ہمارے پڑوس کے ایک صاحب اِدھر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے آنے جانے والے لوگوں سے پوچھا تھا کہ آپ میں سے کسی نے دو بچیوں کو دیکھا ہے؟ اور پھر کسی نے اُن کو بتایا تھا کہ وہ جو املی کا درخت ہے' اُس پر میں نے دو بچیوں کو دیکھا ہے۔ بس آگے نہ پوچھیے' ہم درخت سے کیسے اترے تھے؟ گھر آ کر تو ہم بس منہ چھپا کر بیٹھ گئے تھے اور ہمیں گھر والوں کی طرف سے کی گئی لعنت ملامت کی آوازیں آ رہی تھیں..... ''ان لڑکیوں کے پاؤں بہت نکل گئے ہیں' ذرا ان کو کھینچ کر رکھیں''..... اور بھی نہ جانے کیا کیا ہمیں کہا گیا تھا' بس ایسا ہی سنتے سنتے ہم سو گئے تھے لیکن املیاں تو خواب میں بھی آ کر مجھ سے میرا حال پوچھتی رہی تھیں۔

دوسری صبح نیا دن شروع ہوا تھا تو ہم دونوں بہت تمیز دار بچے بن گئے تھے بلکہ کئی دن تک بڑے تمیز دار بنے رہے تھے۔ اسکول جاتے اور آتے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اسکول میں کیا پڑھتے تھے' وہ بالکل یاد نہیں۔ یہ سلسلہ کچھ روز چلا تھا پھر ہمارے بڑوں کو ہی خیال آیا تھا کہ کچھ ہلچل ہونی چاہیے' شاید انہیں ہمارا تمیز دار رہنا زیادہ برداشت نہیں تھا اس لیے ایک تحریک شروع ہوئی کہ بھئی' گڑیا کی شادی رچائی جائے جس میں نسیم کا گڈا اور رخسانہ کی گڑیا ہو گی مگر یہاں بھی میں نے پھر ضد سے کام لیا تھا کہ نہیں' گڈا ہمارا ہو گا۔

''تو پھر تم نسیم یعنی گڑیا کو واپس کر دو۔'' میں نے یہ بات مان کر گڑیا واپس کر دی تھی اور میرے لیے ایک گڈا بنایا گیا تھا۔

یہ شادی طے ہو گئی تھی تو امی نے کہا تھا۔ ''دیکھو بھئی رخسانہ' گڑیا کے کپڑے بہت اچھے ہونے چاہئیں ورنہ ہمارے گڈے کی بے عزتی ہو جائے گی۔ بس تو پھر گڑیا کے کپڑے دھڑا دھڑ سلنے لگے تھے اور اس میں سب نے بھرپور حصہ لیا تھا اور پھر شادی کا دن بھی آ گیا تھا۔ گڈے صاحب شیروانی پہنے سدا بہار کے پھولوں کا سہرا لگائے بہت پیارے لگ رہے تھے کہ اچانک پھوپھا نے مجھے بتایا تھا کہ گڈے نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور وہ ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ یہ سن کر تو میں نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ میرے پھوپھا نے ہنستے ہنستے ہی مجھے سمجھایا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تو ہم کیا کریں اور میری بے عقلی یا پھر بے وقوفی کا اندازہ کریں کہ روتی جاتی اور کہتی۔ ''اگر اسے شادی نہیں کرنا تھی تو ہمیں بتاتا' وہ گھر سے بھاگا کیوں؟''

یہ تماشہ کافی دیر تک ہوتا رہا تھا اور پھر جب میری دادی میرے رونے سے تنگ آ گئی تھیں تو پھر امی نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے پھوپھا صاحب کو کہو' وہ تو وکیل ہیں' گڈے کو منا کر لے آئیں گے۔ میں نے پھوپھا صاحب سے گڈے کو منا کر لے آنے کی درخواست کی تھی تو وہ بولے تھے۔ ''بھئی' ہماری فیس دس روپے لاؤ تو ہم مقدمہ لڑیں گے۔'' میں نے امی سے دس روپے لے کر پھوپھا صاحب کو دیئے تھے کہ گڈے صاحب سامنے آ گئے تھے۔ وہ دادی کے تکیے کے نیچے چھپے ہوئے تھے..... اور پھر بارات گئی تھی اور انور جو قاضی بنے تھے انہوں نے گڑیا گڈے کا نکاح پڑھوایا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ انہوں نے کہا تھا۔ ''میاں گڈے' تمہیں گڑیا قبول؟'' اور وہ گڑیا نسیم پھر میرے گھر آ گئی تھی۔ سب بزرگوں نے گڑیا کی منہ دکھائی دی تھی جو میں بٹورتی رہی تھی اور پھر ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب دوستوں نے ان پیسوں سے دعوت اڑائی تھی۔

•.....•.....•

آج ہم ایسی باتوں اور چیزوں سے بہت دور ہو گئے ہیں' بڑے اور چھوٹوں میں جنریشن گیپ آ گیا ہے جسے میں نہیں مانتی۔ آج اگر بڑے' بچوں کے موجودہ رویئے' بزرگوں کی عزت نہ کرنے کے حوالے سے لمبی لمبی تقریریں کرنے کے بجائے عملی طور پر بچوں کے ساتھ رہیں' اُن کے مسئلے اور خوشیاں شیئر کریں تو ہمارے درمیان موجود یہ مصنوعی فاصلے سمٹ سکتے ہیں اور اپنی روایات اور اپنی تہذیب کا دَرس بھی جاری رہ سکتا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے اپنی اقدار' روایات' وہ سب کچھ نہایت غیر محسوس طریقے سے ہمارے اندر اتار دیا جو وہ چاہتے تھے تو پھر آج کیا ہو گیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ کپڑے کی گڑیا کے بجائے اب پلاسٹک کی گڑیا آ گئی ہے مگر گڑیا تو موجود ہے..... وقت اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے' اب یہ ہمارے اوپر منحصر ہے کہ اسے کیسے کسی اچھے مصرف میں لائیں۔ میرے بچوں نے بھی گڑیا مانگی مگر میں نے وہ کچھ نہیں دہرایا جو ہمارے بزرگوں نے کیا تو پھر غلط تو ہم ہوئے ناں؟ اور یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے' غلطی مان لینا بھی تو بڑائی ہے۔ آج وہ سب ماضی کی باتیں یاد کرتے ہوئے مجھے بڑی شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم غلط ہیں۔ زمانے کی قدریں ضرور بدلتی رہتی ہیں اور ہمیشہ ایسا ہی ہو گا مگر ہمیں بچوں کو اس سیلِ رواں میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دسترخوان نہ سہی' ڈائننگ ٹیبل کا سہارا لے لیں' چلمن نہ سہی' پردوں کی آڑ سے سمجھائیں' چوکی نہ سہی' صوفے کا استعمال ہو مگر تربیت کا عمل جاری رکھنا چاہیے۔

میرے والد لینڈ کسٹمز میں تھے۔ وہ اپنی دوسرے مقامات پر پوسٹنگ کی وجہ سے اکثر ہم سے دور رہے مگر جب ہم اُن کے کھونٹی سے لٹکے ہوئے کوٹ میں منہ چھپا کر ایک خاص خوشبو سونگھتے تو یوں لگتا' ہم اُن کے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں اور پھر دل کو چین آ جاتا۔ میرے والد کو اکثر ایسی جگہ پوسٹنگ ملتی جہاں فیملی کو رکھنا مشکل ہوتا..... اب سے چند سال پہلے امریکا جانا ہوا تو وہاں ایک محفل میں ہمارے ایک بہت قریبی ملنے والے بھی موجود تھے۔ باتوں ہی باتوں میں میرے والد کا ذکر آیا تھا تو انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ تمہارے والد کی پوسٹنگ اکثر سزا کے طور پر ہی کی جاتی تھی کہ وہ راشی نہیں تھے' سو راشی لوگوں کی راہ کی رکاوٹ بن جاتے تھے اور ٹرانسفر و پوسٹنگ کی صورت یہ رکاوٹ ہٹائی جاتی تھی۔

ابا جب پوسٹنگ پر ہوتے تھے تو میں اکثر سوچتی تھی کہ ابا ہمارے بغیر کھانا کیسے کھاتے ہوں گے؟ اور پھر جب ابا چھٹی پر آتے تو میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ میں اُن کے ساتھ کھانا کھاؤں اور میں نے جو چیز بھی اپنے لیے شوق سے منگوائی ہوتی' وہ ابا کو زبردستی کھلاتی تھی' بس میرا جی چاہتا تھا کہ ابا جتنے دن ہمارے پاس رہیں' میں اُن کو اتنا کھلا دوں کہ وہ جانے کے بعد بھوکے نہ رہیں۔ بس میں اپنی سوچ کے مطابق' اپنے طور پر اُن کی مدد کے چکر میں رہتی تھی اور اس چکر میں بہت زبردست حماقت بھی سرزد ہو جاتی تھی۔ اس بات کی مثال یہ ایک واقعہ ہے۔

ابا کو بہت زیادہ پڑھنے کی عادت تھی۔ اکثر اوقات بس ایک چائے کا کپ اور کوئی کتاب اُن کی دنیا بن جاتی تھی۔ کسی ایسے ہی وقت میں ایک بار میں نے ابا کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا تو کچھ نوٹ نکل آئے تھے۔ میں فوراً ہی کریم کی ایک خالی شیشی جو میرے کھلونوں کی ٹوکری میں پڑی تھی' لے کر وہیں بیٹھ گئی تھی اور پھر جتنے نوٹ تھے' اُن کی باریک چندیاں کرتی رہی تھی جبکہ ابا اپنی دنیا میں یعنی کتاب میں مگن تھے اور پھر جب میں نے اپنے خیال میں ابا

کے نوٹوں میں ڈھیروں ٹکڑوں کی صورت اضافہ کر کے انہیں شیشی میں بھرنے کے بعد خوشی خوشی اُن کے سامنے رکھ دی تھی تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا اور پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولے تھے۔ ''واہ..... میری بیٹی نے تو بہت زیادہ پیسے بنا دیئے..... اب تو ہم کو نوکری کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔''..... آپ میری اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ خیال ہی میرے لیے بہت خوش کن تھا کہ ابا امیر ہو گئے اور اب ہمیشہ میرے پاس رہیں گے..... لیکن میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی۔

صبح میں اٹھی تو ابا پھر غائب تھے' وہ ہمیشہ مجھ سے چھپ کر جاتے تھے۔ میں نے گویا بستر سے نہ اٹھنے کی قسم کھائی تھی اور رونا شروع کر دیا تھا۔ مجھے سب نے سمجھایا تھا۔ ''بیٹا..... ابا تو چھٹی لے کر آتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں پھر تم کیوں روتی ہو؟''

میں نے جواباً روتے ہوئے کہا تھا۔ ''اُن کے پاس تو اب میری وجہ سے پیسے بہت زیادہ ہو گئے تھے اور خود انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ نہیں جائیں گے۔''

امی نے کہا تھا۔ ''تم نے تو اُن کے پیسے ختم ہی کر دیئے تھے۔''

تو میں نے چیخ کر کہا تھا۔ ''نہیں' یہ غلط ہے۔''

پھر امی نے مجھے بہت پیار کرنے کے بعد میرے سامنے ایک نوٹ کے دو ٹکڑے کیے تھے' وہ نوٹ کتنے کا تھا' یہ مجھے نہیں معلوم لیکن یہ یاد ہے کہ انہوں نے وہ آدھا نوٹ مجھے دے کر غلام رسول کے ساتھ بھیجا تھا کہ جاؤ' کچھ خرید کر لاؤ۔ میں دکان پر گئی تھی تو اُس دکاندار نے کہا تھا۔ ''بیٹا..... یہ نوٹ تو بے کار ہے' اس کا آدھا حصہ کہاں ہے؟ اور جب میں گھر واپس گئی تھی تو امی نے نوٹوں کی وہ چندیاں میرے سامنے رکھ دی تھیں۔ اب میرے غم کی نوعیت بدل گئی تھی اور میں شرمندگی میں دوبارہ چادر منہ میں دبا کر لیٹ گئی تھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی یاد آیا تھا کہ ابا مجھے بتائے بغیر چلے گئے ہیں' سو پھر رونا شروع کر دیا تھا کہ ابا مجھے بتائے بغیر کیوں چلے گئے؟

''وہ تو اکثر ایسے ہی جاتے ہیں' تمہیں اٹھاتے اس لیے نہیں کہ تم ہمیشہ روتی ہو اور وہ دکھی ہو جاتے ہیں۔'' امی نے مجھے پیار سے سمجھایا تھا۔

''اب ابا جب بھی جائیں' آپ مجھے جگا دینا' میں نہیں روؤں گی۔'' میں نے امی سے صرف وعدہ کیا ہی نہیں تھا' نبھایا بھی تھا۔

اُس زمانے میں بزرگوں کا بچوں کو سمجھانے کا انداز و طریقہ اس قدر سہل اور دوستانہ ہوتا تھا کہ اُس پر 'سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے' والے مشہورِ زمانہ محاورے کی مثال بھی صادق آ سکتی تھی۔

میں سدا بہار کے پھول بہت توڑتی تھی' پھول توڑنے کے بعد اُس کی ڈنڈی کے ساتھ ایک ننھا سا قطرہ موجود ہوتا تھا جسے میں اپنی زبان پر رکھتی تھی' شاید وہ میٹھا ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے ابا سے پوچھا تھا۔ ''یہ پھول کے ساتھ پانی کا قطرہ یا بوند کیوں ہوتی ہے؟''

''بیٹے..... یہ پھول کے آنسو ہیں۔'' ابا کا جواب سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے بہت تجسس سے پوچھا تھا۔

''پھول روتا کیوں ہے؟''

''آپ نے اسے اُس کی ماں سے الگ جو کر دیا' پودا اس کی ماں ہے' آپ نے اس کی گود سے اسے توڑا ہے۔''

اُف..... اُس وقت میرے ننھے سے دل پر جو چوٹ لگی تھی' وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ کافی دیر وہیں بیٹھی سدا بہار کے پودے کو دیکھتی اور افسوس کے ساتھ سوچتی رہی تھی کہ میں نے اُس پودے کا دل دکھایا ہے اور پھر اپنے دل میں یہ عزم لے کر اٹھی تھی کہ اب کبھی پھول نہیں توڑوں گی..... اور پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد اگر کبھی بے دھیانی میں پھول توڑنے کے لیے میرا ہاتھ بڑھا بھی تو مجھے فوراً پودے کا رونا یاد آیا تھا۔

بچوں کو سمجھانے، سبق سکھانے کے حوالے سے بزرگوں کی سمجھ داری کی ایک اور مثال بھی میں آپ کو بتانا چاہوں گی۔ وہ یہ کہ میرے پیارے مٹھو میاں امرود کے درخت پر لٹکے پنجرے میں اپنی بولیاں بول کر مجھے سب گھر والوں سے زیادہ خوش کرتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اسے پنجرے سے اڑا کر آزاد کردوں گی لیکن میرے بہت پیارے ابا نے اُس کو میرے ہاتھوں آزاد کروا دیا اور ایسے کروایا کہ اُس کے بعد میں نے اپنے بچوں کو ہمیشہ پرندہ پالنے سے منع کیا اور اگر کبھی کسی نے بچوں کو تحفے میں طوطا یا چڑیاں لاکر دیں تو میں نے اُسی طرح انہیں اڑوایا جیسے ابا نے میرے ہاتھوں طوطے کو اڑوایا تھا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ بھلا وہ کون سا نسخہ یا طریقہ تھا تو وہ میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔

علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لیے جو خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، وہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ انہی نظموں میں اُنؒ کی ایک مشہور نظم ''پرندے کی فریاد'' بھی ہے۔ میرے پیارے ابا نے وہ نظم سنائی تھی۔ اُس نظم کا مجھ پر اتنا اثر ہوا تھا کہ میں نے فوراً اپنے پیارے مٹھو کا پنجرہ کھول دیا تھا اور وہ پھر سے اڑ گیا تھا۔

''میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دُعا لے''

علامہ اقبالؒ کی نظم میں شعر کی صورت کی گئی یہ نصیحت میرے بہت کام آئی تھی اور پھر میرے بچوں کے بھی کام آئی اور انہوں نے گھر میں پرندہ نہیں پالا، تحفہ میں ملے پرندے بھی اُڑا دیئے تھے۔

•.....•.....•

عام طور پر یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ وقت بدل گیا ہے مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وقت نہیں بدلا بلکہ ہمارے رویئے بدل گئے ہیں۔ اچھے، بُرے لوگوں کا ساتھ ہمیشہ رہا ہے مگر آج برائی، اچھائی پر غالب آ گئی ہے، لہجوں میں نرمی ختم ہوگئی ہے، طور طریقے بدل گئے ہیں، بڑوں نے گھر سے باہر اپنی مصروفیات اتنی بڑھالی ہیں کہ گھر کی حیثیت صرف ایک سرائے کی سی رہ گئی ہے۔ بزرگ جو گھر کی رونق تھے اُن کو ایک کونے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگر تو آپ گھر کے بڑے بوڑھوں کو اُن کا اصل مقام نہ دیں تو پھر گھر قبرستان ہی لگتا ہے۔ وہ تو گھر میں ایک چراغ کی طرح ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ لو مدھم ضرور پڑنے لگتی ہے مگر اجالا کم نہیں ہوتا۔ باورچی خانے پر بھی نظر، گھر کی صفائی کرنے والے یا والی پر نگاہ، چلتے پھرتے اتنا قرض ضرور ادا کرتے رہتے ہیں، جو اُن کے بڑوں نے انہیں تربیت کی صورت دیا تھا۔

میں نے امریکا میں یہ ویرانی دیکھی..... زندہ قبریں دیکھ کر بڑی وحشت ہوئی لیکن اب ہم بھی تو اُسی راستے پر چل رہے ہیں۔ ہماری تہذیب کا سنہرا چراغ مدھم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ دَرسِ انسانیت بھول رہے ہیں جو اللہ نے حضور ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچایا۔ انہوں نے عمل کر کے بتایا مگر ہم تو پیسے کی دوڑ میں اپنی معاشرتی اقدار، روایات اور مذہبی احکامات بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ روپیہ پیسہ یقیناً انسان کی ضرورت ہے لیکن ہر ضرورت کو ایک خانے میں قید رکھنا چاہیے، مگر اس کو تو ایک ایسے عفریت کی شکل دے دی گئی ہے جو ہر چیز پر غالب آ گیا ہے۔ مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے، یہی سمجھ آ رہا ہے۔ باقی اللہ جانے!!

''یادوں کے اوراق'' کی دوسری قسط آئندہ ماہ کے شمارے میں شامل ہوگی

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی، جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

شازلی سعید مغل

تاثون

حزیں صدیقی کا خیال

عالمِ رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے، بہت خاص سلسلے کی اٹھارویں کڑی

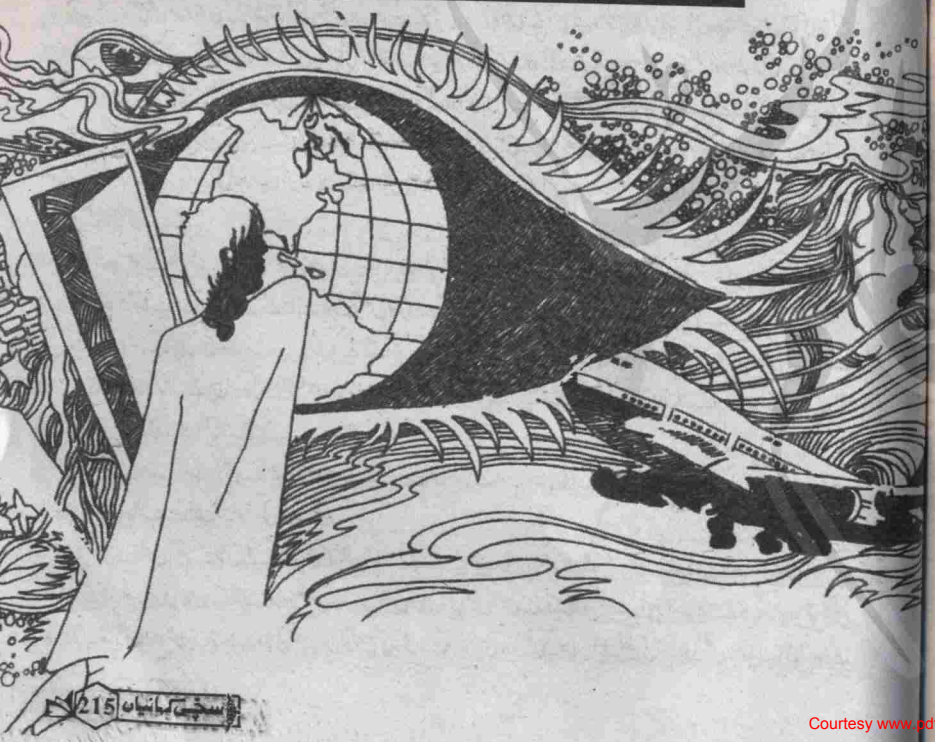

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاصہ

''تاشون''.....ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ رُوحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ذوالفقار صہبائی عرف زلفی تاشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آجاتی ہے۔صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جارہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آکر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھ ستی کے زیرِاثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِفہرست ہے۔مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔اپنے اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہوگئی تھی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہوا تھی' اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے' تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔اِدھر تاشون' زلفی کے دوست شہباز سولنگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آرہا ہے۔

راحت چچا نے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تاشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر یکسن کا آسیب تھا۔زلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

تاشون نے ایک نہایت دلکش سے مضافاتی مقام پر ایک نہایت خوبصورت فارم ہاؤس بنایا ہے جہاں دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا ہے۔یہاں اسے سیل شیا کی جانب سے ایک تحفہ موصول ہوتا ہے۔

تاشون نے اُس تحفے کے حوالے سے بتایا تھا کہ سیل شیا بدلے کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہے اور اُس رات کو ہی فارم ہاؤس پر تاشون کے ڈرائیور پیرل خان کے ایک مہمان مکھن خان کی چیخیں سنائی دی تھیں جس نے ایک روح سندوتی پر قبضہ جمانے کا چکر چلایا تھا لیکن ناکام ہو گیا تھا۔اُسے تاشون نے نجات دلائی تھی۔ان لوگوں کی زلفی کے گھر واپسی ہوئی تھی۔جہاں ایک فقیر کی آمد ہوئی تھی، جو کہہ رہا تھا ''دولت

کی دولتیں، سب دھری رہتی ہیں باتیں'' پھر اس فقیر نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

(اب آپ آگے پڑھیے۔)

فقیر نے بڑی گہری بات کہی تھی کہ دولت کی آمد سے ایک لات سامنے سینے پر پڑتی ہے تو بندے کی گردن میں فرعونی اکڑ آجاتی ہے اور جب دولت رخصت ہوا چاہتی ہے تو کمر پر لات مار کر رخصتی کی رسم پوری کرتی ہے اور بندہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔فقیر کی گدڑی میں یہ فلسفہ لعل و گہر کے برابر تھا۔وہ یہ سب کہہ کر جا چکا تھا۔

''آج کی دنیا میں ایسے سچے فقیر کہاں ملتے ہیں؟'' رانیہ نے ایک لمبی سانس لے کر کہا تھا۔وہ اُس فقیر کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

وہ لوگ بہت دیر تک فقیر کو ڈسکس کرتے رہے تھے۔مکیا ناشتے کی میز سمیٹ چکی تھی۔تاشون' زلفی کے ساتھ ہی اس کے آفس کی طرف نکل گیا تھا۔اب گھر میں مونگا' رانیہ اور مکیا ہی تھے۔مکیا چھت پر سے وہ سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے گئی تھی جو اُس نے گزشتہ روز دھو کر ڈالے تھے۔وہ آج بھی کپڑے دھونے کا کام کرنا چاہ رہی تھی لیکن رانیہ نے منع کر دیا تھا' چنانچہ وہ سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے چھت پر چلی گئی تھی جبکہ رانیہ اور مونگا کچن میں مصروف تھیں۔ان کے درمیان ہلکی پھلکی باتیں چل رہی تھیں کہ اچانک مکیا تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے لڑھکتی نیچے آپڑی تھی۔مکیا کو اس حال میں دیکھ کر رانیہ کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟'' رانیہ نے بدحواس مکیا سے پوچھا تھا اور پھر مونگا اور رانیہ نے مکیا کو سہارا دے کر اٹھانے کے بعد لاؤنج میں پڑے صوفے پر بٹھایا تھا۔مکیا اپنا گھٹنا پکڑے مسل کر راہ رہی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں' بولو تو کچھ؟'' مونگا نے مکیا کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا تھا جبکہ مکیا خالی الذہنی' خالی خالی نظروں سے کبھی چھت پر جاتی سیڑھیوں کو دیکھتی اور کبھی لاؤنج میں چاروں جانب دیکھنے لگتی۔پانی کا گلاس اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔

''پانی پیو شاباش.....!'' مونگا نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا تو مکیا جیسے چونک پڑی تھی۔اس نے پانی کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر دیا تھا۔

''کچھ دیکھا ہے تم نے؟'' مونگا نے مکیا کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں' ہاں۔'' مکیا زور زور سے اپنا سر اثبات میں ہلانے لگی تھی اور پھر یکا یک تعجب سی بولی تھی۔''کیا ہوا؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا' میں نے کچھ نہیں دیکھا۔''

''تو پھر پاگلوں کی طرح زینہ کیوں اتریں کہ لڑکھڑا کر دھڑام سے نیچے آگریں تم؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی تمہارے پیچھے آرہا ہو؟ سچ سچ بتاؤ' کیا ہوا تھا؟''

پانی پی کر مکیا کے اوسان کچھ بحال ہوئے تو اُس نے بولنا شروع کیا تھا۔''میں کپڑے لینے چھت پر گئی تھی' میں جب اوپر والے بند کمرے کے لاک دروازے کے پاس سے گزری تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے اندر کوئی ہے اور وہ رو رہا ہے' رونے کی آواز سن کر میں گھوم کر اس بند کمرے کی کھلی کھڑکی کے پاس گئی تو میں نے دیکھا تھا' وہ ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی' جو رو رہی تھی لیکن جیسے ہی اُس نے مجھے دیکھا تھا' وہ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی تھی۔خوف کے مارے میں نے چیخنا چاہا تھا مگر میری آواز جیسے بند ہو گئی تھی' بس میں فوراً نیچے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور پھر جو کچھ بھی ہوا تھا' مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' یہ بات بتا کر مکیا نے ایک کراہ کے ساتھ اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھٹنا پکڑ لیا تھا۔

''آؤ رانیہ' چل کے دیکھتے ہیں۔'' مونگا نے فوراً ہی اوپر چھت پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''نہیں' میں اوپر نہیں جاؤں گی' میرا تو خیال یہ ہے کہ ہمیں زلفی کو فون کرنا چاہیے۔''

''وہ بھی کر لیں گے لیکن پہلے اوپر چلتے ہیں۔ تم بھروسہ رکھو میں ہوں نا یہاں پر۔'' مونگا نے رانیہ کو تسلی دی تھی۔

مونگا اور اس کے پیچھے رانیہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چھت پر پہنچ گئے تھے۔ رانیہ تو ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی جبکہ مونگا نے چھت اور وہاں موجود کمرے کے چاروں اطراف گھوم پھر کر دیکھ لیا تھا۔ اسے کوئی ایسی ویسی بات نظر نہ آئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی کمرے کے چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

یہ کمرا دراصل ایک چھوٹا سا بیڈ روم تھا جو استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے بند رہتا تھا۔ رانیہ ہفتے میں ایک بار اس کی صفائی ستھرائی کرا دیا کرتی تھی۔ اُس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے کہ کمرے میں تازہ ترین صفائی ستھرائی کرائی گئی ہو۔ وہ دونوں جوں ہی اندر داخل ہوئی تھیں' گلابوں کی دلفریب خوشبو نے ان کا استقبال کیا تھا اور پھر چند سیکنڈ بعد وہ خوشبو یکا یک معدوم ہو گئی تھی۔ مونگا نے ایک نہایت گہرا سانس لے کر کہا تھا۔

''چلو رانیہ' اب یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''اب کوئی نہیں؟ یعنی پہلے تھا۔'' یہ کہتے ہوئے رانیہ کے چہرے پر خوف کی لہر ہویدا تھی۔

''چلو' نیچے چلیں۔'' مونگا نے رانیہ کی بات کے جواب میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا اور پھر کمرہ لاک کر کے وہ دونوں فوراً ہی نیچے آ گئی تھیں۔

نیچے مکیا اپنے گھٹنے کی ٹکور کر رہی تھی' وہ دونوں بھی لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی تھیں۔ رانیہ جو بہت زیادہ متفکر نظر آ رہی تھی' فون کی طرف بڑھی تھی۔ ''میں زلفی کو فون کرتی ہوں۔''

''ارے بھئی' ابھی رہنے دو' ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' مونگا نے اس کے ہاتھ سے فون کا ریسیور لے کر کریڈل پر رکھا تھا..... اور پھر مونگا نے رانیہ کے ساتھ مل کر کچن کا کام سمیٹا تھا کیونکہ مکیا کو اس کے گھٹنے کی تکلیف کے پیشِ نظر رانیہ نے آرام کرنے بھیج دیا گیا تھا۔

اُس دوپہر کو رانیہ نے آرام بھی نہ کیا تھا۔ رانیہ کی پریشانی اور خوف کے پیشِ نظر مونگا نے ساری دوپہر اس کے ساتھ گزاری تھی' تقریباً شام کا وقت ہو رہا تھا جب باہر زلفی کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ رانیہ تیزی سے گیٹ کی جانب لپکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گیٹ تک پہنچتی' اُسے تاشون اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ زلفی نے چند دن پہلے ہی گیٹ پر نیا چوکیدار رکھوایا تھا' اُس وقت گیٹ اُسی نے کھولا تھا۔

رانیہ اور تاشون لان میں موجود کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ مونگا اسی اثنا میں چائے بنا لائی تھی۔

اُس وقت تو چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔ تاشون نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا تھا اور پھر چائے کے دوران میں مونگا نے وہ تمام واقعہ تاشون کے گوش گزار دیا تھا جو صبح اُس گھر میں رونما ہوا تھا۔

''اوہ.....'' تمام صورتِ حال سن کر تاشون کے منہ سے نکلا تھا۔ ''میں اوپر جا کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اوپر چھت پر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ ''مگر آپ لوگ میرے پیچھے پیچھے مت آیئے۔'' تاشون نے سخت لہجے میں ہدایات دی تھیں تو مونگا اور رانیہ کے قدم جہاں تھے' وہیں رک گئے تھے ورنہ اُن دونوں کا ارادہ تاشون کے

ساتھ جانے کا تھا۔

تاشون سیڑھیاں چڑھ گیا' اوپر پہنچ کر سب سے پہلے تو وہ دروازہ بند کیا تھا جو چھت پر آنے والی سیڑھیوں کے خاتمے پر لگا تھا پھر اُس نے چھت کے بارہ چکر کاٹے تھے اور ہر چکر کے دوران وہ اپنی زمردی تسبیح پر کچھ پڑھتا اور چھت کا حصار باندھتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کمرے یا بیڈ روم میں آیا تھا جہاں مکیا نے کسی لڑکی کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاشون نے کمرے میں داخل ہو کے پہلے کمرے کی کھڑکیوں کے ساتھ ایک چکر لگایا تھا اور پھر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر زیرِ لب آیاتِ قرآنی کا وِرد کرنے لگا تھا۔ اَب عصر کا وقت ختم ہوتا جا رہا تھا اور مغرب کی اذان کا وقت ہو چلا تھا اور پھر جیسے ہی اذان ختم ہوئی تھی' تاشون نے وہیں کمرے میں قبلہ رخ ہو کر نماز کی نیت باندھ لی تھی اور نماز سے فارغ ہو کر اس نے جونہی سلام پھیرا تھا' اُسے کمرے کے ایک کونے میں سفید لباس میں ملبوس ایک لڑکی روتی' سسکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

تاشون نے پورے جذب اور قلبی سکون سے دُعا مانگنے کے بعد جائے نماز کا کونہ موڑ دیا تھا مگر وہ جائے نماز سے اٹھا نہیں تھا۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے گرد ایک حصار کیا تھا اور پھر اپنی شہادت والی انگلی پر کچھ پڑھ کر اُس سے لڑکی کی طرف کچھ اشارہ کیا تھا۔ وہ یکلخت چپ ہو کر تاشون کی جانب ایک ٹک دیکھنے لگی تھی۔

''کون ہو تم؟'' تاشون نے نہایت نرمی سے پوچھا تھا' جواباً وہ ایک ٹک تاشون کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بیس' بائیس سالہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر کرب کے ایسے آثار تھے جیسے کسی شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔

تاشون جان چکا تھا کہ وہ ایک روح ہے۔ اَب وہ اُس کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ ''ڈرو نہیں' مجھے بتاؤ' تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' اَب وہ تاشون کے قریب آنے لگی تھی مگر چند قدم کے بعد ہی جیسے اسے کرنٹ سا لگا' وہ رک گئی تھی کیونکہ تاشون نے اُس کی حد بندی کی ہوئی تھی۔

''بس' بس' وہیں رک جاؤ' پرسکون رہو' ڈرو نہیں اور مجھے اپنے بارے میں بتاؤ؟''

''میں..... میں شائل ہوں۔'' بہت مہین سی آواز اس کے گلے سے نکلی تھی۔ ''بہت دور سے آئی ہوں' مجھے مدد چاہیے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا' میں یہاں کیسے آ گئی ہوں' شاید میں رستہ بھول گئی۔ میں تو اپنے بھائی کو ڈھونڈنے جا رہی تھی' میرا بھائی!'' پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ ''میرا بھائی!'' اور پھر اُس کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں' آنسو تواتر سے اُس کے گال بھگوئے جا رہے تھے' یوں روتے روتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبایا تھا۔ اس کے سر میں پیچھے کی جانب گہری چوٹ کا نشان تھا۔

تاشون نے کچھ پڑھ کر اُس کی طرف ایک پھونک ماری تھی تو وہ پرسکون ہو گئی تھی۔ ''ہاں' اب بتاؤ' کیا ہوا تمہارے ساتھ؟''

''مجھے ایک لال رنگ کی گاڑی نے ٹکر ماری تھی اور میں شاید مر چکی تھی.....'' یہ کہہ کر وہ اپنا جسم ٹٹولنے لگی تھی۔

''شاید نہیں' تم یقیناً مر چکی ہو۔'' تاشون بہت رسان سے بولا تھا۔

''اوہ..... میں تو مر بھی چکی۔'' وہ تاسف سے بولی تھی۔ ''مگر اب میرے بھائی کو کون ڈھونڈے گا؟ وہ بے چارہ تو بہت اذیت میں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہم ڈھونڈیں گے تمہارے بھائی کو تمہیں اسی لیے مہلت دی گئی ہے اور یہاں بھیجا گیا ہے' تم یہاں آئی نہیں ہو بلکہ لائی گئی ہو۔'' تاشون کا لہجہ بہت نرم و شفیق تھا۔

''ہاں' جیسے ہی گاڑی نے مجھے ٹکر ماری تھی' مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے ایک گہرے کنویں سے مجھے باہر نکالا ہو اور پھر میں نے خود کو یہاں اس کمرے میں پایا تھا۔''

''تم ایک روح ہو اور روح کو کبھی بھی موت نہیں آتی' موت جسم کو آتی ہے۔ تمہیں تمہارے جسم سے کھینچ نکالا گیا ہے جبکہ تکلیف تمہیں اس لیے محسوس نہیں ہوئی کہ تمہارے سینے میں قرآن محفوظ ہے۔ تم حافظ قرآن ہو۔''

''ہاں' ہاں' تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تاشون کی بات سن کر بولی تھی اور پھر یکا یک اُس نے نہایت خوش الحانی سے قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ تاشون تلاوتِ قرآن کے احترام میں مؤدب ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد روح نے تلاوت ختم کی تھی اور تاشون سے سوال کیا تھا۔ ''میرے جسم کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟''

''شائل' تم فکر مت کرو' تمہارے جسم کو وہاں سے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے مگر ہم تمہارے جسم کے ساتھ کاٹ پیٹ نہیں ہونے دیں گے کیونکہ تمہارے سینے میں قرآنِ کریم فرقانِ حمید محفوظ ہے۔ بے حرمتی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ جسم میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جائے گا۔'' تاشون نے شائل کو تسلی دی تھی۔

''مگر میرا بھائی؟'' شائل کی آواز میں ایک بے قراری سی تھی۔

''اے نیک روح!'' تاشون نے شائل کو نہایت احترام سے پکارا تھا۔ ''مجھے اپنے بھائی کے بارے میں سب کچھ بتاؤ' میں تمہاری مدد کروں گا۔'' تاشون کی نرمی اور تسلی بھرے انداز نے شائل کی روح کو بہت تسکین پہنچائی تھی اور پھر وہ گویا ہوئی تھی۔

میں اور میرا بھائی' ہماری کہانی یہ ہے کہ میرے ماں باپ کب گزرے' مجھے نہیں پتہ' میں نے تو جب ہوش سنبھالا' اپنے بھائی کو ہی ماں اور باپ کے روپ میں دیکھا' وہ مجھ سے دس سال بڑا تھا' میرا ہر کام وہی کرتا تھا' ہمارا گاؤں بہت دور پہاڑوں کے درمیان ہے' ہمارے گاؤں اور ارد گرد کے قصبوں میں انگوروں کی کاشت کی جاتی ہے' وہاں زیادہ تر لوگوں کا ذریعۂ معاش یہ ہی ہے۔ میرا بھائی بھی انگوروں کی کاشت کا کام بہت زبردست طریقے سے جانتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بھی اپنے بھائی کی کاشت کاری میں مدد کرنے لگی تھی۔

ایک دن ہمارے گاؤں میں ایک بڑا زمیندار آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کو ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جو انگوروں کی کاشت کا ماہر ہو۔ اسے جب خبر ملی کہ میرے بھائی سے زیادہ اچھی انگوروں کی کاشت پورے گاؤں میں اور کوئی بھی نہیں کر سکتا تو وہ میرے بھائی کو اپنے ساتھ یہ کہہ کر لے گیا کہ وہ اسے اتنے پیسے دے گا کہ ہمارے دن بدل جائیں گے اور پھر ہم کسی اور کے باغ میں کام نہیں کریں گے بلکہ اپنا چھوٹا سا انگوروں کا باغ لگا لیں گے۔ اُس نے میرے بھائی کو پتہ نہیں' کون کون سے خواب دکھائے تھے کہ وہ میرا بھائی جو مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑتا تھا' وہ ہی مجھے برابر میں رہنے والی زینت چاچی کے حوالے کر گیا کہ وہ اس کے آنے تک میرا خیال رکھیں اور انہوں نے ایسا کیا بھی تھا۔ زینت چاچی اپنے بچوں سے زیادہ میرا خیال

رکھتی تھیں۔

میرے بھائی نے گاؤں سے جا کر ہر مہینے میرے لیے خرچ کے پیسے ہی نہیں بھیجے تھے' وہ ہر ہفتے پندرہ دن بعد ایک خط بھی بھیجتا تھا لیکن پھر اچانک یہ سب کچھ بند ہو گیا تھا۔ ان حالات میں' میں بہت پریشان تھی' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کروں؟ اور پھر یونہی تین مہینے سے زیادہ گزر گئے تھے اور بھائی کی کوئی خبر نہ آئی تھی۔

ایک دن میں اپنے بھائی کے لیے بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ بڑی شدت کے ساتھ اُسے یاد کر کے روئی تھی۔ میں اُس وقت کچے صحن میں اپنی چارپائی پہ لیٹی تھی۔ کافی رونے کے بعد میرا دل تھوڑا ہلکا ہوا تھا۔ میں چپ تو ہو چکی تھی لیکن اب بھی اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہی تھی پھر جو اچانک میں نے کروٹ بدلی تھی تو میں نے اپنے بھائی کو چارپائی کے پاس کھڑے پایا تھا۔ میں بھائی کو دیکھ کر خوشی اور حیرت کے مارے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی طرف لپکی تھی تو اس نے مجھے وہیں روک دیا تھا۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تھا تو اُس نے کہا تھا۔ ''بس تم میری بات غور سے سنو۔''

ایک تو اتنے دن بعد بھائی گھر آیا تھا اور پھر ایسا اجنبی برتاؤ..... وہ شکل سے بھی بہت رنجیدہ اور شدید کرب میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بہت محبت اور بے تابی سے پوچھا تھا۔ ''بھائی.....! تم کہاں تھے؟''

اُس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے بہت سپاٹ لہجے میں کہا تھا کہ ''شائل' میری بات دھیان سے سنو۔ مجھے جو زمیندار اپنے ساتھ انگوروں کی کاشت کے لیے لے گیا تھا' وہ ایک بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے میرے ساتھ بے ایمانی کی تھی' تنخواہ کے بارے میں میرا اس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے پاس کام نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اس سے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کر دیا تھا۔ زمیندار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' مشتعل ہو کر گوشت کاٹنے والی ایک لمبی چھری میرے سینے میں گھونپ دی اور پھر میرا سر بدن سے جدا کر کے وہیں گاڑ دیا اور لاش کے تین ٹکڑے کر کے اپنی حویلی کے پیچھے دبا دیئے اور میرے خون آلود کپڑوں کو آگ لگا دی۔ اس زمیندار کا گھر ایک بڑے سے درخت کے پاس ہے اور یہ درخت بڑا جھاڑ دار ہے اور گاؤں میں داخل ہوتے نظر آ جاتا ہے۔'' اتنا کہہ کر میرا بھائی ایک دم نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں اپنے بھائی کے منہ سے خود اس کی موت کی خبر سن کر چیخنے لگی تھی۔ آس پاس کے گھروں سے لوگ آ گئے تھے اور میں نے جو دیکھا اور سنا تھا' وہ ان سب کو بتا دیا۔ میری بات سن کر لوگوں نے میرا بہت مذاق اڑایا تھا اور اکثر نے کہا تھا۔ میں بھائی کے صدمے میں پاگل ہو گئی ہوں جو ایسی باتیں کر رہی ہوں اور پھر میری حالت واقعی پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ گاؤں کے لوگ کبھی کسی سے میرا علاج کراتے' کبھی کسی سے' میں پاگل نہیں تھی مگر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ میرا بھائی مرنے کے بعد میرے پاس آ سکتا ہے اور اپنے قتل اور قاتل کے بارے میں بتا سکتا ہے پھر ایک دن میں خود ہی بھائی کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی اور پہاڑ سے اتر کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ میں اپنی ہی دھن میں چلتی جا رہی تھی کہ ایک لال رنگ کی گاڑی نے مجھے ٹکر ماردی اور پھر میں یہاں پہنچ گئی تھی۔ تم فوراً میری مدد کرو' میرا بھائی بھی مدد کا منتظر ہے۔'' کمرے میں شائل کی سسکی پھر ابھری تھی۔

''میں کرتا ہوں کچھ' تم اب پرسکون رہو۔'' تاشون نے اسے پھر نرمی سے تسلی دی تھی۔ ''تم اور تمہارا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے اور دوسری دنیا میں منتقل ہونے میں تمہیں وقت ہے۔ میں تمہیں تمہارے اصل ٹھکانے تک پہنچانے میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم فی الحال یہیں رکو مگر کسی کو دکھائی مت دینا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی اچھا۔'' شائل نے نہایت مؤدبانہ انداز میں کہا تھا پھر تاشون نے کمرے کے باہر آ کر زیرِ لب کچھ پڑھا تھا اور دروازے کے ہینڈل پر ایک پھونک مارنے کے بعد نیچے جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے تھے۔

زلفی کی آمد ہو چکی تھی۔ رانیہ اسے آج کا واقعہ بتا چکی تھی۔ زلفی اب فکرمند اس لیے تھا کہ تاشون اتنی دیر سے اوپر ہے اور کسی کو بھی اس نے اوپر آنے سے منع کیا ہوا ہے حتیٰ کہ مونگا کو بھی اور پھر ان کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں جب انہوں نے تاشون کو اوپر سے آتے دیکھا تھا۔

تاشون نیچے آیا تو اس نے سب کو اپنا منتظر پایا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس سے کیا جاننا چاہتے تھے۔ ''زلفی، میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ تم عمر کو بلا لو، ہمیں کچھ ضرور کام کرنے ہیں اور ہاں، بھابھی.....!'' تاشون نے اب رانیہ کو مخاطب کیا تھا۔ ''گھبرانے اور پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں جو آپ سمجھ رہی تھیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' تاشون کا اشارہ سیل شیا کی طرف تھا کیونکہ رانیہ صبح ہونے والے واقعے کو سیل شیا کی کارستانی سمجھ رہی تھی۔

تاشون نماز سے واپس آیا تو ٹیبل پر کھانا تیار تھا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اسی دوران عمر کی بھی آمد ہو گئی تھی پھر تاشون نے انہیں مختصراً شائل اور اُس کے بھائی کی کہانی سنائی تھی، اس کہانی کو سن کر سوائے مونگا کے، سب حیران ہو گئے تھے۔ باتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ پری زاد کی بھی آمد ہو گئی تھی جسے صرف تاشون اور مونگا نے ہی محسوس کیا تھا۔ پری زاد کو تاشون نے شائل کے کیس میں مدد کے لیے خصوصی طور پر طلب کیا تھا اور پھر پری زاد منٹوں میں زمیندار کا پتہ لے آیا تھا اس کے بعد زلفی نے پولیس کو گمنام فون کر کے زمیندار کے جرم سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے گاؤں کا پتہ دیا تھا، یوں تقریباً آدھی رات کو اس دردناک داستان کا ڈراپ سین ہوا۔ جب پری زاد نے پولیس کے وہاں پہنچنے پر زمیندار کے دماغ پر قبضہ کر کے اُس سے وہ جگہیں دوبارہ کھدوائیں جہاں شائل کے بھائی کا سر اور جسم کے ٹکڑے دبائے گئے تھے اور پھر زمیندار نے فوراً ہی اقبالِ جرم کر لیا تھا۔

☆.....☆

فجر کی نماز کے بعد تاشون عمر اور زلفی، پری زاد کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تھے۔ پری زاد کے قبیلے کی عورتوں نے شائل کے جسدِ خاکی کو نہلا دھلا کر کفنا دیا تھا۔ قریبی مسجد میں فجر کے بعد نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور پھر شائل کو سپردِ خاک کر دیا گیا تھا اور اس کے اگلے دن شائل کے بھائی کو بھی پورے اسلامی طریقے سے سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد دونوں بہن بھائی کی ارواح ایک مرتبہ پھر تاشون کے پاس آئی تھیں اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی اصل منزلوں کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔

''کیا مرنے کے بعد واقعی کوئی یوں اپنے قاتل کو سزا دلوا سکتا ہے؟'' رانیہ کو اپنے گھر میں شائل کے حوالے سے پیش آنے والے پراسرار واقعے سے جڑا یہ سوال بہت پریشان کر رہا تھا۔

''ہاں بھابھی! ایسا اکثر ہوتا ہے کیونکہ مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے۔ موت صرف مٹی کے بنے جسم کو ہی آتی ہے، روح کو نہیں چنانچہ اگر روح چاہے تو وہ ہم سے مل بھی سکتی ہے، ہم کلام بھی ہو سکتی ہے مگر بہت ہی خاص حالات میں ایسا ہوتا ہے جیسا کہ اُس بے چاری لڑکی شائل کے ساتھ ہوا۔ وہ لڑکی بہت پریشان تھی، اکیلی تھی، بھائی کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا کیونکہ اس کا مقتول بھائی اپنی بہن کی حالت پر بے چین تھا، چنانچہ اُس کی روح نے آ کے اُسے اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا تھا۔ اسی طرح خاص خاص

حالات میں روحیں اللہ کے حکم سے دنیا میں آ کر اپنے نہایت قریبی عزیزوں اور پیاروں کو تسلی و تشفی بھی دے جاتی ہیں یا غیر فطری موت سے ہم کنار ہونے والوں کی روحیں بھی اپنے ساتھ ڈھائے گئے مظالم پر انصاف کے حصول کی خاطر دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ یہاں سے اُس وقت تک نہیں جاتی ہیں جب تک انہیں سکون نہ مل جائے جیسا کہ شائل کے ساتھ ہوا، وہ بھائی کو تلاش کرنے نکلی اور خود بدقسمتی سے ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور پھر یہاں پہنچ گئی تھی۔'' تاشون نے اپنی بات ختم کی تھی۔

''بھئی، مجھے تو اپنے اوپر غرور سا ہونے لگا ہے کہ میرا یار تاشون زندہ انسانوں کے ہی نہیں بلکہ دنیا سے چلے جانے والے مظلوم انسانوں کے بھی مسئلے حل کرتا ہے، ان کے بھی کام آتا ہے۔'' زلفی نے تاشون کے کندھے پر پیار سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا اب بس بھی کرو، میری اتنی تعریف نہ کرو، میرا تو کام ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مدد سے میں بنی نوع انسان کے کام آؤں، چاہے وہ زندہ ہو یا مُردہ یا پھر کوئی اور بھی مخلوق کیوں نہ ہو۔'' تاشون نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی اور مخلوق؟ تمہارا مطلب؟'' عمر نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''ہاں عمر، تم صحیح سمجھے، کوئی اور بھی مخلوق اور ایسا ہو بھی چکا ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ابا جان زندہ تھے اور میں اُن کے زیرِ سایہ علوم کی اس پراسرار دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ وہ واقعہ میری اس پراسرار دنیا سے تعلق کے بعد پہلا نہایت ہی انوکھا تجربہ تھا۔ میں اپنے ساتھ پیش آنے والے اَن گنت واقعات اور پرتحیر پراسرار چیزوں کو اس دنیا میں ایک الگ سا مقام دیتا ہوں۔''

''وہ انوکھا واقعہ کیا تھا؟ کچھ بتائیں نا، بھائی صاحب!'' رانیہ کی دلچسپی حد سے سوا تھی۔

''وہ واقعہ پھر کبھی سہی۔'' تاشون نے بات ٹالنا چاہی تھی۔

''بتا دو ناں، تاشون، وہ صنوبر کے جنگل کا واقعہ، وہ واقعہ تو میں بھی آج تک نہیں بھولی۔'' مونگا نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''یعنی تمہیں بھی اب تک یاد ہے میرا وہ پہلا پروجیکٹ؟'' تاشون بھی مسکرایا تھا۔

''تو اور کیا، بہت سچی سا تھا وہ واقعہ اسی لیے میں نہیں بھولی۔''

''ہاں مونگا، صنوبر کے وہ جنگل تو میں بھی نہیں بھولا اور وہ محبت اور وفا، یہ سچ ہے کہ ہم انسانوں سے زیادہ محبت، وفا اور وعدے کی پاسداری دوسری مخلوقات میں ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ صنوبر کا جنگل تھا جو دوپہر کی تیز دھوپ میں سائیں سائیں کر رہا تھا اور میری منزل ایک مزار تھا۔ صاحبِ مزار بابا ضرواری کے نام سے مشہور تھے۔ صنوبر کے اُس جنگل کو عبور کرتے اور مزار تک پہنچتے پہنچتے کافی تھکن ہو جاتی تھی مگر زائرینِ عقیدت مند جب مزار تک پہنچتے تو اُن کی یہ تھکن، راحت میں بدل جاتی تھی۔ مجھے بھی ابا جان نے بابا ضرواری کے مزار پر حاضری دینے کے لیے بھیجا تھا۔ یہاں میں والد صاحب کے ایک قریبی دوست ملک جہانگیر کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اُس روز میں جب مزار پر حاضری دے کر واپس ہوٹل پہنچا تھا تو اندھیرا پھیل چکا تھا، ہوائیں طویل القامت درختوں سے الجھ رہی تھیں، بھوک مجھے بالکل نہیں تھی۔ بھوک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک ملنگ بابا جو مجھے بچپن سے جانتے تھے، وہ مجھے اپنی درختوں کی چھال سے ڈھکی جھونپڑی میں لے گئے تھے اور میری بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھی طرح خاطر تواضع کی تھی اور آتے آتے بڑی مزے دار سبز چائے بھی پلائی تھی' چنانچہ بس میں اُس وقت سونا چاہتا تھا لیکن میں ابھی کمرے میں آ کر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی' میں نے کسلمندی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ دیکھا تو ہوٹل کے مالک ملک جہانگیر اور ہیڈ ویٹر دروازے پر کھڑے تھے۔ ملک جہانگیر بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی انہوں نے بڑی عاجزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور بولے تھے۔

''بیٹا تاشون! مجھے پتہ ہے' بہت رات ہو رہی ہے مگر بات ہی کچھ ایسی ہے۔ ابھی گھر سے ایک بندہ آیا ہے' وہ خبر یہ لایا ہے کہ پتہ نہیں' میری بیٹی عاشی کو دوپہر سے کچھ ہو گیا ہے اور اس وقت تو وہ آپے سے باہر ہو رہی ہے۔ یہ ہیڈ ویٹر صادق ان چیزوں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہے' کہہ رہا ہے کہ میری بیٹی عاشی پر کسی چیز کا سایہ ہوا ہے۔'' ملک جہانگیر نے ویٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میری خوش قسمتی تو یہ ہے کہ تم موجود ہو یہاں ورنہ یہ زیارت تو ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن ہے' یہاں کسی عامل کامل کا ملنا معجزے سے کم نہیں۔ چلو بیٹا' چل کر اُسے دیکھ لو۔''..... بس پھر تو میری نیند اڑن چھو ہو گئی تھی اور میں ملک جہانگیر کے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تھے تو وہاں کسی قسم کے شور شرابے اور ہلچل کے آثار نہیں تھے اور وہ لڑکی عاشی جس پر بقول ہیڈ ویٹر صادق کے' کوئی سایہ تھا' وہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ دیگر دو لڑکیاں اور ملک جہانگیر کی بیوی ایک کونے میں سہمے ہوئے کھڑے نظر آئے تھے۔

میں نے جاتے ہی عاشی سے نہایت نرمی سے سوال کیا تھا کہ ''کیا ہوا ہے تمہیں؟ اور کیا تکلیف ہے؟'' تو اُس نے اپنا سوجا ہوا پیر فوراً آگے کر دیا تھا۔

میں نے پوچھا تھا۔ ''کیا درد ہو رہا ہے؟''

''نہیں تو آپ سے کس نے کہا کہ مجھے درد ہو رہا ہے؟ جب درد ہوا تھا تو کسی نے پوچھا ہی نہیں تھا۔'' وہ بڑے عجیب انداز میں نہایت اداسی اور کربناکی سے بولی تھی۔

''اچھا' درد کب ہوا تھا؟'' میں نے بہت نرمی سے پوچھا تھا' ویسے مجھے بھی یقین ہو چلا تھا کہ ہیڈ ویٹر صادق غلط نہیں کہہ رہا' عاشی واقعی کسی کے اثر میں تھی' اس کی آنکھیں بہت عجیب ہو رہی تھیں اور پھر جب میرے سوال پر اُس نے نظریں اٹھائی تھیں تو میرے جسم میں سنسناہٹ کی ایک لہر سی آ گئی تھی' ویسے تو اب تک ابا جان نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا مگر اُن آنکھوں میں پتہ نہیں کیا اسرار تھا کہ میں سنسنا سا گیا تھا اور پھر اُس نے الٹا مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''تم سمجھ تو گئے ہو گے؟'' اور میرے خاموش رہنے پر بولی تھی۔ ''اب ان لوگوں کو منع کرو کہ یہ کسی مولوی وغیرہ کو نہ بلائیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔'' وہ عجیب سے انداز میں غرائی تھی۔ ''بس میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی تھی۔ یہ بات سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی کیونکہ ایسے کیسز میں کسی کے جسم سے کوئی اس طرح اتنی آسانی سے قبضہ نہیں چھوڑتا۔

میں اُس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس سے پہلے ہی بولی تھی۔

''ان سب کو کمرے میں سے نکال دو پھر بتاؤں گی۔'' اور پھر میں نے سب کو کمرے سے باہر جانے کو کہا تھا۔

''دروازہ بند نہ کرنا۔'' وہ فوراً ہی بولی تھی اور میں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''چلو اب بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے' کون ہو تم؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''میں کون ہوں؟ میں سنہرا ہوں۔'' وہ بولی تھی۔

''عاشی کو کیوں تنگ کر رہی ہو؟''

''میں نے کہاں تنگ کیا ہے اسے۔ میں تو خود تنگ ہوئی ہوں اس کے سبب۔ میں بابا ضراری کے مزار کی جانب جا رہی تھی اور یہ لوگ بھی۔ میں راستے میں ایک جگہ بیٹھ گئی تھی تو اس لڑکی نے مجھے زور سے ٹھوکر ماری تھی۔ اب میں بھی اس کو اذیت دوں گی۔'' اس نے عاشی کے پیر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''لیکن اس نے تمہیں جان بوجھ کے تو نہیں مارا تھا پھر تم کیوں اس کو اذیت دینا چاہتی ہو؟ قصور تو وہ ہوتا ہے جو شعوری طور پر جان بوجھ کے کیا جائے۔'' میں نے اسے سمجھایا تھا۔

عجیب مخلوق تھی وہ' رونے لگی تھی اور روتے ہوئے ہی بولی تھی۔ ''ہاں تو پھر میرا بھی کیا قصور تھا جو مجھے ستایا گیا؟ بولو؟''

''میں سمجھا نہیں' تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟ تمہیں کس نے ستایا ہے؟''

''مجھے جس نے ستایا ہے' وہ دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے بھی اب یہاں نہیں رہنا' میں چلی جاؤں گی مگر ایک شرط ہے جو تم مان لو تو؟''

''بالآخر تم اپنے رنگ پر آ گئیں ناں؟'' میں نے خاصے تیز اور تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''رنگ؟ رنگ تو میں تم کو دکھا ہی نہیں رہی ہوں' رنگ تو میں نے خود چھوڑ دیئے۔'' وہ بہت آزردہ لہجے میں بولی تھی۔

''اچھا چلو' بتاؤ' کیا کرنا ہے؟'' میں نے بھی خاصے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''بابا خراری کے مزار سے ملحقہ جو قبرستان ہے' وہاں ایک قبر ہے جس پر سبز رنگ کا پتھر لگا ہوا ہے' وہاں روزانہ اس لڑکی کو پھول چڑھانے ہوں گے پھر میں اسے معاف کر سکتی ہوں۔''

اُس کی بات سن کر میں بڑا حیران ہوا تھا اور اُس سے سوال کیا تھا کہ..... ''تمہیں اس قبر سے کیا دلچسپی ہے؟''

وہ یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور پھر اُس نے گلوگیر آواز میں کہا تھا۔ ''یہ اُسی کی قبر ہے جو مجھے ساری زندگی کا درد دے کر چلا گیا ہے۔'' پھر وہ دیوانوں کی طرح بے چین ہو گئی تھی اور میرا نام پکار کر بولی تھی۔ ''تاشون! مجھے اس درد سے نجات دلا دو' مجھ سے یہ درد برداشت نہیں ہوتا' تم ایسا کرو' مجھے مار دو..... مار دو..... مار سکتے ہو نا مجھے؟'' اف وہ بے بسی..... میں تو عاشی کو اس کے اثر سے نجات دلانے گیا تھا مگر وہ تو خود کسی کے زیر اثر تھی اور نجات چاہتی تھی!!

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کر گئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہو جائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جا سکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کر سکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے ازخود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرما لیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے' نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

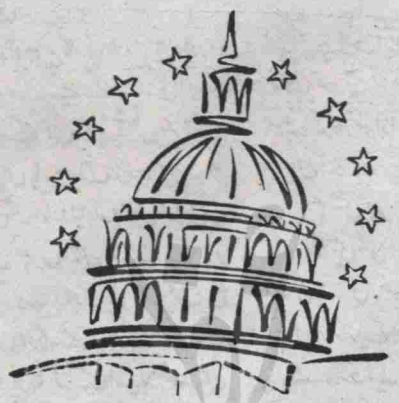

ماہِ شعبان المعظم

عزیزو.....!

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے۔ ''رمضان المبارک اللہ عزوجل کا مہینہ ہے اور شعبان المعظم میرا مہینہ ہے۔''

اِس ماہِ مبارک میں ہم خیر و برکت کے اعمال کے ذریعے ربِّ جلیل کا تقرب حاصل کر سکتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ معمول رہا کہ آپ ﷺ اِس بابرکت مہینے میں کثرت سے روزے رکھتے تھے' اتنے کہ انہیں رمضان المبارک سے ملا دیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ ''میں نے نبی کریم ﷺ کو شعبان المعظم سے زیادہ سوائے رمضان کے' کسی اور مہینے میں روزہ رکھتے نہیں دیکھا۔''

شعبان کے مہینے کی خصوصی حیثیت یہ ہے کہ اِس میں ہر شخص کے اعمال ربّ العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ اِس مہینے میں ایک رات جو پندرہویں شب کو آتی ہے ''شبِ برأت'' کہلاتی ہے۔ شب بہ معنی رات اور برأت کا مطلب چھٹکارہ ہے۔ گویا یہ نجات کی رات ہے۔ علمائے کرام لکھتے ہیں۔ ''یہ گناہوں اور مصیبتوں سے نجات کی رات ہے۔

اِس رات آئندہ آنے والی لیلۃ البرأت تک تمام مرنے والوں کا نام اور حساب کتاب لکھ دیا جاتا ہے اِس لیے میری اپنے عزیز قارئین سے التماس ہے کہ اِس رات کو زیادہ سے زیادہ عبادت میں گزارا جائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

□ شاہانہ۔ کراچی۔

o بابا جی! میرے شوہر سرکاری ملازم ہیں اور دو سال قبل ہم پنجاب پوسٹ کیے گئے۔ بابا جی! میری شادی کو 13 سال ہوگئے ہیں اور مستقل ہم مختلف شہروں میں رہے مگر اس بار مسائل بہت ہیں۔ ہم میاں بیوی چاہتے ہیں کہ ہمارا تبادلہ واپس کراچی کی طرف ہوجائے۔ اس طرح میں اپنے میکے اور سسرال دونوں سے قریب رہوں گی پھر بچوں کی پڑھائی کا بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میرے کم لکھے کو بہت جانیے اور جلالی وظیفہ دیں تاکہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو۔

☆ بیٹی شاہانہ !

لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ

مندرجہ بالا آیت کو ہر نماز کے بعد 101 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ ہمت رکھو اور اللہ کی ذات پر یقین رکھو۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ مدت ایک ماہ ہے۔ کوشش کرنا کہ پورا ماہ کسی ایک ضرورت مند کو کھانا کھلا دیا کرو۔ دونوں وقت یہ نہایت پسندیدہ عمل ہے اور انشاء اللہ اسی نیکی کے صدقے تمہیں کامیابی ملے گی۔

□ فہد علی، کراچی۔

o بابا سائیں! آپ نے میری بیوی کو اولاد کے لیے تعویذ دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیریت کے ساتھ اللہ نے ہمیں بیٹی سے نوازا ہے۔ گھر والے سب بہت خوش ہیں۔ ہمارے خاندان کی یہ پہلی بچی ہے۔ بابا! ہم بھی 5 بھائی ہیں۔ میرے والد کے بھی کوئی بہن نہیں اور والدہ اکلوتی ہیں۔ ہمارے تو پورے خاندان میں بس عید کا ماحول ہے۔ بابا سائیں......! یہ بتائیں کہ اب تعویذ کا کیا کروں؟

☆ بیٹے فہد......! اللہ تمہیں بہت خوشیاں عطا فرمائے۔ جن گھرانوں میں بیٹیوں کی پیدائش پر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے، وہ بہت خوش نصیب ہیں اور اللہ اُن پر ہمیشہ اپنا کرم رکھتا ہے۔ تعویذ تلف کردو اور خوب صدقہ خیرات کرو۔ بیٹے......! زندگی میں ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہا کرو، بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔

□ عینی، میرپورخاص۔

☆ بیٹی عینی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بہن سے کہو، ہر نماز کے بعد 7 تسبیح اَللّٰہُ قَادِرُ کی ضرور پڑھے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عینی عطاریہ، Hyd۔

☆ بیٹی عطاریہ! نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 بار الحمد شریف پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ عذرا فردوس، کراچی۔

☆ بیٹی عذرا! تمہارا خواب بہت اچھا ہے۔ اللہ تمہیں خوشیاں عطا فرمائے گا جو ساری دنیا دیکھے گی۔ اس خواب میں تمہیں اللہ کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں بھی کہا جارہا ہے۔

□ شاہدہ۔ کوٹ ادو۔

o بابا جی! میں نے پہلی بار آپ کا کالم پڑھا تو دل کو بہت سکون ہوا۔ یقین ہوگیا کہ دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ بابا جی! میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ میں عرصہ 7 سال سے کسی کو پسند کرتی ہوں، وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے کسی طور نہیں مان رہے، خاص طور پر والد اور بڑے بھائی۔ اگر میرے گھر والے مان جائیں تو وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دیں گے۔ بابا جی! میں اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ ظہر اور عصر قضا ہوجاتی ہیں۔ آج کل دن ویسے بھی چھوٹے ہیں، گھر آتے آتے مغرب کا وقت ہوجاتا ہے۔ اَب برائے مہربانی تعویذ عنایت کیجیے اور طریقۂ استعمال بھی بتائیے۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تعویذ میں ضرور تیار کردوں گا مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے والد اور بھائی اس رشتے کے خلاف کیوں ہیں؟ بیٹی......! والدین کا تجربہ بہت ہوتا ہے، پھر وہ اپنی اولاد سے محبت بھی بہت کرتے ہیں لہٰذا برا چاہ ہی نہیں سکتے۔ تمہارا خط واضح نہیں ہے، تفصیل سے مجھے خط لکھو، اس کے بعد میں تمہیں حل بتاؤں گا مگر بیٹی......! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ والدین کو دکھی کر کے اولاد کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔

□ طاہر خان۔ کوئٹہ۔

o بابا جی! میں اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھتا رہا ہوں اور اللہ کے فضل سے میرے مسائل بھی حل ہوئے ہیں۔ آج آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ بابا جی! اس کی شادی 2004ء میں میرے سگے ماموں زاد سے ہوئی اور بدلے میں میری شادی وہاں ہوئی۔ اس طرح ایک گھر کے دو لوگ ہمارے پاس ہیں۔ بابا جی! میری بہن کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ یہ بات اسی لیے محسوس زیادہ ہوتی ہے کہ میری شادی بہن کی شادی کے ایک ماہ بعد ہوئی اور میرے گھر میں ایک بیٹا بھی ہے اور دوسری اولاد کی امید ہے۔ بہن میرے بچوں کو بہت حسرت سے دیکھتی ہے۔ آپ اتنا مؤثر تعویذ دیں کہ وہ جلد از جلد ماں بن سکے۔

☆ بیٹے طاہر......! اللہ تمہاری بہن کو خوش اور آباد رکھے۔ تعویذ میں تیار کردوں گا مگر مجھے کچھ تفصیلات درکار ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ بہن مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھے۔ میں تفصیل سے جواب دوں گا۔ بس بچی اللہ پر بھروسا رکھے۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے اور جو لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں، وہ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔

□ کوکب۔ گجرات۔

o بابا جان! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس کو آپ نے شادی کے لیے تعویذ اور وِرد دیا تھا۔ بابا جان! اللہ کا بڑا کرم ہے، آپ کی دُعاؤں سے میری شادی ہوگئی اور میں اپنے گھر میں بہت سکون سے ہوں۔ بابا جان! اصل میں مسئلہ میری نند کا ہے۔ وہ اچھی شکل و صورت کی ہے، تعلیم یافتہ ہے، سلیقہ مند ہے مگر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں، پسند کر جاتے ہیں اور پھر بلاوجہ انکار ہوجاتا ہے۔ بابا جان! پہلے تو ہم نے یہ بات محسوس نہیں کی مگر اَب احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے ساتھ کی تمام بچیوں کی یا تو شادی ہوگئی ہے یا کم از کم بات تو طے ہی ہے۔ میری ساس دل کی مریضہ ہیں اور یہ مسئلہ اُن کی تکلیف میں اضافہ کردیتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی حل نکالیے۔

☆ بیٹی کوکب! اللہ کا شکر ادا کیا کرو اور عہد کرلو کہ اَب ہر کام میں اللہ کی رَضامندی لیا کروگی۔ جہاں تک تمہاری نند کا تعلق ہے تو بیٹی سے کہو بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اَحزاب پڑھے اور دُعا کرے۔ اپنی ساس سے کہو، بچی کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔ بعض اَوقات بچے بدنظر کا شکار ہوجاتے ہیں اور اُن کے تمام معاملات میں پھر رکاوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ بہرحال اللہ پر بھروسا رکھو، وہ بہتر کرنے والا ہے۔

□ زاہد علی۔ کراچی۔

o بابا جی! آج بہت ہمت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نبرد آزما ہوں مگر اَب بیٹی کی بیماری نے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بابا جی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے، اَب سے چھ ماہ پہلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک رات اچانک درد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے' ٹیسٹ ہوئے جن سے پتا چلا کہ گردے صحیح کام نہیں کررہے لہٰذا Dialysis ضروری ہے۔ ہفتے میں 3 دن بچی کے ساتھ اسپتال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو بابا جی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی' پھر اَب ڈاکٹرز Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ اُن کے مطابق گردے آہستہ آہستہ ناکارہ ہورہے ہیں اور اَب تک جو بھی علاج ہوا ہے' اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آرہا لہٰذا گردے کی پیوندکاری ضروری ہے۔ بابا جی! اِس بات نے ہمارے ہوش اُڑا دیئے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اِس مہنگے ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ بابا جی! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیے' کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے معجزہ ہوجائے اور میری بیٹی پہلے جیسی صحت مند ہوجائے۔ بابا جی! اِس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں' مجھ سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اُس کی ماں کو کیسے سمجھاؤں؟ رحم کیجیے اور اِس مشکل وقت میں مدد کیجیے۔

☆ بیٹے زاہد! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا مگر بیٹے! ہمت سے اِس آزمائش کا سامنا کرو۔ تمہیں اپنے اندر ہمت پیدا کرنی ہوگی ورنہ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بیٹے! بے شک میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اِن رپورٹوں کو حرفِ آخر سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بے نیاز ہے' وہ جب چاہے' جسے چاہے' نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو' بچی کا علاج کرواؤ۔ اِس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ دُعا اور دوا دونوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اَسباب بھی پیدا کرے گا۔ بس اپنا یقین پختہ رکھو۔ بعد نمازِ فجر اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی دو دو گھونٹ بیٹی کو پلاؤ۔ میں بھی خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں' انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ رافعہ۔ کراچی۔

o بابا جی! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے بڑے ہیں اور ماشاء اللہ' دونوں انجینئرز ہیں۔ تعلیمی ریکارڈ دونوں کا ہمیشہ بہت شاندار رہا مگر عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اُن کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے۔ پڑھائی کے حساب سے نوکری نہیں ملتی۔ میں نے بچوں کو انتہائی جدوجہد سے پڑھایا ہے۔ اُن کے والد بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ میں نے یہ ذمے داریاں تنِ تنہا اٹھائی ہیں۔ اَب اپنی زندگی میں' میں اپنے بچوں کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے وظیفہ عنایت فرمائیے اور مدت ضرور تحریر کریں۔

☆ بیٹی رافعہ! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح سورۃ آلِ عمران' آیت 17 پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ یقیناً تم نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہوگی۔ انشاء اللہ' اِس کا اَجر بھی ملے گا۔ بس اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ خیرُ النساء۔ حیدرآباد۔

o بابا سائیں.....! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ بابا سائیں.....! میری عمر 24 سال ہے' 2 بچے ہیں۔ میاں بینک میں جاب کرتے ہیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے' زندگی پُرسکون ہے مگر اِس کے باوجود میں اکثر راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔ مختلف سوچیں

ذہن منتشر رکھتی ہیں۔ جاگنے کی وجہ سے چہرے کی تازگی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ بے شمار جھائیوں کی وجہ سے چہرہ بہت بدنما لگتا ہے۔ مہنگی ترین کریمز اور لوشن استعمال کرکے دیکھ چکی ہوں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ آپ مشورہ دیں' کیا کروں؟

☆ بیٹی خیرُ النساء.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ پانی بہت پیو اور رات میں سوتے وقت ایک گلاس گرم دُودھ ضرور پیا کرو۔ مناسب ہوگا' مجھ سے چہرے کی تازگی کے لیے دوا منگوالو۔ انشاء اللہ' ضرور فائدہ ہوگا۔ سردیوں میں ویسے بھی جلد خراب ہوجاتی ہے' ایسے میں یہ دوا بہت فائدہ مند ہے۔

□ فرحان۔ لاہور۔

o بابا جی! میں اپنے مسئلے کے لیے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اِس سے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ بابا جی! میں اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر میرے گھر والے تیار نہیں' خاص طور سے میرے والد اور بڑی بہن۔ وجہ یہ ہے کہ میرے گھر والے چاہتے تھے کہ خالہ زاد بھائی سے بہن کی شادی ہوجائے مگر میری پسند کو دیکھتے ہوئے اُن لوگوں نے بہن کا رشتہ رَد کردیا کہ یہ اُدلہ بدلہ ہوجائے گا۔ مجھے وہ لوگ ہمیشہ سے بہت پسند کرتے ہیں' بس اِس بات کو میرے گھر والوں نے اَنا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ بابا جی! میں ایک ملٹی نیشنل میں اچھی جاب پر ہوں اور بہت آرام سے شادی شُدہ زندگی کی ذمے داریاں اٹھا سکتا ہوں۔ آپ مجھے ایسا تعویذ دیں جس کی بدولت یہ رُکاوٹ دور ہوجائے کیونکہ اَب اُس کی پڑھائی بھی مکمل ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا تعویذ دیں جس کی برکت سے ہمارا رشتہ سب کی مرضی اور رضامندی سے طے پائے کیونکہ میں بڑوں کو ناراض کرکے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ وظیفے کے لیے معذرت چاہوں گا۔ اکثر نمازیں قضا ہوجاتی ہیں۔

☆ بیٹے فرحان.....! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ طاقت رکھنے کے باوجود تم قدم اٹھانے سے گریزاں ہوں' صرف اِس لیے کہ بڑوں کو دُکھ نہ پہنچے۔ اللہ تمہیں اِس کا صلہ ضرور کامیابی کی صورت میں دے گا۔ بیٹے.....! تم تعویذ لینا چاہتے ہو' میں تعویذ ضرور تیار کردوں گا مگر اِس کے لیے کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ رُباب خان۔ پشاور۔

☆ بیٹی رُباب.....! تمہارا مسئلہ شائع کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھے براہِ راست خط لکھو۔ مجھے اِس بات کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی میرے کالم میں شائع نہ ہو جو مناسب نہیں۔ گھروں میں خواتین یہ رِسالہ پڑھتی ہیں' کم عمر بچیاں پڑھتی ہیں لہٰذا بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

□ فضل اللہ۔ پنڈی۔

o بابا جی! میں عرصہ 12 سال سے گارمنٹ کا کام کررہا ہوں مگر اَب کچھ عرصے سے کاروبار سے برکت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ سارا سارا دن گزر جاتا ہے' کوئی گاہک نہیں آتا۔ مہنگائی کے اِس دور میں بچوں کا بھی ساتھ ہے۔ مہینہ گزارنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ بچوں کی فیس' اِس کے علاوہ بجلی' پانی' گیس' راشن اِن خرچوں نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ سارا مہینہ ٹینشن میں گزرتا ہے۔ بابا جی! نوکری تو ہے نہیں کہ اگلے مہینے تنخواہ کے آسرے ہاتھ روک کر گزارہ کرلیں۔ بڑی پریشانی ہے' کوئی حل بتائیے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

☆ بیٹے فضل اللہ! رِزق میں برکت کے لیے بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ پڑھنا بہت مبارک ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اِس کے علاوہ ہر جمعے کو بعد نمازِ جمعہ کچھ رقم ضرور خیرات کرو۔ کبھی کبھی حالات بہت مشکل ہو جاتے ہیں' ایسے میں صبر اور مستقل مزاجی سے معاملات کو سنبھالنا چاہیے۔ اللہ سے ضرور مدد مانگتے رہو' وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ رابعہ محسن۔ جہلم۔

o بابا جی! میں آپ سے مستقل رابطے میں رہتی ہوں مگر کچھ حالات کی وجہ سے اِس بار خط کالم میں شائع کروانا چاہتی ہوں۔ میں نے پچھلے خط میں بھی آپ کو لکھا تھا کہ میرے بیٹے بہو آپس میں بہت لڑتے ہیں' ہفتوں دونوں آپس میں بات نہیں کرتے۔ بابا جی! اَب تو حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں۔ میرا بیٹا بہو دونوں ڈاکٹر ہیں اور C.M.H. پنڈی میں ہوتے ہیں۔ مجھے بہو بتا رہی تھی کہ میرا بیٹا اَب کسی نرس میں دلچسپی لینے لگا ہے جس کی وجہ سے اُن میں جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں۔ تین بچے ہیں' وہ الگ سہمے سہمے رہتے ہیں۔ بابا جی! قصور دونوں کا ہے مگر بہو کا زیادہ ہے۔ مرد تو اَنا پرست ہوتا ہے مگر عورت کو گھر اور بچوں کی خاطر جھکنا چاہیے' وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ پڑھی لکھی ہے' خوش شکل ہے مگر اَب تک اُس نے اپنے شوہر کو منانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا بیٹا اگر ناراض ہو جائے اور بات چیت بند کر دے تو وہ بھی اُس وقت تک بات نہیں کرتی جب تک بیٹا خود سے بات نہ کرے۔ بچے مجھے فون کر کے بتاتے ہیں پھر میں درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرواتی ہوں مگر بابا جی! ایسے کب تک چلے گا؟ میں کون سا ہمیشہ رہوں گی؟ پچھلے سال اِسی موسم میں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور میں 15 دن اسپتال میں رہی۔ جب گھر واپس آئی اور بچوں کو قسم دے کر حالات پوچھے تو پتا چلا' دونوں میاں بیوی ڈیڑھ مہینے سے بات نہیں کر رہے' کمرے بھی الگ کر لیے ہیں۔ بابا جی! آپ میرا دُکھ سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کے لیے' ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے دونوں کو عقل آ جائے اور میرا بیٹا بیوی بچوں کے پاس لوٹ آئے۔

☆ عزیزہ رابعہ! تمہارا خط پڑھ کر دُکھ ہوا۔ اتنی تفصیل سے شائع کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کو اندازہ ہو کہ اُن کے آپس کے رویّے کا بھی ماں باپ پر اَثر پڑتا ہے۔ جن گھروں میں محبت اور خلوص ہو' ایسے بچوں کے والدین بھی مطمئن رہتے ہیں مگر جہاں یہ سب نہ ہو' وہاں صرف ایک کنبہ ہی نہیں بلکہ پورا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ بچوں کو سوچنا چاہیے کہ اِس بڑھاپے میں والدین کو اپنی ذات سے دُکھ نہ پہنچائیں اور جو بچے یہ بات سمجھتے ہیں' وہ اپنے گھر بہت سنبھال کر لے جاتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد اَنا پرست ہے مگر اِسلامی معاشرے میں مرد اپنے کُنبے کا سربراہ ہے' وہ محبت اور ایثار کی زندہ مثال ہے' صبر و برداشت کا نمونہ ہے۔ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں' دوسروں کے لیے جینا اَصل زندگی ہے۔ تمہاری صحت اچھی نہیں' اِس لیے سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ اِنشاء اللہ' ضرور کرم ہو گا۔ بعد نمازِ ظہر اور عشاء 3-3 تسبیح یَاحَفِیظُ یَاحَافِظُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔

□ فاخرہ۔ خیر پور۔

o بابا جی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سُکھ میسر نہیں۔ میری 5 لڑکیاں ہیں' سب شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لکھی ہیں' قبول صورت ہیں' پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ بابا جی! میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ بچیوں کے والد تو ہیں نہیں۔ میں بھی نہیں رہی تو اُن کا کیا ہو گا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھ نہیں سکتی۔ یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں' بہت مہربانی ہو گی۔

☆ بیٹی فاخرہ! اللہ تمہاری دُعا جلد از جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے' چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے' اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی! صرف ایک لمحے کے لیے سوچو' تم بچیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہو تو وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچیوں کے لیے بہترین اَسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اس پاک ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ مجھ سے تعویذ منگوا کر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ فرحان شیخ۔ مسقط۔

o بابا جی.....! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔ میری نوکری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اِس لیے دیر ہوئی کہ کام نیا تھا لہٰذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ میں نیند بھی صرف 4 گھنٹے کی لیتا تھا مگر اَب اللہ کا شکر ہے' پہلا ڈرافٹ گھر بھیجا تو امی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا شکر اَدا کرو اور پھر بابا جی کو خط لکھو۔ بس بابا جی! اِسی طرح دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت کر سکا تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔

☆ بیٹے فرحان.....! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب درست سمت کوشش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹے.....! والدین کی بہت خدمت کرنا۔ انہوں نے تمہاری پرورش بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع مت دینا۔ میری دُعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

□ ترنم جہاں۔ سیالکوٹ۔

☆ بیٹی ترنم.....! اللہ تمہیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسا رکھو' وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فیصلہ کرو گی' اُس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو' جو شخص تمہیں تمہارے والدین سے متنفر کر سکتا ہے' وہ تم سے کبھی بھی مخلص نہیں ہو گا۔ اَب بھی وقت ہے' اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔

□ ثمینہ ارشد۔ کراچی۔

☆ بیٹی ثمینہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وِرد جاری رکھو۔ بیٹی! میں بار بار ایک ہی بات کہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں اور مکمل یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خوش حالی میں اللہ تعالیٰ رَبُّ العزت کا شکر اَدا کرنا اور مشکل میں بھی صابر و شاکر رہنا ہی اصل مومن کی پہچان ہے۔ تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ گل ناز۔ کراچی۔

☆ بیٹی گل.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تم جس قدر جلد ممکن ہو' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ منگوانے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط اِرسال کرو۔

□ حافظ شاہد علی۔ D.I.K۔

o محترم المقام' واجب الاحترام جناب بابا جی! السلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک عرض نامہ بھیجا تھا لیکن شاید وہ آپ کو موصول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہوسکا۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میری والدۂ محترمہ جن کی عمر تقریباً 58 برس ہے (اللہ تعالیٰ اُن کی عُمر دراز کرے!) اُن کی دائیں ٹانگ اور دائیں بازو میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال عرصہ بیس سال سے ہے اور ساتھ ہی کمر میں بھی درد رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ کافی عرصے سے بائیں نتھنے سے نکسیر پھوٹتی رہتی ہے اور اِس کے علاوہ اکثر اَوقات دَم گھُٹ سا جاتا ہے اور گہرے گہرے سانس لیتی ہیں اور سر میں بھی کھنچاؤ اور درد سا رہتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا' سب کا یہی کہنا ہے کہ یہ مجموعی طور پر جسمانی کمزوری ہے اور بس۔ بابا جی! ہم غریب لوگ ہیں' جو کچھ بن پڑتا ہے' اُن کے لیے اچھی غذا وغیرہ لیتے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہو رہا اِس لیے آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں' یقیناً اللہ کے کلام میں بہت شِفا ہے اور آپ کی دُعاؤں سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

بابا جی! میری ایک نوجوان بہن اور جوان العمر ماموں یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں۔ والدہ کو اُن کا بھی بہت صدمہ رہتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور ہمیں کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میری والدہ صحت یاب ہو جائیں۔ ہم تاعمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد اَلحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر والدہ پر ضرور دَم کیا کرو۔ اللہ سے دُعا کرو کہ جو اُن کے حق میں بہتر ہو' وہ فرمائے۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات بھی دیا کرو۔ انشاء اللہ' مکمل صحت عطا ہوگی۔

□ عرفانہ گل۔ بھکّر۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں اور میری صرف ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد پتا چلا ہے کہ کچھ اندرونی مسائل کے باعث مزید بچے نہیں ہو رہے۔ پلیز' بابا جی! مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میری اولاد ہو سکے اور وہ بھی اولادِ نرینہ یعنی کہ بیٹا کیونکہ میرے شوہر پہلے سے شادی شُدہ ہیں اور میرے لیے بہت سے مسئلے ہیں۔ پلیز' میرے اِس خط کا جواب جلد از جلد دیں۔

☆ بیٹی عرفانہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' ہدیہ اور تفصیل جوابی لفافہ اِرسال کرو تو بتائی جائے گی۔

□ شاہین منیر۔ فیصل آباد۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! ایسا نہیں ہوتا ہے کہ آج کوئی کام شروع کیا اور وہ فوراً ہی کامیابی کی طرف بڑھنا شروع ہو جائے۔ کچھ وقت بلکہ بعض اَوقات کافی وقت درکار ہوتا ہے لہٰذا مستقل مزاجی سے کام کرنا چاہیے۔ تم ہر نماز کے بعد سورۃ مزمّل' آیت 7' ..... 99-99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ شاہ بانو۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمام مسائل کے لیے ایک نہایت مجرّب وظیفہ اِرسال کر رہا ہوں۔ سورۃ یونس آیت 68 ہر نماز کے بعد 101 بار پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر دُعا کرو۔ انشاء اللہ' مسائل رفتہ رفتہ حل ہوں گے۔

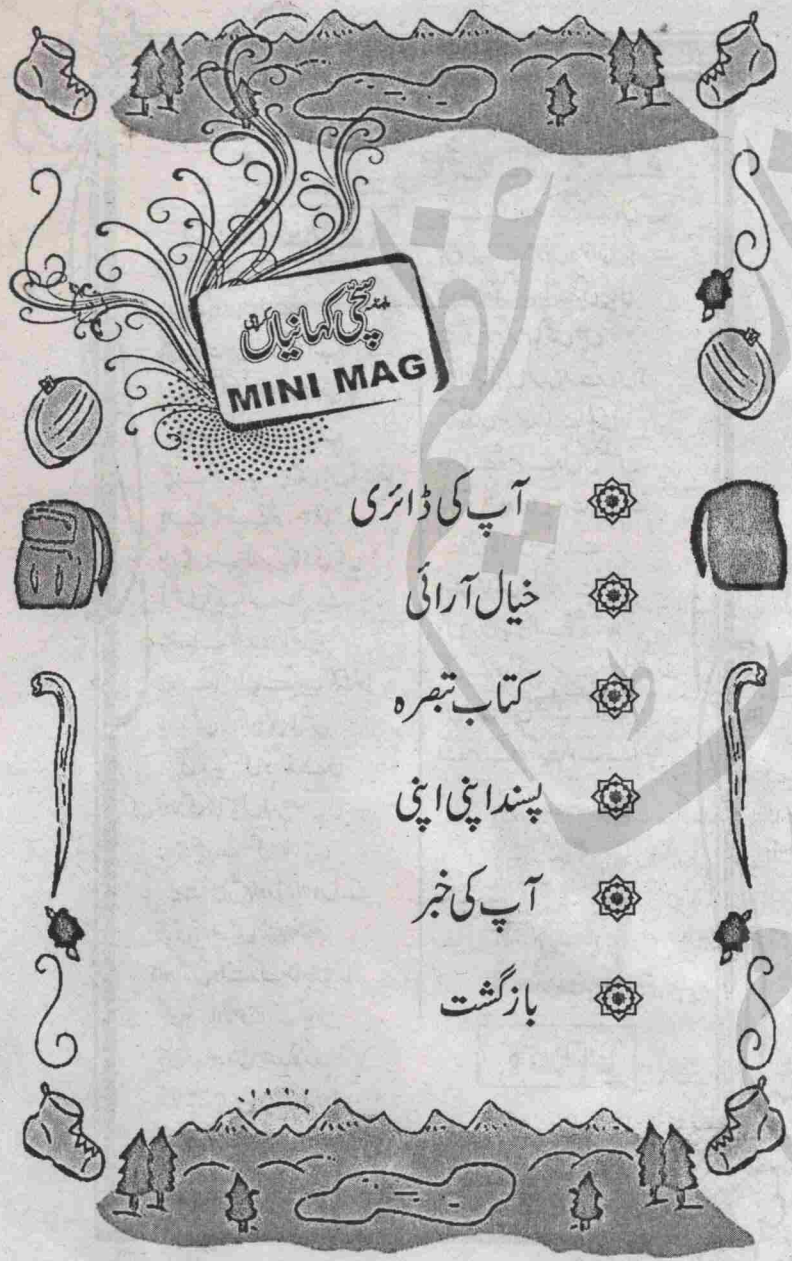

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

(آ.....دوست مرے)

یار، بیمار کیوں ہوا ہے تُو
بس بہت دن گزر گئے اب تو
اب تو سچ مُچ ٹھیک ٹھاک ہو ہی جا
مجھ کو سب کچھ ہی یاد آتا ہے
تیرے گھر جب بھی میں ہاں آتا تھا
یاد ہے، چھوڑنے تُو آتا تھا؟
اور پھر جب تلک کہ گاڑی میں
آخری ایک اک مسافر کے.....
بیٹھ جانے تلک وہ ہاتھ تیرا
میرے ہاتھوں سے کب نکلتا تھا
یار، باتیں، وہ اَن کہی باتیں
کبھی گڑیا، کبھی تو گڈے کی
اور کبھی کلاسیکل ڈراموں کی
وہ جو ہم نے ابھی بنانا ہیں
گیت بھی، فلم اور ڈراموں کے
تری آواز میں، میں سنتا تھا
اور کہیں وقت رک سا جاتا تھا
بس ذرا اور تھوڑا رک جاؤ
بس ذرا اور دس منٹ تو رکو
آؤ چلتے ہیں چائے کے ہوٹل
اور پھر دور..... بہت دور تلک
باتیں کرتے ہوئے ہم جاتے تھے
یہ ترے پاؤں دوست تھک کیوں گئے؟
ہر طرف ہے دھواں دھواں پیارے
نہ وہ بیٹھک، نہ چائے کی پیالی
نہ تری نرم گرم باتیں ہیں
اپنا اظہار کس طرح سے کروں؟
کچھ نہیں سوجھ رہا ہے ایڈی
جانتا ہے تُو مرے دل کی خلش
میں تو کمزور ہوں بہت پیارے
''دوستی کا تری سہارا ہے
ورنہ دنیا میں کیا ہمارا ہے؟''
بس مری جان، اب تو تُو آجا
چل کے خود آپ میرے گھر کی طرف
بس مری جان، لوٹ کے آجا
اے مرے دوست، لوٹ کے آجا

کاشی چوہان

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

انصاف

سٹی مجسٹریٹ کے ہاں بوڑھا ٹھیلے والا پولیس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں مدعی بھی موجود تھے۔ کورٹ انسپکٹر نے واقعات پیش کیے تو عدالت نے مدعا علیہ کا بیان لینا چاہا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بہرا ہے چپراسی نے چیخ چیخ کر اس کا اظہار لیا۔ بوڑھے نے بیان کیا۔ ''میرا نام ظفر سلطان ہے۔ میں مرزا بابر بہادر شاہ بادشاہ کے بھائی کا بیٹا ہوں۔ میرے دادا ہندوستان کے شہنشاہ معین الدین اکبر شاہ ثانی تھے۔ غدر کے بعد میں نے ہزاروں پریشانیاں اٹھائیں ملکوں ملکوں پھرتا ہوا دہلی میں آگیا اور ٹھیلا چلانے کا کام کرنے لگا۔ 11 مئی 1917ء جو 11 مئی 1857ء کی طرح گرم اور سخت تھی، اس واقعے کی تاریخ ہے۔ میں بہرا ہوں، میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی۔ موٹر والوں نے میری عمر اور حالت پر رحم نہ کیا اور میرے چار کوڑے مارے۔ میرے بدن میں جو خون ہے، اس کو مار کھانے کی اور ظلم و جور سہنے کی اب تو عادت ہوگئی ہے مگر پہلے نہ تھی جس جگہ عدالت کی کرسی ہے، اسی مقام پر غدر سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شریروں اور سرکشوں کو سزائیں دی گئی ہیں۔ میرے دل و دماغ نے ان عادتوں کو فراموش نہیں کیا۔ گو میری آنکھوں نے ان نظاروں کی دید مدت سے ترک کر دی ہے۔ میں کیونکر چار کوڑوں کی برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے بیشک بدلہ لیا اور ان دونوں جوانوں کے سر پھاڑ ڈالے اگر آپ شریف لوگوں کا انصاف کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کو تیار و آمادہ ہوں۔ بوڑھے کی تقریر سن کر عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب جو یورپین تھے، قلم منہ میں لے کر بوڑھے کو دیکھنے لگے اور ان کا مسلمان سرشتہ دار آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ دونوں مدعی بھی یہ بیان سن کر دم بخود رہ گئے۔

خواجہ حسن نظامی کی تصنیف ''بیگمات کے آنسو'' سے اقتباس
انتخاب: عبدالعزیز جی آ، چکوال

دور اندیش

دانت کا درد بڑی ظالم شے ہے لیکن دانت کا ڈاکٹر اس سے بھی ظالم چیز ہے۔ ہم یہاں چین کی بات کر رہے ہیں۔ اپنے ملک کی نہیں جہاں دانت نکالنے کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں جہاں لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے زنبور ڈال کر دانت نکال دیتے ہیں اور جہاں پتھر ہضم، لکڑ ہضم قسم کے چورن ہر جگہ دستیاب ہیں۔ یہاں ہمارے ایک دانت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تکلیف ہوئی۔ ہم اس کے پاس گئے۔ یہاں کے دانتوں کے ڈاکٹر دوا وغیرہ نہیں جانتے۔ ہمیں تب ہوش آیا جب انہوں نے ایک ساتھ ہمارے تین دانت نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ہم نے کہا۔ ''ان دو کا کیا قصور ہے؟ ان میں تو درد نہیں تھا۔'' ڈاکٹر تھا دور اندیش قسم کا بولا۔ ''آج نہیں تو پھر کبھی ضرور ہوتا۔ سُن کرنے کے لیے ایک اور انجکشن لگانا پڑتا آپ کو تکلیف ہوتی۔'' ہم قائل ہو گئے بلکہ ہونا پڑا کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ دانت تو وہ دوبارہ ہمارے جبڑے میں ٹھونک نہیں سکتا تھا۔

ابن انشاء کی تصنیف ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' سے اقتباس
انتخاب: حسین جونیجو، گاؤں بورڑی، خیر پور ناتھن شاہ

کیڈٹ نمبر 4

انہیں بڑی بڑی مونچھیں رکھنے کا شوق تھا۔ سبز تھیلا لٹکائے ایک جانب جھک کر چلتے۔ دور سے تعلیم بالغان کی کلاس کے ہونہار طالب علم لگتے۔ ان کے پورے بتیس دانت سلامت تھے۔ پلاٹون کو ہر وقت صرف ایک نصیحت کرتے۔ ''دوستو، دانت بڑی نعمت ہیں۔ کفرانِ نعمت مت کرو۔'' اذان کے وقت نماز والی ٹوپی سر پر رکھے بیرک کے برآمدے میں کھڑے ہو جاتے۔ ایکسر سائز کے دوران ان کی کمانڈ میں ماتحت کو چین کی نیند آتی کیونکہ وہ اس خیال کے داعی تھے کہ سیکشن کمانڈر خود سنتری کی ڈیوٹی ادا کر کے صورتِ حال پر کڑی نگاہ رکھ سکتا ہے۔ اکثر ساری رات ان کی ٹانگیں اور نگاہیں کھڑی رہتیں تھیں البتہ صبح قدم لڑکھڑایا کرتے۔

بریگیڈیئر صولت رضا کی تصنیف ''کاکولیات'' سے اقتباس
انتخاب: محمد فہیم، کراچی

عورت

آسمان کی نیلاہٹوں میں پرواز کرتا ہوا ہنس کیچڑ میں سوئے ہوئے مگرمچھ کا مذاق اڑاتا ہے لیکن وہی ہنس کیچڑ میں پھنس جاتا ہے تو مذاق اڑانے کی باری مگرمچھ کی ہوتی ہے۔ سب دن یکساں نہیں ہوتے اور زندگی ایک ہی راستے پر سیدھی سیدھی نہیں چلی جاتی۔ اس میں بہت سے موڑ آتے ہیں اور ہر موڑ پر ایک نہ ایک عورت ضرور ہوتی ہے اور جان لو کہ عورت مگرمچھ سے زیادہ مکار ہوتی ہے۔ عورتوں کا اور ان کی محبت کا مذاق مت اڑاؤ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ آخر کار تم انہی کی گود میں پناہ لو۔ دیوتاؤں کی پوجا تو گنے چنے آدمی کرتے ہیں لیکن عورت کی پرستش ہر مرد کرتا ہے۔

رائیڈر ہیگرڈ کی تصنیف ''فرعون کی آپ بیتی'' سے اقتباس
(ترجمہ مظہر الحق علوی)
انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی۔ کراچی

ذخیرہ اندوزی

لکھا یار طرحدار سید مشکور حسین یاد نے۔ ''کرنل صاحب! ہمیں حسینوں یا پردہ نشینوں کے ذکر پر کوئی اعتراض نہیں مگر ہر کتاب میں صرف ایک ہیروئن ہوا کرتی ہے۔ چلیں دو چار اس کی سہیلیاں بھی سہی مگر آپ نے تو اپنی کتاب میں جہان بھر کے حسیں جمع کر لئے ہیں اور باقی قلمکاروں کے لئے ایک بھی نہیں چھوڑا۔ اتنی خود غرضی؟ آخر کیوں؟''

دوست عزیز، آپ کا ارشاد بجا۔ مجھے اپنی لغزش کا اعتراف ہے لیکن یقین جانیں کہ حسینوں کی کثرت کے باوجود میری نیت نیک تھی۔ چنانچہ آپ خود شہادت دیں گے کہ میں نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو بطورِ مثال، جناب جوش یا دیگر حضرات نے اپنی حسینوں کے ساتھ کیا ہے، تاہم چینی اور چائے کی طرح حسینوں کی ذخیرہ اندوزی بھی ایک سماجی برائی ہے جس سے مجھے بچنا چاہیے تھا۔ آخر حسینوں پر دوسرے صارفین کا بھی برابر کا حق ہے لیکن اب کہ یہ خطا ہو چکی ہے بطور کفارہ اپنے

ذخیرے سے ایک آدھ چھوڑ کر، باقی تمام حسین مفت بانٹنے کو تیار ہوں مشکور بھائی، سب سے پہلا حق آپ کا ہے، سوفرمائیں۔ جوڑی چاہیے یا بار برا؟ میرے خیال میں آپ کے لئے جوڑی موزوں رہے گی۔ ذرا شوخ ہے مگر آپ ہی کی طرح نکتہ سنج ہے۔ بالکل ستاروں کی طرح چھپاتی جوڑی بنے گی۔ چشم بد دور! لیجئے، دو حسینوں کے ہاتھ تو پیلے ہو گئے۔ باقی ماندہ کے لئے جملہ ادیب دوستوں کو صلائے عام ہے۔ ان دانوں پر کوئی ادیب ہاتھ رکھ سکتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ حاجت مند ہو یعنی پہلے ہی سے دو چار حسیں گھر میں نہ ڈال رکھے ہوں۔ بس یہ شرط پوری کر دے اور ''پہلے آئے، پہلے پائے'' کے اصول پر اپنا حسین لے جائے۔

کرنل محمد خان کی تصنیف ''بجنگ آمد'' سے اقتباس
انتخاب: شرجیل اقدس، جیکب آباد

کام کی بات

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھے معلوم نہیں تھا کہ کشور یوسف کی بیوی ہے۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ شہر میں کوئی ایسا بھی ہے مگر خدا کی قسم یہ سچ ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ دنیا میں یوسف کو یوسف کی حیثیت سے جاننے والا واحد شخص میں ہوں۔ کراچی سے ہمارے ایک دوست لاہور آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں یوسف کی گاڑی میں یوسف کے گھر جا رہے تھے۔ اسی سڑک پر ایک ٹانگے میں جو آگے آگے چل رہا تھا، ہم نے کشور کو دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے متوجہ کیا اور جلتا ہوا سگریٹ اس پر پھینکا مگر اتنے میں گاڑی گزر گئی۔ میں نے ڈھیٹ ہو کر یوسف سے کہا۔ ''اس نے نہیں دیکھا۔'' یوسف رکھائی سے بولا۔ ''دیکھ لیا ہے۔ بڑی گشتی عورت ہے۔ تم اس کو نہیں جانتے۔'' تھوڑی دیر بعد جب میں یوسف کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا موسم کی بات کر رہا تھا تو کشور چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے باورچی خانے میں سے داخل ہوئی۔ میں ٹھٹکا مگر فوراً سمجھ گیا یوسف سچ کہتا تھا اور میں ایک نہایت بے وقوف آدمی ہوں مگر میں موسم کی بات کرتا رہا، میں نے بالکل یہ تاثر نہ دیا کہ مجھے کسی بات پر حیرت ہوئی ہے وہ تھوڑی دیر یوریت کے ساتھ میری باتیں سنتی رہی اور مٹھائی کھاتی رہی پھر چیخ کر بولی۔ ''اب بک بک بند کرو، کوئی کام کی بات کرو۔'' میں نے کہا۔ ''کام کی بات میں کیوں کروں۔ تم کیوں نہیں کرتیں۔'' بولی۔ ''میرے نزدیک تو کام کی بات شعر ہے جو تمہارے پلے نہ پڑے گا۔ فلم ہے جسے تم چھوڑ کر بھاگ چکے ہو مگر یاد آیا یار، تمہاری فلم میں خاص زاویہ تو بوڑھے ہیرو کا جنسی زاویہ تھا۔ بھئی، خوب تھا۔ میں بہت سے بوڑھوں کو جانتی ہوں مگر ان کا تو کوئی زاویہ ہی نہیں، تم نے ایسا بوڑھا کہاں سے کھود کر نکال لیا۔''

احمد بشیر کی تصنیف ''اردو کے بہترین خاکے''
(چھپن چھری) سے اقتباس
انتخاب: بابر محبوب، کراچی

روشنی

زندگی ایک موج ہے۔ دریا سے اٹھنے کے بعد اگر وہ ساحل سے نہ ٹکرائے تو بھنور کی آنکھ اور مرنے والے کی آنکھیں دونوں اس کے ماتم میں روتی رہتی ہیں، میں قبرستان سے سر جھکائے خاموش یہ سوچتا ہوا واپس چلا۔ کیا اس کا بھی کوئی مداوا ہے؟ آواز آئی۔ ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے۔ میں نے آرزو کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیا اور مڑ کر دیکھا۔ تاحدِ نگاہ چراغ ہی چراغ۔ تاحدِ خیال روشنی ہی روشنی۔

مختار مسعود کی تصنیف ''سفر نصیب'' سے اقتباس
انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انمول خزانہ

سنہری باتیں

☆ وہی مومن قابلِ رشک ہے جو دنیا سے ایمان سلامت لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

☆ عشقِ رسول ﷺ میں رونا سعادت مندوں کا حصہ ہے۔

☆ ماں باپ سے نگاہیں مت ملاؤ، بلکہ آنکھیں نیچی رکھو۔

☆ وعدہ خلافی کا عادی انسان اعتماد کھو بیٹھتا ہے۔

☆ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک کو آپ کہہ کر مخاطب کریں، انشاءاللہ جلد ہی اس کی برکت دیکھ لیں گے۔

☆ پینے کے بعد گلاس میں بچا ہوا پانی پھینک دینا اسراف ہے۔

☆ ایک انسان کی موت دوسرے انسان کے لیے عبرت ہے۔

☆ اپنے مر جانے والے عزیزوں کی زندگی کے حسین انداز اور موت کے وقت لاچاری اور بے بسی کو یاد کریں۔

☆ کوشش کرو کہ کوئی سانس بیکار نہ جائے جوں ہی فارغ وقت ملے، جھٹ دُرود شریف پڑھنا شروع کردو۔

مرسلہ: عائشہ اشعر، کراچی

اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنا ہے تو.....

- اپنا ہر معاملہ اس پر چھوڑنا ہوگا۔
- اسی کو اپنے دل کی ہر بات بتانی ہوگی۔
- اس کے کیے گئے فیصلوں کو دل سے ماننا ہوگا۔
- اس کی دی گئی آزمائش پر مایوسی نہیں دکھانی ہوگی۔
- دُعا کا تعلق مضبوط کرنا ہوگا۔
- صدقِ دل سے اسی کو اپنا سچا اور بہترین دوست ماننا ہوگا۔

مرسلہ: پارس جونیجو، بورڑی

سنہرے موتی

☆ جس قوم میں بدکاری بڑھ جاتی ہے، اس میں ناگہانی اموات بڑھ جاتی ہیں۔

☆ جب سوؤ تو موت کو اپنے سرہانے سمجھو، جب جاگو تو اسے سامنے جانو۔

☆ حکومت اور عورت کی محبت کا چھوڑنا صبر سے زیادہ کڑوا ہے۔

☆ خدا کے سواء کسی سے امید نہ رکھو۔ اور اپنے گناہوں کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔

☆ تمہیں اس دن پر رونا چاہئے جو نیکی کے بغیر گزار دیا۔

☆ جب جسم موت کے لیے ہے تو خدا کی راہ میں شہید ہونا سب سے بہتر ہے۔

☆ صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآنِ پاک اور دوسرے میں سنتِ رسول ہے۔

☆ صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔

☆ فتح امید سے نہیں علم اور خدا پر اعتماد سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ شکم سیری بیماری کی جڑ اور پرہیز ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

☆ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور اس پر قائم رہو۔

☆ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن خود سچا دوست بننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

☆ دُعا کبھی بیکار نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔

☆ صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں مدد کرتا ہے۔

مرسلہ: شعیب شمس، کراچی

انمول موتی

☆ دوستی نیک سیرت سے کرو نا کہ اچھی صورت سے۔

☆ محبت کمزور دلوں کو مضبوط بنا دیتی ہے۔

☆ جو جتنا خاموش رہے، اس قدر پوشیدہ ہے۔

☆ آنکھ دل کا دروازہ ہے، تمام آفات اسی راہ سے داخل ہوتی ہیں۔

☆ اپنی زندگی پھول کی طرح گزارو جو ان ہاتھوں میں بھی خوشبو دیتے ہیں جو انہیں مسل ڈالتے ہیں۔

☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے۔

☆ اپنے کردار کو اتنا بلند کرو کہ چھوٹی چھوٹی باتیں تمہیں متاثر نہ کرسکیں۔

☆ سونا آگ کی تپش سے کندن بنتا ہے جب کہ انسان حالات کی بھٹی میں جل کر۔

☆ خلوص کی خوشبو دنیا کی سب سے خوبصورت خوشبو ہے۔

☆ دنیا کی سخت ترین سزاؤں میں سے ایک سزا انتظار ہے۔

☆ بدصورت چہرہ بدصورت دماغ سے بہتر ہے۔

☆ محنت ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔

☆ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے جنہیں کامیابی پر یقین ہوتا ہے۔

☆ خوش اخلاقی پر کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کا وقار بڑھا دیتی ہے۔

☆ دنیا میں نیک کام کرکے مرجانا آبِ حیات پینے سے بہتر ہے۔

☆ دنیا دریا ہے اور آخرت کنارہ، کشتی تقویٰ ہے اور لوگ مسافر۔

☆ نہ گرنا کمال نہیں کمال تو یہ ہے کہ تم گرو اور پھر از سرِ نو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔

☆ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔

مرسلہ: قرۃ العین زینب، ملتان

مہکتی کلیاں

☆..... پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا، انسان کا اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

☆..... اپنے رب پر ہمیشہ بھروسا رکھو کیوں کہ اللہ پاک وہ نہیں دیتا جو ہمیں اچھا لگتا ہے۔ اللہ پاک وہ دیتا ہے جو ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے۔

☆..... برا وقت بتا کر نہیں آتا مگر سکھا کر اور سمجھا کر بہت کچھ جاتا ہے۔

☆..... زبان کی حفاظت، دولت سے زیادہ مشکل ہے۔

☆..... غریب لوگوں پر احسان کرو کیوں کہ غریب ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

ذرا مسکرائیے

عینک

ایک شخص اپنی کار میں اپنے دوست کو اس کے گھر چھوڑنے جارہا تھا۔ راستے میں برف باری ہورہی تھی۔ سامنے شیشے پر برف اتنی جم چکی تھی کہ باہر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ خوفزدہ دوست نے ڈرائیور دوست کو مشورہ دیا۔ ''باہر نکل کر شیشے سے برف صاف کرلو، کچھ تو نظر آئے گا۔''

''کیا فائدہ۔'' ڈرائیور دوست اطمینان سے بولا۔ ''اپنی نظر کی عینک تو میں گھر بھول آیا ہوں۔''

مرسلہ: مسلم خان، حیدرآباد

بے چاری

''کیوں میاں، اس گھر میں تو تمہارے بڑے مزے ہوں گے۔''

''جی ہاں، واقعی کافی بڑا گھر ہے۔ یہ دیکھیں، یہ میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرہ ہے۔اس کے برابر میری بڑی بہن کا' اس کے ساتھ والا بھائی کا اور وہ سامنے والا میرے ابو کا لیکن مصیبت ہماری ممی کی ہے کہ ان کا کوئی کمرہ نہیں' وہ بے چاری ابھی تک ابو کے کمرے میں رہتی ہیں۔"

مرسلہ: خالد رانجھا، لاہور

آواز

"سنو' سنو' مجھ پر چوہے کی آواز کا راز آشکار ہو گیا ہے۔" خاتون نے پسینے میں نہائے ہوئے اس کار مکینک سے کہا جو خاتون کی شکایت پر پچھلے تین گھنٹوں سے کار کے انجن میں چوہا تلاش کر رہا تھا۔

"دراصل چوں چوں کی آواز میرے جوتوں سے نکل رہی ہے۔"

مراسلہ: مشتاق جمالی' حیدر آباد

اشتہار

جوتوں کی دکان کے پوسٹر کے اوپر کسی نے ایک ڈاکٹر کے کلینک کا پوسٹر لگا دیا۔ کچھ دنوں بعد بارش کی وجہ سے اوپر والا پوسٹر جگہ جگہ سے پھٹ گیا' اب اشتہار کچھ یوں پڑھا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عمدہ قسم کے مرض مل جاتے ہیں۔ جوتوں کو پولیو کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ چیچک کے مریضوں کو ایک سال کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ ناکارہ مریضوں کی سلائی کے لیے تشریف لائیں۔ نت نئے ڈیزائنوں میں مریض تیار کیے جاتے ہیں۔

مراسلہ: محمد طارق' کراچی

سزا

ایک ٹرین پٹڑی سے اتر کر کپاس کے کھیتوں میں گھس گئی۔ اسے دوبارہ پٹڑی پر لانے میں کافی دیر لگ گئی۔ اس واقعے نے تمام مسافروں کو خوف زدہ کر دیا۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو ناراض مسافروں نے ٹرین کے سکھ ڈرائیور کو گھیر لیا اور پوچھا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے ایسا کرنا پڑا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "ایک آدمی پٹڑی کے عین بیچ میں کھڑا ہوا تھا اور میرے مسلسل ہارن دینے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔"

"کیا تم پاگل ہو؟" لوگوں نے غصے سے کہا۔

"محض ایک آدمی کی خاطر تم نے اتنے سارے مسافروں کی جانیں خطرے میں ڈال دیں۔ ایسے بدبخت کو تو تمہیں ٹرین سے کچل کر ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔"

"وہی تو میں کرنا چاہ رہا تھا' لیکن جیسے ہی ٹرین اس کے قریب پہنچی تو وہ کمبخت کپاس کے کھیتوں میں گھس گیا۔"

مراسلہ: مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں

آدم خور

آدم خور باپ' بیٹا اپنی بھوک مٹانے کے لیے شکار ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک پتلی سی عورت دیکھ کر بیٹا بولا۔ "ابا' اسے کھا لیتے ہیں۔"

باپ بولا۔ "نہیں' اس سے ہم دونوں کی بھوک نہیں مٹے گی۔"

کچھ دیر بات ایک بہت موٹی عورت نظر آئی' بیٹے نے کہا۔ "اسے کھا لیتے ہیں۔"

باپ بولا۔ "نہیں' اس میں چربی بہت ہے، کولیسٹرول لیول بڑھ جائے گا۔"

بھوک سے نڈھال بچہ ایک بہت حسین لڑکی دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "ابا' یہ بالکل ٹھیک ہے، اسے کھا لیتے ہیں۔"

باپ۔ "نہیں بیٹا، اسے گھر لے چلتے ہیں اور تیری امی کو کھا لیتے ہیں۔"

عادت

پٹھان' ایئر ہوسٹس سے "بی بی' تمہاری شکل ہماری بیوی سے بہت ملتا ہے۔"

ایئر ہوسٹس نے اسے زور کا طمانچہ مارا' پٹھان چہرے پر ہاتھ رکھ کر واللہ.....! عادت بھی ملتا ہے....."

مرسلہ۔ صدف آصف' کراچی

بزم آرائی:

☆

اُجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ ہوا کر
حالات کی قبروں کے یہ کتبے پڑھا کر
کیا جانیے کیوں تیز ہوا سوچ میں گم ہے
خوابیدہ پرندوں کو درختوں سے اڑا کر
اب دستکیں دے گا تو کہاں اے غمِ احباب
میں نے تو کہا تھا کہ میرے دل میں رہا کر
ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر
وہ آج بھی صدیوں کی مسافت پہ کھڑا ہے
ڈھونڈا تھا جسے وقت کی دیوار گرا کر
اے دل تجھے دشمن کی بھی پہچان کہاں ہے
تو حلقہ یاراں میں بھی محتاط رہا کر
پہلا سا کہاں اب میری رفتار کا عالم
اے گردشِ دوراں ذرا تھم تھم کے چلا کر
اس شب کے مقدر میں سحر ہی نہیں محسن
دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو بجھا کر

(محسن نقوی)

حسن انتخاب: اشعر جواد، کراچی

☆

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریہ شبنم نہ ہوں گے
دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے
زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے
ہمارے دل میں سیل گریہ ہو گا
اگر با دیدہ پرنم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
حفیظ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

(حفیظ ہوشیار پوری)

حسن انتخاب: رضوانہ کوثر، لاہور

☆

اس دل نے ترے بعد محبت بھی نہیں کی
حد یہ کہ دھڑکنے کی جسارت بھی نہیں کی
تعبیر کا اعزاز ہوا ہے اُسے حاصل
جس نے مرے خوابوں میں شراکت بھی نہیں کی
الفت تو بڑی بات ہے ہم سے تو سرِ شہر
لوگوں نے کبھی ڈھنگ سے نفرت بھی نہیں کی
آداب سفر اب وہ سکھاتے ہیں جنہوں نے
دو چار قدم طے یہ مسافت بھی نہیں کی
کیا اپنی صفائی میں بیاں دیتے کہ ہم نے
ناکردہ گناہی کی وضاحت بھی نہیں کی
خاموش تماشائی کے مانند سرِ بزم
سو زخم سہے دل پہ شکایت بھی نہیں کی
اس گھر کے سبھی لوگ مجھے چھوڑنے آئے
دہلیز تلک اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی
اس نے بھی غلاموں کی صفوں میں ہمیں رکھا
اس دل پہ کبھی جس نے حکومت بھی نہیں کی

(اعتبار ساجد)

حسن انتخاب: نعیم احمد آکاش، حیدر آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆

زخم مسکراتے نہیں اب بھی تیری آہٹ پر
درد بھول جاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
شبنمی ستاروں میں پھول کھلنے لگتے ہیں
چاند مسکراتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
عمر کاٹ دی لیکن بچپنا نہیں جاتا
ہم دِیے جلاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
گھنٹیاں سی بجتی ہیں رقص ہونے لگتا ہے
درد جگمگاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
تیری یاد آئے تو نیند جاتی رہتی ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
جو ستم کرے آکر سب قبول ہے دل کو
ہم خوشی مناتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
اب بھی تیری آہٹ پر چاند مسکراتا ہے
خواب گنگناتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
تیرے ہجر میں ہم پر اک عذاب طاری ہے
چونک چونک جاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
دستکیں سجانے کے منتظر نہیں رہتے
راستے سجاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
اب بھی تیری آہٹ پر آس لوٹ آتی ہے
ہم دِیے جلاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر

(وصی شاہ)

حسن انتخاب: ارم خان، کوئٹہ

☆

میں کہ پرشور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سوکھے ہوئے دریاؤں میں
نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں
دن کے ڈھلتے ہی اجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں
چاکِ دل ہی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں
ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرار
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

(احمد فراز)

حسن انتخاب: بابر محبوب، کراچی

☆

میرے لیے تو حرفِ دعا ہو گیا وہ شخص
سارے دکھوں کی جیسے دوا ہو گیا وہ شخص
میں آسماں پہ تھا تو زمیں کی کشش تھا وہ
اترا زمین پر تو ہوا ہو گیا وہ شخص
سوچوں بھی اب اسے تو تخیل کے پر جلیں
مجھ سے جدا ہوا تو خدا ہو گیا وہ شخص
میں اُس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً
سمٹا سمٹ کے رنگِ حنا ہو گیا وہ شخص
پھرتا ہے لے کے آنکھ کا کشکول در بدر
دل کا بھرم لٹا تو گدا ہو گیا وہ شخص
پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کے اسے رشید
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

(رشید قیصرانی)

حسن انتخاب: راشد سمیع، پشاور

☆

گمان کے سائے ہیں

یہ خواہشیں ہیں جو معصوم لڑکیوں کی طرح
بھٹکتی رہتی ہیں افسردہ دل کی گلیوں میں
کہیں سے کوئی دلاسہ ملے تو آنکھوں میں
ہزار رنگ لیے شبنمی امیدوں کے
ہزار خواب سجا کر دعا کے ماتھے پر
تیرے دھیان کے سائے میں بیٹھ جاتی ہیں
یہ کس گمان کے سائے میں بیٹھ جاتی ہیں؟

(فرحت عباس شاہ)

حسن انتخاب: شمع زیدی، کراچی

جس کا موسم

کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ
جو نفرت کرتے ہیں
اور اس جذبے کو اپنے دل میں رکھ کر
جی سکتے ہیں، جی لیتے ہیں
برسوں تک اس زہر کے قطرے پی لیتے ہیں
میں حیران ہوں
نفرت کا یہ جذبہ کتنے دنوں تک
زندہ رہ سکتا ہے
کیسے زندہ رہ سکتا ہے
کیسے زندہ رہ لیتے ہیں وہ لوگ
اسی اک عالم میں
میں تو گھٹ کر مر جاؤں
اس حبس بدن کے موسم میں

(اعتبار ساجد)

حسن انتخاب: سمیرا یاسر، حیدر آباد

آخری خط

اک مدت کے بعد
اس کے گھر سے آئے ہوئے
خط کے کونے پر
ہلدی کی کچھ چھینٹیں ہیں،
میں ہوں بھیگی پلکیں ہیں

(محسن بھوپالی)

حسن انتخاب: ہما خان، کوئٹہ

☆☆

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت شاعری سے سجا مجموعہ کلام.....

شائع ہو چکا ہے

تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے ہاتھ میں۔ نہ کوئی ڈاک خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔ پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال کیجیے، کتاب آپ کی دہلیز تک پہنچا دی جائے گی۔

رابطے کے لیے

0307-2089080
0345-2540616

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کب بدلے گی ہماری تقدیر؟

کرم بخش پھوڑ بھاگ ناڑی بلوچستان

موجودہ دور میں تعلیم ایک ایسی کلید کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس کے بغیر قوموں کی ترقی وخوشحالی ناممکن ہے کیونکہ تعلیم ہی انسان کی شخصیت کو نکھارتی اور خوبصورت بناتی ہے اور معاشرے میں ترقی کے لیے ہنرمند افرادی قوت کو تیار کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ تعلیم ہی کسی ملک کو معاشی وسماجی مسائل کے بھنور سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے مگر افسوس' پاکستان ناخواندگی کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہے۔ آج بھی عوام کی اکثریت تعلیم کی اہمیت وافادیت سے ناآشنا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ملک میں' خاص کر دیہاتوں میں والدین کی اکثریت تعلیم سے ناآشنائی اور وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے قاصر ہیں عموماً والدین اپنے بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی کام پر لگوا دیتے ہیں تاکہ گھر کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ ناخواندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیہاتوں میں اکثر مشترکہ خاندانی نظام ہوتا ہے اور ایک ہی وقت میں ایک خاندان سے چار سے پانچ بچے تعلیم حاصل کرنے کی عمر میں ہوتے ہیں اس لیے والدین ان بچوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے جس کی وجہ سے بچے اسکول داخل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اسلام نے تو تمام مرد اور عورتوں پر تعلیم حاصل کرنا لازم قرار دیا ہے لیکن ہمارا معاشرہ پرانے فرسودہ رسم ورواج میں بری طرح سے جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے والدین اپنے آباؤاجداد کی پرانی رسومات اور رواجوں کو توڑنا پسند نہیں کرتے اس لیے خصوصاً لڑکیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اگر چند لڑکیاں تعلیم حاصل کر بھی لیتی ہیں تو ان کے ملازمت کرنے کو عیب سمجھا جاتا ہے اور انہیں ملازمت کی اجازت نہیں دی جاتی اور انہیں گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ ناخواندگی کی ایک وجہ تعلیمی سہولیات کا فقدان اور تعلیمی اور تکنیکی اداروں کی کمی بھی ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر تعلیمی ادارے شہروں میں بنائے گئے ہیں جن کی وجہ سے دیہات میں بسنے والے غربت' شعور کی کمی اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر معاشرے پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو بچوں کی تعلیم کے حصول کے آڑے کبھی غربت آجاتی ہے تو کہیں والدین میں تعلیم کی اہمیت وافادیت سے ناآشنائی' کہیں ہمارے فرسودہ رسم ورواج' کہیں تعلیمی سہولیات کا فقدان' کہیں ملک کا طبقاتی نظامِ تعلیم اور کہیں حکومت۔ ان وجوہات کی وجہ سے کتنے بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کرنے سے رہ جاتے ہیں' کتنے بچوں کا مستقبل تباہ ہو رہا ہے' کبھی کسی نے ان مستقبل کے معماروں کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارہ کی؟ کون سوچے گا ان کے بارے میں اور کون ڈھونڈے گا ان مسائل کا حل؟ کب والدین میں آگہی آئے گی؟ کب حکومت اس مسئلے کے حل کے لیے عملی اقدامات کرے گی؟ کب بدلے گی ہماری سوچ؟ کب آئے گی خوشحالی؟ اور کب بدلے گی ہماری تقدیر؟

وجودِ زن سے ہے......

نازیہ بتول رضا۔ کراچی

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

یہ بات میں اپنے بچپن سے سنتی آئی ہوں اور یہی حقیقت بھی ہے کہ اگر ربِ کائنات عورت کو تخلیق نہ کرتا تو یہ دنیا بے رنگ ہوتی۔ عورت ہے تو اس کائنات میں رنگ وبو ہیں' یہ عورت ہی ہے جو ہر روپ میں مرد کے تابع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے' چاہے وہ بیوی ہو' بہن ہو یا پھر بیٹی ہو' جب عورت بیوی کے روپ میں ہوتی ہے تو سرتاپا وفا کی دیوی بن جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی خاطر ہر دکھ درد ہنستے ہنستے سہہ جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے شریک حیات کے ظلم و ستم اور جبر و زیادتی بھی خاموشی سے برداشت کر لیتی ہے۔ اس کی نظر میں صرف اپنا گھر آباد رکھنا ہی مقصود ہوتا ہے۔ عورت کا خوبصورت بلکہ سب سے خوبصورت روپ ماں بننا ہے' جب وہ ماں بنتی ہے تو قدرت اس کی صلاحیتوں کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے تاکہ وہ اپنے بچے کی بہترین پرورش کر سکے' اسے دنیا کے سرد و گرم سے بچا سکے۔ جب ایک عورت ماں بنتی ہے پھر چاہے وہ کم عمر ہی کیوں نہ ہو لیکن قدرت اس کو بردباری اور وقار عطا کرتی ہے جس کی بدولت وہ اپنے بچے کی نگہداشت کرتی ہے' اپنا سکون و چین قربان کر دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ شوہر کا خیال بھی رکھتی ہے۔ اسی طرح عورت اگر بیٹی کے روپ میں ہو تو گھر میں رحمت ہے لیکن افسوس' صد افسوس کہ آج کل اس رحمت کو زحمت تصور کیا جانے لگا ہے۔ اگر کسی کے گھر بیٹی کی ولادت ہو جائے تو بعض جاہل لوگ منہ بنا لیتے ہیں اور اگر پے در پے چار یا پانچ بیٹیوں کی ولادت ہو جائے تو خدانخواستہ' طلاق بھی تک نوبت آ جاتی ہے۔ قصوروار ہمیشہ کی طرح عورت ہی کو مانا جاتا ہے۔ پتہ نہیں' لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اب تو پڑھے لکھے اور ذی شعور لوگ بھی یہ خرافات کرنے لگے ہیں حالانکہ ایک حدیث پاک ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے۔ ''جس کی دو بیٹیاں یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں اور وہ خوش اسلوبی سے اُن کی پرورش کرے' اُن کے کھانے اور تعلیم کا خیال رکھے' یہاں تک کہ اُن کی شادی کر دے تو وہ شخص میرے ساتھ جنت میں اس طرح جائے گا۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگشتِ شہادت کو ملا دیا۔ سبحان اللہ' کیا فضیلت ہے عورت کی پرورش کرنے کی۔ آج دنیا دکھاوے کے لیے ہر سال حقوقِ نسواں کے نام پر عورتوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے لیکن اگر ہم اپنے آس پاس ہی دیکھیں تو ہمیں عورت بہت شکستہ اور بدحال نظر آئے گی۔ آخر آج کے دور کی عورت اتنی ارزاں کیوں ہو گئی ہے؟ کیا رسولِ پاک ﷺ کی حدیث پاک کو سب نے فراموش کر دیا ہے؟ عورتوں کے عالمی دن کے موقع پر بھی عورت ظلم و بربریت کی چکی میں پسی جا رہی ہے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ آج کے دور میں عورت کی کوئی عزت و وقعت نہیں ہے' کیوں' آخر کیوں؟ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے؟ خدارا' ہوش کے ناخن لو' اب بھی وقت ہے' عورت پر ظلم و تشدد بند کرو' اس کی قدر و اہمیت جو اسلام نے اسے عطا کی ہے' اس کو تسلیم کرو اور اس کے حقوق اسے بخش دو ورنہ بہ روزِ قیامت اگر خدا اور رسول ﷺ ناراض ہو گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔

زندگی کے دو پل

فرید عالم نقشبندی' کراچی۔

زندگی کیا ہے؟ ایک پل آنکھیں کھولنا اور دوسرے پل آنکھیں بند ہو جانا' انہی دو پلوں کے درمیان ہماری زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ اس زندگی کے کٹھن دشوار سفر میں قدم قدم پر دکھ درد اور غموں کی شاہراؤں پر میں سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے اور آگے بڑھنے کے لیے مشکل مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اب یہ آپ کی ہمت' برداشت' صبر و تحمل اور مسلسل جستجو' لگن' محنت' محبت' جنون' جذب' رُوحانی صلاحیت پر ہے کہ آپ یہ سفر کیسے کاٹتے ہیں؟..... آپ اپنی زندگی کو نکھارنے کے لیے دوسروں کے دکھ درد میں تعاون کیجیے۔ زندگی کے اس سفر میں دوسروں کی تکلیفیں دور کرنے سے بہتر اور کوئی کام نہیں۔ اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دیجیے اور دو پل کی اس زندگی کو لازوال بنا دیجیے۔

عظیم وہ ہے.....

ارباب قربان علی ایری

عظیم کون ہے' وہ جو تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنا مقصد پا لے یا پھر وہ جوان مشکلات سے دست و گریباں ہوتے ہوئے اپنی زندگی کی بازی ہار جائے۔ اگر لوگوں کا خیال ہے کہ عظیم صرف وہ ہے جو کامیابی حاصل کر لے تو میرے نزدیک وہ عظیم نہیں بلکہ میرے نزدیک تو وہ بھی عظیم انسان ہے جو کسی کے قدموں میں گرنے کے بجائے خودداری' محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ وہ بھی عظیم ہے جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے حقیر سے حقیر پیشے کو بھی کم تر نہ سمجھ کر اپنائے۔ وہ بھی عظیم ہے جس کی غیرت یہ تسلیم نہ کرے کہ اس کی نظریں سڑک پر چلنے والی عورتوں پر پڑے۔ وہ بھی عظیم ہے جو اپنی ذات کا محاسبہ نیک نیتی سے کرے اور وہ بھی عظیم ہے جو مسائل سے گھبرا کر سہم جانے کے بجائے آخر وقت تک ان کا مقابلہ کرے۔

محبت

فرحت صدیقی۔ لاہور

محبت زندگی ہے' ایسی زندگی جو چٹان کی طرح مضبوط اور موم کی طرح نرم ہو' بھرپور زندگی کے سارے رنگ محبت کے ہی رنگوں سے سجے ہیں۔ محبت کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ روزِ ازل سے ہے' یہ کائنات سات رنگوں سے سجی ہے۔ خدا کی محبت کا رنگ اس میں روشن ہے' ستاروں کی طرح' محبت لازوال ہے' یہ روشنی ہے' یہ نور ہے' محبت نوازتی ہے' سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے' اعلیٰ ارفع مقام محبت کا ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں پوشیدہ ہے جو اسے اپنے بندوں سے ہے۔ محبت کا دوسرا نام دوسروں کی خوشی' راحت میں اپنی خوشی کا اظہار ہے۔ سچی محبت سکھ ہے' راحت ہے' سکون ہے' اعتماد ہے' عزم ہے' حوصلہ ہے جو چٹانوں سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کرتا ہے اور سمندر کی گہرائیوں سے گوہرِ مقصود حاصل کر لیتا ہے جو زندگی محبت کے جذبے سے عاری ہو' وہ اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہیں ہوتی۔ محبت کبھی دکھ نہیں دیتی' دکھ وہ احساس ہے جو خودغرض ہے جو صرف اپنی ذات کی حد تک ہوتا ہے۔ محبت تقسیم کرنا ہی محبت کی معراج ہے۔ اس کائنات کے سارے رنگ اور جذبے اسی ایک لفظ کے اندر ہیں۔ اللہ کا دوسرا نام اپنی کائنات' اپنے رسول ﷺ سے محبت ہی تو ہے۔

تیری رحمت کا واسطہ محبت کی بارش کر دے
کب تھمے گا نفرت کا یہ طوفان یارب!

بہترین رازدار

ثانیہ بھٹی' سیالکوٹ

انسان جب اداس ہوتا ہے' اسے کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کا دکھ بانٹ سکے' اس کو سمجھ سکے جس سے وہ اپنی ہر بات شیئر کر سکے۔ آج کل کے دور میں اگر کسی سے ہم اپنا کوئی راز' دکھ یا دل کی بات شیئر کرتے ہیں تو ایک اندیشہ سا لگا رہتا ہے کہ یہ ہماری بات یا ہمارے دکھ کی تشہیر نہ کر دے۔ میں اکثر اداس ہوتی ہوں تو اپنا ہر دکھ' درد ایک ہستی کو بتا دیتی ہوں۔ اس سے اپنا درد بانٹنے کے بعد میں ہلکی پھلکی ہو جاتی ہوں' وہ عظیم ہستی نہ صرف میرا درد سمجھتی ہے بلکہ مجھے اس کا حل بھی بتاتی ہے اور میرے راز کی پردہ پوشی بھی کرتی ہے۔ اس سے اپنا دکھ' اپنا درد بیان کر کے ایک سکون میری روح میں اتر جاتا ہے جیسے میری ساری تکالیف ختم ہو گئی ہوں۔ وہ عظیم ہستی ہے خدا پاک! ہمیں اپنے سب دکھ درد بس اسی کے آگے بیان کرنے چاہئیں کیونکہ وہ بہترین رازدار ہے۔ وہ نا صرف ہمیں پریشانی سے نکالتا ہے بلکہ اپنی رحمت کے ساتھ ساتھ ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی بھی کرتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔اس کے سامنے آنسو بہانے سے سب غم بھی بہہ جاتے ہیں۔

مسلمان احساسِ کمتری کا شکار کیوں؟

کرن شبیر، کراچی۔

مسلمان آج احساسِ کمتری کا شکار کیوں؟ اس لیے کہ ہم اپنے ماضی سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ مسلمانوں کا ماضی کتنا شاندار رہا ہے۔ آیئے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں اور مسلمانوں کے ماضی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کیا وہ مسلمان نہیں تھے جنہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کر کے اپنا نام دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنہری حروف سے لکھ دیا؟ سلطان ارسلان سلجوقی پندرہ ہزار کے لشکر کے ساتھ قیصر ارماس دیوجانس کے تین لاکھ فوجیوں کو شکست دیتے ہیں، خالد بن ولیدؓ ''سیف اللہ'' کا لقب پا کر ساٹھ ہزار کفار کا منہ پھیر دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر مسلمانوں کی حکومت قائم کر دیتے ہیں۔ جنگِ یرموک کے ایک محاذ پر صرف ساٹھ مسلمان ساٹھ ہزار کافروں کو مار بھگاتے ہیں۔ طارق بن زیادؒ اندلس کے ساحل پر اپنی کشتیاں جلا دیتے ہیں۔ بت کدہ ہندوستان میں پہلی اذان دینے والے کم سن مجاہد محمد بن قاسمؒ ملتان تک کا علاقہ اپنے حلقۂ اقتدار میں لے آتے ہیں۔ محمود غزنوی سومنات کا بت پاش پاش کر دیتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں کا آغاز کر دیتے ہیں۔ غرض مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی بہادری اور شجاعت کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ اتنی بے شمار مثالیں کسی اور مذہب کے پیروکاروں کی نہیں ملتیں۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں نے صرف بہادری کے کارنامے ہی دکھائے ہیں بلکہ ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کی بنیاد مسلمان سائنس دانوں نے ہی رکھی تو پھر آج ایسا شاندار ماضی رکھنے والی قوم انتشار، بے اطمینانی، خود اعتمادی کی کمی اور احساسِ کمتری کا شکار کیوں ہے؟ ہمیں چاہیے کہ غیر مسلموں اور ان کے سائنس دانوں کے بارے میں جاننے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تاریخ کا بھی مطالعہ کریں تاکہ اس احساسِ کمتری سے نکل سکیں اور آج کی دنیا کو یہ باور کرا دیں کہ وہ مسلمان ہی تھے جن کی بدولت آج دنیا سائنسی ایجادات سے فیض حاصل کر رہی ہے۔

ڈاکیہ آیا، ڈاک لایا

شیخ معظم الٰہی

نیلی وردی میں ملبوس، سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں نیلا تھیلا لیے شخص کو ڈاکیہ کہتے ہیں۔ لوگوں کے خطوط، پارسل اور منی آرڈر مطلوبہ افراد تک پہنچانا ڈاکیے کا کام ہے۔ اس کا کام سخت محنت طلب ہے لیکن افسوس اس کی تنخواہ بہت قلیل ہوتی ہے مگر پھر بھی ڈاکیہ بہت ہمت والا ہوتا ہے، وہ اپنی ڈیوٹی کو بخوبی نبھاتا ہے۔ سردی ہو یا گرمی، طوفان، آندھی ہو یا بارش، ڈاکیہ اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے علاقے کے دو ڈاکیے محمد سعید اور محمد منشا بہت ہی محنتی اور دیانت دار ہیں۔ اُن کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے خطوط، پارسل اور منی آرڈر وغیرہ اُن کے اصل حق دار تک جلد از جلد پہنچ جائیں۔ یہ دونوں خوش طبیعت انسان ہیں۔ لوگوں کی ڈاک بانٹتے ہوئے ان کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ کاش، ایسے ڈاکیے ہر علاقے میں ہوں۔ میری خاص طور پر دلی دُعا ہے کہ یہ دونوں ڈاکیے ہمیشہ صحت مند اور تندرست رہیں۔ (آمین!)

غور کریں تو!

عمران ہارون چھوٹانی۔ کراچی

دنیا بھی عجیب جگہ ہے یہاں جو 100 کلوگرام اناج کی بوری اٹھا سکتا ہے وہ خرید نہیں سکتا اور جو خرید سکتا ہے وہ اٹھا نہیں سکتا..... گھڑی اور بیوی میں فرق؟ ایک بگڑتی ہے تو ''بند'' ہو جاتی ہے دوسری بگڑتی ہے تو ''شروع'' ہو جاتی ہے۔

تبصرہ اور تذکرہ

کتابوں پر تبصرے اور ادیبوں کی گفتگو، باتیں، یادیں

ایک تھا بادشاہ

نعمان منظور کی تصنیف پر تاثراتی نوٹ

عکاشہ سحر

کہانی ہر دور میں لکھی گئی ہے اور یہ ہر دور میں لکھی جاتی رہے گی۔ کہانی خود کو معاشرے اور معاشرت سے الگ نہیں رکھ سکتی۔ کہانی منٹو لکھے، سلیم آغا لکھے، احمد ندیم قاسمی لکھے یا پھر نعمان منظور، کہانی اپنے کہانی کار کو کبھی مایوس نہیں کرتی بلکہ اُمر کر دیتی ہے۔ ''ایک تھا بادشاہ'' کے مرکزی کردار احمد ندیم قاسمی نے نعمان منظور کی تخلیق کو اُمر کر دیا ہے۔

''ایک تھا بادشاہ'' ایک بھرپور استعارہ ہے محبت اور عقیدت کا، نعمان منظور کی یادداشتوں پر مشتمل یہ تصنیف احمد ندیم قاسمی سے اُن کی بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔ نعمان منظور کی نگاہ تفصیلات، محاکات اور جزئیات کو capture کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اُن کے بیانیے کو اگر کوئی اصطلاحی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ ''بین حقیقت نگاہی'' ہے۔

انسان کا مطالعہ کرنا کتابوں کا مطالعہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ حروف پتھر پر لکیر کی مانند ثبت ہوتے ہیں جبکہ انسانی زندگی اور چہرے کے تاثرات لحظہ بہ لحظہ تبدل و تغیرات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی غم کی پرچھائیاں اور کبھی خوشی کی چمک، کبھی اضطراب تو کبھی اطمینان..... نعمان منظور نے قاسمی صاحب کی زندگی کے ہر رنگ کو بڑی نفاست سے پینٹ کیا ہے۔ لفظوں میں ملائمت، سوز و گداز اور نرمی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ لفظ اگرچہ سادہ اور عام فہم ہیں لیکن ان کے اندر گہرائی اور معنویت ملفوف نظر آتی ہے۔ منظر نگاری بھی کمال کی کرتے ہیں۔ چلتی پھرتی تصویروں کی مانند مناظر بدلتے چلے جاتے ہیں اور یہ مناظر نعمان منظور کے تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ان کا تعلق حقیقی زندگی سے ہے۔

کتاب کے آغاز میں قاسمی صاحب کی چند غزلیں اور نظمیں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ خوبصورت عنوان ''محبتوں میں حدیں نہیں ہوتیں'' کے ساتھ ڈاکٹر ناہید قاسمی صاحبہ کی رائے بھی شامل کی گئی ہے۔ مدیر ماہنامہ ''بیاض'' خالد احمد صاحب کا ''کارِ محبت'' کے عنوان سے مختصر سا مضمون بھی شامل ہے۔

ابتدائی صفحات سے ایک اقتباس..... ''کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سننا اور کہانی لکھنا دو مختلف باتیں ہیں۔ کہانی سننا آسان اور کہانی لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کہانی لکھنے کے لیے کہانی کے ہر کردار کے اندر اترنا پڑتا ہے۔ ہر کردار کو اپنانا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر کہانی لکھی جاتی ہے۔''

نعمان منظور بلاشبہ ان الفاظ میں بلاشبہ سچائی کے چراغ روشن ہیں۔ قاسمی صاحب سے محبت اور عقیدت کے اظہار میں نعمان منظور نے سچائی کو نظر انداز نہیں کیا۔ ہم اسے آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''ایک تھا بادشاہ'' کے مطالعے سے ہم اس عظیم تخلیق کار کے فن کی مختلف جہات سے متعارف ہوتے ہیں جنہیں دنیا احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جس قدر لکھا جائے' کم ہے لیکن یہاں ہم بات کر رہے ہیں نعمان منظور کے اسلوبِ سخن کی جن کی تحریر میں زندگی کی اَن گنت سچائیوں اور صداقتوں کا پرتو ملتا ہے۔ اس کے ساتھ گزرے وقت کی تصویریں بھی۔ ان تصویروں کو پینٹ کرنے میں نعمان نے کمالِ مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف ان کی ذات کے صاف شفاف آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ ''میں نے بھی ایک کوشش کی ہے کہانی لکھنے کی' اس ایک کہانی کے لیے مجھے برسہابرس انتظار کرنا پڑا ہے۔ ان برسوں میں ایک پل بھی ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اس کہانی کے کرداروں کو جاننے اور اپنے اندر اتارنے کی کوشش نہ کی ہو۔ میں تو صرف کوشش ہی کر سکتا تھا' سو میں نے کی۔''

قاسمی صاحب کے بارے میں مفصل معلومات جیسے کہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ان کا خاندانی نام احمد شاہ تھا اور والد کا نام پیر غلام نبی عرف نبی چن..... پہلا افسانہ بدنصیب بت تراش رسالہ رومان' لاہور میں چھپا..... 15 افسانوں کے مجموعے چوپال' بگولے' طلوع و غروب' سیلاب' آنچل' آبلے' آس پاس' سناٹا' درو دیوار' بازارِ حیات' برگِ حنا' گھر سے گھر تک' کپاس کا پھول' نیلا پتھر' کوہ پیما کے نام سے شائع ہوئے..... شعری مجموعے دھڑکنیں' رم جھم' جلال و جمال' شعلہ گل' دشتِ وفا' محیط' دوام' لوحِ خاک' بسیط' جمال (نعتیہ مجموعہ) ارض و سما' کل تعداد گیارہ رہی..... تنقید کے حوالے سے پانچ کتابیں تعلیم اور ادب و فن کے رشتے' تہذیب و فن' پس الفاظ' معنی کی تلاش اور اقبال سوانحی کتابچہ شائع ہوئیں..... دو خاکے بعنوان میرے ہم سفر' میرے ہم قدم لکھے..... چار فلموں کے مکالمے اور گیت لکھے جن میں سے دو فلمیں ریلیز ہوئیں جبکہ دو ریلیز نہ ہو سکیں..... بچوں کی دو کتابیں تین ناٹک' دوستوں کی کہانیاں' نئی نویلی کہانیاں جبکہ متفرقات میں چھے کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ آپ مئی 1951ء سے نومبر 1951ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت پابند سلاسل بھی رہے۔ اکتوبر 1957ء سے فروری 1959ء تک نظر بندی بھی ہوئی..... اعزازات' تمغۂ حسنِ کارکردگی' ستارۂ امتیاز' کمالِ فن ایوارڈ اور نشانِ امتیاز حاصل کیے۔

بین الاقوامی حیثیت ..... افسانوں کے دو اور نظموں کے ایک مجموعے کا روسی زبان اور افسانوں کے مجموعے کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ چینی زبان کے علاوہ انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں افسانوں کے ایک مجموعے کا ترجمہ بھی ہوا جبکہ پشتو' پنجابی' سندھی' بنگلہ' مراٹھی' گجراتی اور فارسی زبانوں میں کہانیوں اور نظموں کے ترجمے کا کوئی حساب نہیں ہے۔

یہ تمام معلومات ''ایک تھا بادشاہ'' میں شامل ہیں

اور نعمان منظور کے تحقیقی تجربات کا نچوڑ ہیں۔ تصنع بناوٹ' نمود و نمائش سے پاک اندازِ تحریر' کہیں کہیں اُن کے مزاج کی شگفتگی' رعنائی اور دلآویزی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اُن کا تخلیقی حسن' دھیمی دھیمی مسکراہٹیں' دوسروں کے درد کے احساس سے معمور ان کا دل اور پھر حساس طبیعت کے کیا کہنے۔ لکھتے ہیں کہ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ ندیم صاحب نے مجھے اپنے گلے سے لگایا اور کہنے لگے۔ ''یہ میرا فرض تھا تمہارے لیے نہیں لکھوں گا تو اور کس کے لیے لکھوں گا؟''

''اُس وقت مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا' آواز میرے حلق میں پھنس گئی' آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ میرے بادشاہ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا تھا اور میرے شانوں پہ تھپکی دے کر میرے آنسو پونچھے تھے۔ میری ستائیس برس کی رفاقت آج رنگ لے آئی تھی۔

تلخی میں شیرینی کی آمیزش نعمان منظور کا وہ فن ہے جو انہیں بھیڑ میں بھی واضح رکھتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کو عالمگیریت دینے کے فن سے واقف ہیں۔ نعمان منظور کہیں بھی الجھاؤ اور بکھراؤ کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اول تا آخر ایک ترتیب اور تنظیم کی صورت باقی رہتی ہے۔ ان کے اسلوب کی چاشنی اور دلکشی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

''ایک تھا بادشاہ'' کی اہمیت اس حوالے سے بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ کسی کی مدح اور ستائش میں نہیں بلکہ زندگی کی تمام تر حقیقتوں اور سچائیوں کا پرتو اس میں ملتا ہے۔ قاسمی صاحب کی ذات سے منسلک بہت سی شخصیات کا ذکر بھی اس میں تفصیل اور پوری سچائی کے ساتھ درج ہے اور یہ نعمان منظور کے تخیل کا کارنامہ نہیں' یہ وہ زندگی ہے جو انہوں نے بسر کی' ویسے بھی کہانی لکھنے سے پہلے کہانی کو بسر کرنا پڑتا ہے۔ دنیائے سخن کے بادشاہ کے ساتھ گزرنے والا ہر لمحہ نعمان منظور کے لیے قیمتی اثاثہ ہے جس کا وہ برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

بچپن میں سنی باتیں ذہن کے پردے پر نقش ہوتی گئیں۔ میسر ہونے والا ادبی ماحول اور پھر کہانی سنتے سنتے وہ خود کہانی لکھنے لگے۔ بچپن کی یادیں لفظوں کی صورت قرطاس پر ابھرنے لگیں۔ لفظوں کے طلسم میں الجھے الجھے وہ اپنے بادشاہ کو اپنی تحریر کی دنیا میں کھینچ لائے۔ احمد ندیم قاسمی' نعمان منظور کی کہانی کا وہ مرکزی اور اہم کردار ہیں جن کے گرد سارے لفظ گھومتے ہیں اور جو چراغ بن کر تخلیق کار کے دل کو ہمیشہ روشن رکھتا ہے۔ زندگی میں بہت سے ایسے مقامات بھی آئے جب زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا مگر وہ بادشاہ کی انگلی تھامے ثابت قدمی سے چلتے رہے۔ اُن کے لفظ انہیں حوصلہ دیتے رہے۔ بادشاہ آنکھوں میں امید کی چمک لیے انہیں زندگی کے رازوں سے آشنا کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے کہانی اداسی اور اختتام کی جانب گامزن ہے۔ وقت کی گرفت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

سمن آباد میں ندیم شہید روڈ پر گاڑیوں کا ایک اژدہام ہے' پولیس کے جوان ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف ہیں' لگ رہا ہے' گویا پورا لاہور آج اپنے احمد ندیم قاسمی کے دیدار کے لیے آ رہا ہے۔ میں سب سے پہلے خالد بھائی سے مل رہا ہوں جو ایک دیوار کا سہارا لیے کھڑے ہیں۔ میں شدت سے متمنی ہوں کہ خالد بھائی کے کندھے پر سر رکھوں اور دھاڑیں مار مار کے روؤں۔ خالد بھائی نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری آنکھوں میں تڑپتی التجا بھی پڑھ لی ہے۔ جونہی میں آگے بڑھا' خالد بھائی نے مجھے گلے سے لگا لیا ہے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''صبر اور بس صبر۔''

''صبر کہاں سے لاؤں؟ نجانے اِس ہاتھ میں اُس وقت کیا ہے کہ میری آنکھوں سے امڈنے والے آنسو پلکوں کے کناروں پر ٹھہر گئے ہیں' شاید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی اور وقت کے لیے۔"

"ایک تھا بادشاہ" کے آخری صفحات پڑھتے ہوئے میں بھی اداس ہوگئی ہوں۔ "جنازے کی چارپائی کو قبلہ رخ رکھ دی گیا ہے تاکہ احباب اپنے محسن اور پیارے احمد ندیم قاسمی کا آخری دیدار کرلیں۔ اس شخص کو خاموش دیکھ لیں جس نے ہمیں بولنے کا ہنر سکھایا۔ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ میں اپنے بادشاہ کو چپ چاپ لیٹے ہوئے دیکھوں۔ میں اِس منظر کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس منظر کا حصہ بھی نہیں بننا چاہتا' سو میں اس ہجوم سے نکل کر ایک سائیڈ پر کھڑا ہوگیا ہوں۔"

اشرف جاوید کی اس نظم کے ساتھ بادشاہ کی کہانی اختتام پذیر ہوگئی۔

وصالِ مہتاب کی خبر لائی
سحر بھی آئی تو چشمِ تر لائی
مکالمہ کس طرح سے ممکن ہو
لحد کے پھول اہتمام کرتے نہیں
حروفِ سادہ کلام کرتے نہیں
رہِ جدائی ہے' ہم ہیں اور تراغم
چراغِ دل بھی تو ہے بجھا جاتا
اب آگے کچھ بھی نظر نہیں آتا

.....•.....•.....•

میں آخر میں قارئینِ "سچی کہانیاں" سے نعمان منظور صاحب کا تعارف کراتی چلوں کہ نعمان منظور صاحب کثیر تعداد میں شائع ہونے والے پاکستان کے مقبول ترین ادبی جریدے ماہنامہ "بیاض" لاہور کے مدیر ہیں۔ "ایک تھا بادشاہ" احمد ندیم قاسمی صاحب سے ان کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا اعتراف ہے۔ خدائے حرف و قلم انہیں مزید کامیاب کرے۔ بہت سی دُعائیں اُن کے روشن حرفوں کے نام۔

.....☆☆.....

میرے دل کے پاس رہنا مرے ساتھ ساتھ رہنا
جو بھی من میں ہو تمہارے وہی بات مجھ سے کہنا

"میرا دل کہتا ہے" کی خالق

کینیڈا ایوارڈ یافتہ شاعرہ

شگفتہ شفیق کی خوبصورت نظموں کا مجموعہ

یاد آتی ہے

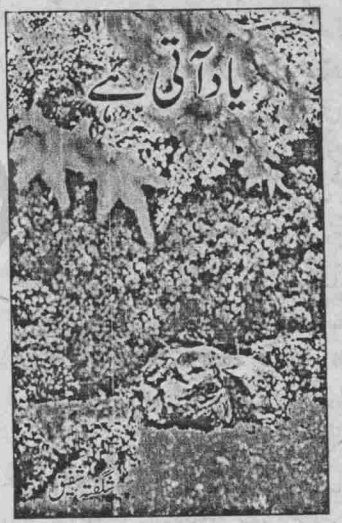

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ

فرید پبلشرز اردو بازار۔ کراچی

021-32770057

0345-2360378

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

سیماب اکبرآبادی.....اُمِ عادل' کراچی

سجدے کروں' سوال کروں' التجا کروں
یوں دیں تو کائنات میرے کام کی نہیں
وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت
مانگی ہوئی نجات میرے کام کی نہیں

علامہ اقبالؒ.....راحیل علی' کراچی

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش

فیض احمد فیض.....رفیق شاہ' ملتان

شامِ فراق' اب نہ پوچھ' آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا' جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

یاس یگانہ چنگیزی.....روحان خان' جہلم

دیکھے کوئی جاتی ہوئی دنیا کا تماشہ
بیمار بھی سر دھنتا ہے اور شمع سحر بھی
بجھتی ہوئی اک شمع ہوں' کیا دم کا بھروسہ
دشمن ہے مری جان کی اب آہِ سحر بھی
فراق گورکھ پوری.....علیشبہ کمال' لاہور

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی' ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہی جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری پادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فانی بدایونی.....رمشاء ظفر' ماتلی

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر
ہمت ہو تو بے قرار ہوجا
اے درد یہ چٹکیاں کہاں تک
اٹھ اور جگر کے پار ہوجا

فیض احمد فیض.....نادر خان' کوئٹہ

کب ٹھہرے گا درد اے دل' کب رات بسر ہوگی؟
سنتے تھے' وہ آئیں گے' سنتے تھے سحر ہوگی
واعظ ہے نہ زاہد ہے' ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی؟

جگر مرادآبادی.....فلک خان' کراچی

نہاں کیے سے کہیں رازِ غم نہاں ہوتا ہے
زباں دہن میں نہ ہوتی تو میں زباں ہوتا
یہ سوچتا ہوں ٹھکانہ مرا کہاں ہوتا
اگر وہ میری طرح مجھ سے بدگماں ہوتا؟

اصغر گونڈوی.....شعبان کھوسہ' کوئٹہ

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا' اسے غمِ جاناں بنا دیا
مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

حسرت موہانی.....عاصم خان نیازی' لاہور

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں
کب تک کسی کے نازِ تغافل اٹھائے دل
کیا امتحانِ صبر کی کچھ انتہا نہیں؟

داغ دہلوی.....روشان معین' اسلام آباد

اِدھر دیکھ لینا' اُدھر دیکھ لینا
کن انکھیوں سے اُس کو مگر دیکھ لینا
نہ دینا خطِ شوق گھبرا کے پہلے
محل موقع اے نامہ بر دیکھ لینا

اسداللہ خاں غالب.....ناہید محمود' حیدرآباد

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناسخ.....شاہد رضا، اٹک

رفعت کبھی کسی کی گوارہ یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں، وہاں آسماں نہیں

آتش.....کرن شہزادی، راولپنڈی

وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سیکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا
دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
درودیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

مصحفی.....مقصود بلوچ، دادو

عشق مجھے اہلِ بصر کرگیا
اشک کے قطرے کو گہر کرگیا
رہ گئے ہم سوتے ہی، افسوس ہے
قافلۂ صبح سفر کرگیا

میر تقی میر.....قادر شاہ، سبی

وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنا بجھتا سا کوئی چراغ ہے

خواجہ میر درد.....نسیم علی، شہداد کوٹ

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آپھنسے ہیں عجب پیچ وتاب میں
غافل جہاں کی دید کو مفتِ نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

کاشف حسین غائر.....ماہرہ بانو، کوٹلی

رات ملنے لگی گلے مجھ سے
سائے مانوس ہو چلے مجھ سے
سامنے آ کے بیٹھتا تو سہی
بات کرتا نہ وہ بھلے مجھ سے

عمران عاصی.....نصرت خان، شہداد پور

جب سبق یاد ہوا کرتا تھا
وقت استاد ہوا کرتا تھا
وہ جو اک شعر مکمل نہ ہوا
باعثِ داد ہوا کرتا تھا

انجم سلیمی.....ہاشم وہاب، میرپور خاص

خود کو سمجھاؤں کہ دنیا کی خبر گیری کروں
اس محبت میں کوئی ایک مصیبت ہے مجھے

افتخار اشہر.....روشنی علیم، ملتان

مجھ سے پوچھ رہا تھا وہ آوارہ شخص
عشق میں جلنے والے کیسے ہوتے ہیں
آپ بہت سادہ اور بھولے بھالے ہیں
دانشور اکثر یہ مجھ سے کہتے ہیں

احمد کامران.....ہارون گل، ٹیکسلا

تیرے حصے کے بھی صدمات اٹھا لیتا ہوں
آ تجھے آنکھوں پہ اے رات، اٹھا لیتا ہوں

احمد سجاد بابر.....بشیر بابو، صادق آباد

وہ ہجر کا سوچتی آنکھیں
اور شب بھر جاگتی آنکھیں
خاکداں کی خیر ہو مالک
چار سو ہیں بولتی آنکھیں

حامد علی سید.....تسنیم باچہ خان، بھور بن

کل بھی خوش گمانی تھی، آج بھی فسانے ہیں
میری رائیگانی کے سلسلے پرانے ہیں
ساتھ لے کے چلنا ہے ریگزار میں دریا
اور اس خرابے میں پھول بھی کھلانے ہیں

کاوش عباسی.....روحان مسلم، اسلام آباد

صورتیں ہیں، صورتوں کی کج روی ہے
کھوکھلا پن ہے اور ایسا کشتنی ہے
خار باہم بستہ وپیوستہ جیسے
ایسے اک دوسرے سے دوستی ہے

کاشف مجید.....ارتقاء احمد، رانی پور

مرنے والے کو بھی اور خود کو بھی
میں نے مٹی میں اتارا سائیں
اب بھی دشمن سے تو ہے میل ملاپ
کر لیا خود سے کنارہ سائیں

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

.....تقریبِ رونمائی.....

ہماری ہر دلعزیز لکھاری دوست نگہت اعظمی کی کتاب ''آبگینے'' جس میں اُن کے شاہکار افسانے شامل ہیں، کی تقریبِ رونمائی گزشتہ ماہ آرٹس کونسل، کراچی میں انجام پائی۔ اِس تقریب میں ملک کی مایہ ناز ادب نواز شخصیات نے بھرپور شرکت کی۔

.....ظہرانہ.....

نگہت اعظمی نے ''آبگینے'' کی بھرپور کامیاب تقریب کے بعد اپنی تمام لکھاری دوستوں کو ایک شاندار ظہرانہ اپنی رہائش گاہ پر دیا، جس میں شگفتہ شفیق، ارم زہرا، شائستہ عزیز، سیما مناف، سکینہ فرخ، صبیحہ شاہ، سیما رضا ردا، سائرہ غلام نبی، دانش اقبال، خرم شہزاد وغیرہ نے بھرپور شرکت کی۔

.....نئی کتابیں.....

.....ہماری دوست لکھاری اور شاعرات شیما عبدالقیوم اور اصفا فیصل کی خوبصورت شاعری سے سجے مجموعے اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ بہت جلد دونوں شاعرات صاحبِ کتاب کا اعزاز پا لیں گی۔ ادارہ دونوں کی کامیابی کے لیے دُعا گو ہے اور پیشگی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

.....کامیابی کا سفر.....

.....ہماری دوست لکھاری اور شاعرہ شگفتہ شفیق کا دوسرا مجموعۂ کلام ''یاد آتی ہے'' مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ شگفتہ کو حال ہی میں لندن سے ایک مشاعرے کی دعوت بھی موصول ہوئی جسے کچھ نجی مصروفیات کے سبب انہیں معذرت کرنا پڑی۔ ادارہ شگفتہ کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

.....اعزاز.....

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے رائٹر ارباب قربان علی ایزی کو گزشتہ دنوں ماہنامہ کرن کرن روشنی ملتان کے ''القلم ایوارڈ'' کی پانچ خصوصی کہانیوں میں شامل اُن کی کہانی کو بھی انعام اور تعریفی اسناد سے نوازا گیا اور بچوں کی معروف ادبی تنظیم ''پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ'' کی جانب سے بہترین قلم کار کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

.....مبارکباد.....

.....ہمارے دوست لکھاری محمد عزیز کی دختر قرۃ العین جن کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی، اپنے شوہر عمران کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو چکی ہیں۔ ادارہ اُن کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دُعا گو ہے۔

.....تحسین جونیجو کی جانب سے اپنی بہن زرینہ جونیجو کو 8 جولائی کو بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ ادارہ اپنی دوست لکھاری زرینہ جونیجو کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دُعا گو ہے۔

.....انتقالِ پُرملال.....

معروف صحافی قیصر مسعود جعفری کی والدہ محترمہ گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے رزقِ خاک ہوئیں۔ ادارہ مرحومہ کے درجات کی بلندی کے ساتھ دُعا گو ہے کہ اللہ قیصر مسعود جعفری اور دیگر لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

''آپ کی خبر'' کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراماتی بجٹ

قیام پاکستان سے اب تک پچاس سالہ دور میں کوئی بھی ایسا بجٹ پاس ہوا ہے جس میں ٹیکس نہ بڑھائے گئے ہوں؟ ہر سال بجٹ پیش کرتے ہوئے مختلف جواز دے کر ٹیکس بڑھا دیئے جاتے تھے اور پھر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ سالانہ بجٹ کے بعد کئی کئی ضمنی بجٹ پیش کیے جاتے تھے جن میں اضافی ٹیکس عاید کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ بس اب خوش حالی کا دور دورہ ہونے والا ہے جس سے گرانی اپنی موت آپ مر جائے گی مگر ہمارا تاجر طبقہ بجٹ کی ''بازی گری'' اور اس کے نتائج سے اس قدر آگاہی اور تجربہ حاصل کر چکا تھا کہ وہ بجٹ سے پہلے ہی بہت سی اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر خوب منافع کما لیتا تھا۔ یوں یہ سلسلہ گزشتہ پچاس برسوں سے جاری تھا۔

اب کے بھی بجٹ سے پہلے حسب معمول طرح طرح کی پیش گوئیاں کی جا رہی تھیں۔ تقریباً ہر فرد کا یہ خیال تھا کہ اب کے بجٹ میں ٹیکسوں کی بھرمار ہوگی کیونکہ معیشت کو گزشتہ حکومت نے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور ملک دیوالیہ ہونے والا تھا۔ تاجر طبقے نے بھی حسب معمول ذخیرہ اندوزی کر لی تھی۔ آٹے کے بحران نے ان کے اس خیال کو بڑی تقویت دی تھی کہ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹیں گے۔ ایک سیاسی طبقہ یہ سوچ کر بغلیں بجا رہا تھا کہ آنے والا بجٹ موجودہ حکومت کے ڈاؤن فال (زوال) کا پہلا قدم ثابت ہوگا اس لیے سب بجٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور وزیراعظم کے اس بیان کو طفل تسلی سمجھ رہے تھے کہ بجٹ اچھا ہوگا۔

اور پھر جب بجٹ کا اعلان ہوا تو وہ صرف اچھا نہیں بلکہ بہت ہی اچھا تھا اور اس اعتبار سے ملک کا واحد یادگار بجٹ تھا کہ اس میں کوئی اضافی ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا بلکہ بعض شعبوں میں تو کمی بھی کی گئی تھی اور بعض میں چھوٹ دی گئی تھی اگر اس بجٹ کو کراماتی بجٹ کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپوزیشن اسے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا کہے یا کچھ اور ہم اسے کراماتی بجٹ ہی سمجھتے ہیں اور اس اعتقاد پر ہمارا ایمان مزید پختہ ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے معجزے دکھا سکتا ہے۔

حیرت اس بات کی ہے کہ وزیراعظم کے مشیر اطلاعات محترم مشاہد حسین نے اس کراماتی بجٹ کی خوش خبری سنانے میں قدرے بخل سے کام لیا اور یہ کہہ کر 14 کروڑ عوام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ اقتدار میں آنے سے پہلے انہیں ملک کی تباہ حال معیشت کا علم نہیں تھا اگر علم تھا تو صرف اس حد تک کہ آصف علی زرداری کے گھوڑے سیب کا مربہ کھاتے ہیں اور وزیراعظم ہاؤس کے ایئر کنڈیشنڈ اصطبل میں رہتے ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ 1998ء۔1997ء کے کراماتی بجٹ سے بھی مشیر موصوف ضرور لاعلم تھے ورنہ گھوڑے کی بجائے 14 کروڑ عوام کو سیب کا مربہ کھلانے کا مژدہ ضرور دیتے۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ میں جولائی 1997ء میں لکھا؟ غور کریں یہ اداریہ موجودہ دور کا عکاس نہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk